

انتساب

زہرا حیدر کے نام



میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقتور مہیا لا دیوتا ہے، تند مزاج اور غصیلہ
اپنے موسموں اور اپنے غیض و غضب کا مالک
تباہ کن۔۔

وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے۔۔ سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے
خاتمہ کہاں ہے..... بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ لکڑیوں کا خاتمہ کہاں ہے.....
خاتمہ کہیں نہیں ہے۔۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھسٹنا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا.....
یا غلط چیزوں کی تمنا کا..... یا غلط چیزوں کے خوف کا
یہ لمحے مستقل ہیں..... جس طرح وقت مستقل ہے

ہم اس بات کو یہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں

کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہے
لیکن دوسروں کی ازیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا

لوگ بدل جاتے ہیں۔ مسکراتے بھی ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
ایشوں اور خس و خاشاک کو اپنی موجودگی میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے
اور نا کے واسطے جو ابھی کچھتانی کے لے پیدا نہیں ہوئے
کچھتاوے کا گل سرخ

جو ایک ایسی کاتب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی

آگے بڑھو مسافروں ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف انواع زندگیاں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو

آگے بڑھو تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہ کو پیچھے ہٹتے دیکھا

یا جو دوسرے ساعل پر اترو گے
اس لمحے کہ... دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو
یہ لمحہ کرم یا نہ کرم کا نہیں.. جانو
کہ موت کے سہ انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مرکوز ہو.. [اور موت کا سہ ہر لحظہ ہے]

وہ محض ایک کرم ہے
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو آگے چلو
اور مسافروں اور ملائو..
تم جو گھاٹ پر اترو گے اور
تم جن کے جسم سمندر کے فیصلے نہیں گے
یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی یہ تمہاری منزل ہے
کرشن نے ارجن سے میدان جنگ میں کہا..
الوداع نہیں بلکہ آگے بڑھو.
مسافرو.....

[ئی... ایس.. ایلپیٹ]

گو تم نیلمبر نے چلتے چلتے پیچھے ٹھٹھک کر دیکھا، راستے کی دھول بارش کی وجہ

لڑکیوں نے مراٹھا کرا سے دیکھا کوئی و دیارتی تھا جان پڑتا ہے، ان میں سے ایک نے کہا۔ ملاح اپنی اپنی ڈونگیوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا انتظار کرتے رہے، کشتیاں جو برگد کے سائے میں بندھی تھیں ان میں چولہے روشن کیے جا چکے

تھے اور رات کا کھانا بننا شروع ہو چکا تھا

ٹپ سے بارش کا ایک قطرہ چمپا کے بالوں پر آن کرگرا، اس نے ندی کی اور
دیکھا جدھر وہ اجنبی طالب علم نہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مارتا کسی انجانی سمت جا
رہا تھا

بڑی کٹھن زندگی ان بے چاروں کی ہوتی ہوگی۔ بزملا کو اپنے بھائی کا خیال آگیا
۔ جو کہ اس طرح کی ان گنت ندیاں چمپیل میدان اور دشورا گزار پہاڑیاں عبور کر
کے بہت دور تک مشوا گیا ہوا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا

جب یہ لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ تیسری لڑکی نے بے دھیانی
میں پوچھا۔ اس لڑکی کا نام سروجنی تھا

ہوتا کیا ہے جھک مارتے ہیں۔۔۔ کسی نے دھرم کا اوشکار کر لیتے ہیں سے کسی
نے فلسفے کا پرچار شروع کر دیتے ہیں۔ بزملا نے جل کر جواب دیا۔ اس کا اکلوتا بھائی
تکمشوا میں ریاضی اور صرف و نحو سے سرکھپانے کی بجائے یہاں ہوتا تو کیا چمپک
اس سے بیاہنے کر لیتی

باہمن بچارے بھی کیا کریں، پڑھیں نہیں تو کہاں جائیں پڑھا تو نا کے
بھاگیے میں لکھا ہے سروجنی نے منہ لٹکا کر کہا

ندی کے وسط میں پہنچا۔ تو بارش کی دوسری یونڈ گوتم کے سر پر آن گری برسات
کی وجہ سے سر جو کا پاٹ بے حد چوڑا ہو گیا تھا، سون ندی کے پاٹ سے بھی زیادہ
جسے پاٹلی پیر جاتے ہوئے گوتم نے ایک مرتبہ پیر کر عبور کیا تھا، اس نے پیرتے،
پیرتے پیٹ کت ایک بار دیکھا، گھاٹ پر لڑکیاں اب تک بیٹھی تھیں اور وہ بھی مو

جو تھی جس کے بالوں میں جمپ کا پھول تھا ان لوگوں کو مینہ میں بھگینے کا بھی ڈر
 نہیں۔ گوتم نے دل میں کہا اور پھر جلدی جلدی لہروں کا مقابلہ کرنے میں منہمک
 ہو گیا سامنے دوسرے کنارے پر دریائی گھاس اور نیلے پھولوں کی گھنی بلیں پانی کی
 سطح پر جھک آئی تھیں برگد کے سائے تاریک ہو چلے تھے سارس اور مور سمٹے
 سمٹائے او اس کھڑے تھے، چار پانچ آدمی انگوچھے کندھے پر ڈالے جلدی جلدی
 گلوں کی اور قدم بڑھا رہے تھے کنارے پر پہنچ کر گوتم نے اپنے کپڑے نچوڑے
 اور ماتر اشدہ پتھروں سے بنے ہوئے مندر میں گیا جس کے ایک کونے میں وہ اپنا
 ز اور اہ چنڈی دیوی کو سونپ کر ابودھیا گیا تھا، ایک چھوٹی سی پوٹلی میں اس کے مو قلم
 تھے اور سفید ریشم کے چند ٹکڑے، اس کا کمبل تھا، ایک سفید رنگ کی ڈھوتی اور
 چمڑے کے چپل۔ اس نے بے پروائی سے اپنی پوٹلی اٹھائی۔ پیر حفا کر کے چپل
 پہنے اور مندر سے باہر نکل آیا چاروں اوڑ بڑ اسٹاٹا تھا اور مندر کے آنگن میں تھا
 اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کیسی خوفناک بات ہے۔ فی شکل برہما جب شکل میں ظاہر ہوتا
 تو سامے گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے؟ کیا انسان کو دوسرے کے وجود پر اعتماد نہیں
 ؟ گوتم بلیمر نے خوف کے جزبے کا اکثر تجزیہ کرنا چاہا تھا، زندگی کا خوف۔ موت کا
 خوف۔ زندہ رہنے کا خوف۔ رگوید میں لکھا تھا کہا بتا میں خودی تھی جو کہ پرش کی
 شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس نے چاروں اور دیکھا اور سوائے اپنے اسے کوئی نظر نہ آیا
 اس نے کہا کہ یہ میں ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو میں سمجھنے لگا۔ اسے ڈر لگتا تھا چو
 نکہ وہ تھا تھا ایسے جوا کیلا ہوتا ہے اس سے ڈر لگتا ہے۔ پھر اسے سوچا کہ میرے سوا
 کوئی موجود نہیں پھر مجھے کا ہے کا ڈر ہے۔ لہذا اس نے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا مگر

اسے مسرت حاصل نہ تھی

کیونکہ تنہائی میں اداسی ہوتی ہے

اور اداسی سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے اپنے روح کی تنہائی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ گوتم

نے اپنے آپ سے کہا۔

مندرجہ بہت پرانا تھا، اس پاس گوتم کو کوئی پروہت یا پجاری بھی نظر نہیں آیا تھا

جس سے وہ پوچھتا کہ شراویہ جانی جانے کے لیے کوناس راستہ اختیار کرے۔ یہاں

سے کھیت ختم ہوتے تھے اور آگے شیشم کے گھنے جنگل تھے اور ڈھاک کے جھنڈ اور

بیڑ اور ان گنت ندی نالے اور ان سب کو عبور کر کے اسے اپنے آشرم واپس پہنچنا تھا

ہمندرجہ کی سیڑھیاں اتر کر وہ گاؤں کی سمت بڑھا۔ سرجو کے پار ایودھیا کی روشنیاں

جگنوؤں کی ایسی جھلما رہی تھیں۔ بارش کی دھند میں صرامنظر نیلا اور اوڈھاسا دکھائی

دیتا تھا۔ جس میں مارنجی رنگ کی دھاریاں ایسی پھیل گئی تھیں۔ گوتم نے آبادی میں پہنچ

کر دو تین دروازوں پر دستک دی۔ رات کے کھانے کے لیے اسے صرف دال

درکار تھی۔ ایک لپے پتے کچے مکان کے دوار پر روشنی جل رہی تھی۔۔۔۔۔ ادھیڑ عمر کا

گرہست اس روشنی میں بیٹھا کچھ پڑ رہا تھا۔ برآمدے کے باہر گھپ اندھیرا تھا

۔۔۔ گوتم کی آواز سن کر وہ اسے شکایہ منو کا کوئی بھٹکوا سمجھا۔ پھر وہ چراغ اٹھا کر باہر لایا

۔۔ اور اس کے اجالے میں اسے گوتم کے سفید کپڑے نظر آئے

آجکل یہاں شکایہ منی کے بھکشوں کی ایک ٹولی آئی ہوئی ہے میں سمجھا کہ تم

انہی میں سے ہو اس نے رساں سے کہا۔۔۔۔۔ جیسے یہ ہوا چلی ہے لڑکے تو لڑکے

لڑکیاں بھی گھربار چھوڑ کر جنگل بھا رہی ہیں

مجھے تھوڑی سی وال دے دو

گر بہت نے چراغ برآمدے کی منڈیر پر رکھا اور اپنی بی بی کو آواز دی اس کے بعد پھر سے باتون کا سلسلہ چل نکلا۔۔ ایک برہمن برہمچاری ہمارے دوارے پر آئے ہیں۔۔

پھر وہ گوتم سے مخاطب ہوا۔ سامنے نگر میں ایک بٹیا ہیں۔ رانی رینو کا ایسی روپ
وان۔ بکل میری بی بی جب ہاٹ کے لیے نگر گئی تو راج نواس کی داسیوں سے سنا کہ
وہ بٹیا بھی کسی دیہار میں جانے والی ہیں..... یہ اندھیر دیکھو..... اتنے میں اس کی
بی بی انا وال لے آئی.... جو گوتم نے اپنی چادر پھیل کر اس سے لے لیا اور اسے دعا
دی گزینی نے جھک کر اسے پر نام کیا اور اندر چلی گئی اس کامیاں کوش دلی سے ہنستا
رہا۔ اچھی ہوا چلی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ماں باپ۔ اب اپنی لڑکیوں کی شادی
بیابہ کی فکر سے بھی نش چنت ہو گئے۔ اسن نے اپنی بات جاری رکھی

اناج کی پونلی باندھنے کے بعد گوتم ذرا کی ذرا برآمدے کے کھمبے سے ٹکا۔ یہ گرہست بڑا خوش مزاج معلوم ہوتا تھا گوتم کا جی چاہا کہ کچھ دیر رک کر اس سے بات چیت کرے مگر اس کا مطلب تھا کہ وہ عیش و آسائیش کی طرف راغب ہو رہا ہے۔۔۔ چنانچہ اس نے فوار اس خیال کو دل سے نکال کر پھینکا۔ گو یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ بودھ طالب علموں کا گروہ ادھر آیا ہوا ہے۔ اگر کہیں مل گئے تو رات اچھی گزر جائے گی اسے بودھ طالب علموں اور فلسفیوں سے بحث مباحثہ کرنا اچھا لگتا تھا

وہ لوگ کدھر گئے ہیں؟ اس نے گریست سے پوچھا۔ یہ تو مجھے پتا نہیں

..باہمن تم اندر کیوں نہیں آ جاتے.. آؤ بیٹھو.. تمہاری سیوا تو میرا دھرم ہے
 نہیں اب میں چل ہی دوں.. گوتم نے جواب دیا.. وہ اپنی اس عزت و تکریم کا
 عادی تھا.. چلتے پھرتے ہر سے اس کا ادب کیا جاتا.. سڑک پر سے گزر رہا ہوتا تو راہ
 گیر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے.. بڑے بڑے شہزادے اس کی خاطر میں کرتے
 .. غریب کسان اسے آنکھوں پر بٹھاتے.. محض اس لیے کہ وہ طالب علم تھا اور علم کا
 محافظ

گرہست نے چراغ منڈیر پر سے اٹھایا اور اندر جا کر پھر پڑھنے میں مصروف
 ہو گیا گوتم چند لمحوں تک اندھیرے میں کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا.. اندر بچے کھیل رہے
 تھے.. گرہست کی بیوی سانولی دہلی سی لڑکی جس نے اسے آنا لا کر دیا تھا.. چولہے
 کے آگے بیٹھی تھی.. دروازے کی چوکھٹ پر پیاری مینا کا بنجرہ لٹک رہا تھا.. کس قدر
 پرسکون منظر تھا، اس سے بھی اسے ڈر لگا.. گرہست ہانسی کے مدھم اجالے میں جگمگاتی
 ہوئی لڑکی، جو کہ اس معمولی صاف ستھرے کچے مکان کی مالک تھی.. برآمدے پر
 جھکے ہوئے کیلے کے تھنڈے پتے.. پروں میں چونچ دے کر سوتی ہوئی مینا.. گرہست
 اگنی یونی جلتی رہتی ہے اور ایک دن چتا کے شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چتا
 کی آگ کے انگاروں سے ایک اور گھر کے چولہے کی بنیاد پڑتی ہے، یہی آگ
 دن پوسٹہ گھر سے لے کر نکلتا ہے.. یہ سارے دور ہر انسان پر گزرتے ہیں.. اس پر
 بھی گزریں گے.. مناظر کاے ہوتے ہیں.. وہ کبھی سمجھ ہی نہ پایا.. شراوتی میں اس کا
 سہ منزلہ مکان تھا جس کے برآمدے کے چوٹی کھبوں پر رنگین نقش و نگار بنے ہوئے
 تھے.. اس سڑک پر اس کا مکان سب سے اونچا تھا.. اس کا باپ بہت دولت مند

آدمی تھا۔ اور اس کی بہن کا بیاہ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار سے ہوا تھا یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ فارغا تحصیل ہوئی کے بعد اب ساری دنیا اس کے قدموں میں بکھری پڑی ہوگی وقت اس کا اپنا تھا۔ فراخ دلیء کے ساتھ وہ فلسفوں کو پرکھتا اور سوچتا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ کیا تھا کہ وہ چیزوں سے خوفزدہ تھا۔ بارش میں بھیکتی لڑکیاں جو کہ اس پا رگھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔۔۔ برگد کا یہ جنگل جس میں مارنجی رنگ کا لباس پہنے بھکشوؤں کی ٹولی کہیں گھوم رہی ہوگی اس ادھیڑ عمر کے گرہست کی بیوی جس کا نام رکنتی تھا یہ سب چیزیں کیوں تھیں

آبادی سے لوٹ کر وہ مندر کی طرف واپس آیا۔ آنگن میں پہنچ کر اس نے زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر چوہا بنایا۔ اور مٹی کی ہانڈی میں چاول ایلنے کے لیے چڑھا دیے

کچی پکی وال بھات کھانے کے بعد وہ مندر کی دیوار سے پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔۔۔ سامنے دریا پر تاریکی گہری ہو چکی تھی۔۔۔ چاند بہت مدھم تھا اور کہیں بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔۔۔ ہوا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی۔۔۔ سیرا جنگل اندھیرے میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔۔۔ صبح سویرے اٹھ کر اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔۔۔ اس نے سوچا۔۔۔ اسی وقت دفعتاً اسے پیروں کی آہٹ اور کسی کی مدھم ہنسی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی چند لمحوں کے بعد وہ سرک کر فرش پر لیٹ گیا۔۔۔ نیچے پنچوں کے بل کھڑے ہو کر مندر کی دیوار پر سے کسی نے جھانکا۔۔۔ اندھیرے میں گوتم کو اس کی صورت نظر نہیں آئی

تم کون ہو بھائی؟۔۔۔ نیچے سے کسی نے پوچھا

میں ہوں۔ گوتم نے لیٹے لیٹے جواب دیا

”تمہارا کیا نام ہے؟“

ہیں کا کوئی نام نہیں ہوتا؟

تفریق کے لیے نام ضروری ہے۔۔۔

شرارتی کے جن پنڈتوں کے ہاں پیدا ہوا وہاں کے پنڈتوں سے پوچھ کر میرا

نام گوتم رکھا گیا تھا

بھائی گوتم نے آجاؤ

تم خود او پر کیوں نہیں آتے

اونیچائی اور نیچائی محض ذہنوں کے فرق سے ہوتی ہے

جول

تمہیں کیا معلوم ہے تم اونچائی سمجھ رہے ہو وہ یا تال سے بھی گہری ہو

بھائی.... اسی طرح دیوار سے نیچے جھانکے بغیر سوال کیا، کیا تم بھگوت ہو؟

نہیں مگر تم مندر سے نیچے نہیں اترو گے

نیچے سانپ ہونگے اور کیڑے مکوڑے.. اور کیڑوں مکوڑوں سے دوستی کرنا

ابھی میں نے شروع نہیں کیا... اتنا کہہ کر گوتم دل میں ہنسا... ممکن ہے کہ یہ آواز اسی

جین منیاسی کی ہو۔ یا ٹلی پتر کے شاہی خاندان نے جین عالموں کو بہت سرحڑھا

رکھا تھا۔ اور باضابطہ ان کے سد عنایت کا مطالعہ کرتے تھے میں یہاں پتھر کے فرش

پر لیٹا ہوں... تم بھی یہیں آ جاؤ۔ اس نے با آواز بلند پھر کہا... سو فسطائی... شک

پرست۔ ذہریے۔ منطقی۔ جنگلوں جنگلوں بخشش کرتے مل جاتے تھے۔۔۔ یہ بھی ان

میں سے کوئی دل جلا ہے..... گوتم نے سوچا..... ان گنت منطقی گنگا کی ودای میں گھومتے پھرتے تھے.. ماہرین کلام روایتی مذہب پر حملہ کرتے..... آراء اور راہنمائی کی ضیافت کو ثابت کرنے میں مصروف رہتے... ان میں سے بہت سے مابعد الطبیعیاتی نظریات کے حامل تھے.. اکثر مادہ پرست تھے.. جین اور بودھ فلسفی بیک وقت یوگی بھی تھے اور سفسطائی بھی.. انہی گھنے گھنے جنگلوں میں بڑے بڑے بادشاہ اور شہزادے جنائے بڑھائے سادھوں کی سی زندگی گزار رہے تھے.. اور پچھلی صدی میں کپڑو وستی کے شہزادے نے بھی جنگل کا راستہ اختیار کر کے ملک کی اس روایت کو نبھایا تھا.. ان کی آمد کے وقت باسٹھ مدرسہ ہائے فکر اپنی مختلف شاخوں سمیت پہلے سے موجود تھے.. خیالات کی اس سلطنت میں انہوں نے بھی.. جو شکایہ منی سدھاوتے کہاائے..... فلسفے کی ایک اور نوآبادی قائم، کر دی تھی

باسٹھ مختلف نظریات..... اور زندگی ایک ہے.... انسان تنہا ہے... گوتم نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح لیٹا رہا.....

تم کون ہو بھائی..... کچھ دیر کے بعد گھبرا کر اس نے دوبارہ آواز دی.. اب یہ سوال میں تم سے کرتا ہوں.... گوتم اگر تم اپنی اصلیت مجھ سے چھپانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی آپتی نہیں.....

نام آوازوں کی ایک سسٹی ہے بھائی گوتم... اور ہری شکر کی آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں.. کیونکہ یہی میرا نام ہے...

بھائی ہری شکر کیا تم کرشن واسودیو کے بھگت ہو؟

نہیں میں اس سے اترا پچھتم کی اور سے آ رہا ہوں.. جہاں شیوا کی ارادھنا کی

جاتی ہے۔ گوتم میں نے کاشمیرا کی برف میں بڑی بڑی خوبصورت جگہیں دیکھی
ہیں۔ بعض دفعہ خیال آتا ہے کہ زندہ رہنا بڑی نعمت ہے
میں نے زیادہ سیاحت نہیں کی مجھے اس کا بڑا دکھ ہے
صرف اسی کا دکھ ہے تم نے دکھ کے فلسفے پر کتنا غور کیا ہے بھائی گوتم؟
آجکل میں اسی پر غور کر رہا ہوں

جہاں میں پڑھتا تھا وہاں ہم لوگ فلسفہ اور سہایتہ کی بجائے گنت و دیا اور
قانون اور طبیعیات پر زیادہ دھیان دیا کرتا تھے... لیکن رنج سے میرا بڑ
اگہرا سمبندھ ہے گوتم نیلمبر

کیا تم اجینی سے آرہے ہو.....
نہیں..... اس سے بھی بہت آگے سے
تکشا؟

ہاں.....

میرا وہاں جانے کو بہت جی چاہتا ہے تم نے اپنی تعلیم ختم کر لی؟
ہاں پھر میں بہت بڑے سفر پر نکل گیا۔ اپا ر سمندر کے کنارے میں نے دوارکا
کے درشن کیے۔۔۔ میں متھرا گیا۔۔۔ برہم ور تھ میں استھا کے کھنڈر میں نے دیکھے۔۔ گوتم
میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وقت بہت خوفناک چیز ہے۔۔ کیا تم کبھی وقت کے خوف
سے لرزے ہو

ہاں گوتم نے آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا، اندھیرے مندر کے برآمدے
پر جھکے ہوئے پپہل کے پتے سرخ نظر آرہے تھے

کیا تم بودھ ہو

ہاں تمہیں کیسے معلوم ہوا

شام جب میں بھیک مانگنے کے لیے گاؤں میں گیا تھا تو ایک گرہست نے

مجھے بتلایا تھا کہ تم لوگوں کی ایک ٹولی ادھر آئی ہوئی ہے

تم..... بھی..... ہو؟

میں نے اپنے زہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھا تھا

اور دل کا.....؟ دل اور زہن کا کیا سمبندھ؟

میں تم کو ایک بات بتاؤں.....؟ اتنا کہتے کہتے دوسرا نو جوان منڈیر کو دکر مندر

کے برآمدے میں آگیا۔ بحث کے جوش میں اس نے اپنے کھڑا ہوئے اتر کر ایک

طرف پھینک دیے اور چنڈی کے سامنے سے دیا روشن کر کے اس کی روشنی میں گوتم

کو دیکھنے لگا، گوتم اٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس نے بھی دلچسپی سے نووارد کو

دیکھا جو کہ بہت دور سے آ رہا تھا

تم یہاں کہیں آس پاس میں کاشی واشی میں پڑھتے ہو؟ دوسرے لڑکے نے

گوتم کے قریب پاؤں پھیر کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

میں شراوتی میں پڑھتا ہوں، کاشی کی پاٹ شمالہ تو خالی مہاپنڈت تیار کرتی ہے

اور تم کیا بننا چاہتے ہو؟

یہی تو سمجھ میں نہیں آتا..

تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے گوتم نیلمبر..

تم بھی اس اندھیارے میں سے نمودار ہو کر منج سے یہی سوال کرنے آئے ہو
 ؟ گوتم نے چڑ کر کہا اب ہوا میں خنکی آچلی تھی۔ جنگل کی بھگی ہونی ہوا۔ جو سو جہر پر
 سے بہتی ہوئی آرہی تھی۔ اس کی جھونکوں میں چراغ کی لوجھلما اٹھی۔ گوتم نے اپنے
 نئے ساتھی کو غور سے دیکھا۔ اس کا ذہن اور خوبصورت چہرہ گوتم کو مانوس سا نظر آیا
 ۔ گہری سایہ جڑی ہوئی بھنوں میں۔ کتابی چہرہ اور گھنگھریا لے بال۔ یہ شکل میں نے
 پہلے کہاں دیکھی ہے؟ ابھی ابھی دیکھی ہے۔ گوتم نے ہڑا کر سوچا مگر یہ
 گھنگھریا لے بال منڈواوے تو شاید کچھ مختلف معلوم ہو۔ ورنہ یہ تو جانا پہچانا سا چہرہ
 ہے

تم نے اپنا سر نہیں گھٹوایا۔۔۔ کیسے بکاشو ہو۔ گوتم نے ذرا ہنشت سے سوال کیا
 میں نے بھی اپنے ذہن کا دروازہ ابھی کھلا رکھ چھوڑا ہے
 اور تمہارا سنگھ؟

میرا سنگھ اور میں دو مختلف چیزیں ہیں۔۔۔ میں آزاد ہوں۔ اور مزید آزادی کی تلا
 ش میں مصروف

تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

نوجوان نے دریا کی سمت اشارہ کیا اس پار کا

اچھا۔ گوتم ذرا چونک کر اٹھ بیٹھا

تمہیں اتنا اچنچا کا ہے کے لیے ہوا؟ ہم سب کو کہیں نہ کہیں تو پیدا ہونا ہی ہے
 ۔ ممکن تھا کہ میں میمنس میں پیدا ہوا ہوتا اور تم یا وادیپ میں؟۔۔۔۔ ہری شکر نے تبسم
 کے ساتھ گوتم کو دیکھا

تم یہیں کے رہنے والے ہو اور اب بھکشو بنے اجنبیوں کی طرح گھوم رہے ہو
ہم سب ایک دوسرے کے لیے ازنی اور ابدی اجنبی ہیں

گو تم خاموش ہو گیا۔ ہری شکر۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ تم بحث میں مجھے ہرا
نہیں سکو گے۔ شکا کیہ منی بھی آخر اسی کوشل دیس کی رہنے والے تھے۔ وہ شراوتی میں
آ کر برسوں رہے۔ انہیں پروان نری حاصل کیے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی،
مگر سارا ملک ایک نئے نارنگی رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اس کی تیوری پر بل آگئے
۔ اس نارنجی ساری والی لڑکی کی یاد اس کے ذہن میں کوندی اور اسے بڑی کوفت ہو
ئی۔ جب سے یہ ہوا چلی ہے لڑکیاں بھی گھر بار تنج کر جنگل بسا رہی ہیں۔ تمہیں
ویدوں پر یقین نہیں رہا جو تم نے یہ حلیہ بنایا ہے؟ اس نے زرا جھوڑ کر کہا۔ بھکش کا
فلسفہ اور تمہاری ساری پری بھا شاپشددوں سے موجود ہے۔ شکا کیہ منی شروع سے
آخر تک کپل کے نظریوں سے متاثر تھے۔ خود بدھ کا لفظ وید سے نکلا ہے۔ کوئی چیز
خیالات کی دنیا میں نش کول اور غیر متعلق نہیں ہے۔ تم کا پریوگ کیوں کرتے ہو۔؟
ہری شکر چپکا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے زرا مسکرا کر پوچھا۔ تم کو لڑکیوں کی کیا فکر
ہے۔ کوئی خاص لڑکی ویہار میں جانے والی ہے۔۔۔۔؟

تم لوگ اس طرح ہنستے کیوں ہو۔ دیکھو تمہارے آنند پر کیا ہتی تھی۔ گو تم نے
اور زیادہ چڑھ کر کہا

گو تم نیلمبر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ہری شکر نے ٹانگیں اور پھیلا کر
آرام سے لیٹے ہوئے جواب دیا

تم کا ہے سے بھاگ رہے ہو۔ گو تم نے غصے میں پوچھا

تم کا ہے کی تلاش میں ہو.. ہری شکر نے کہا.. میرے یہاں تو ساری تلاش ختم ہو چکی ہے

اگر میری درگاہ میں اعلیٰ اخلاق برتنے کا اپدیش نہ دیا جاتا تو میں یہی کھڑا ہوں تمہارے ناک پر لگاتا...

ہری شکر نے فہم لگایا.. اگر مجھے دوستوں کی ضرورت نہ رہی ہوتی تو میں تمہیں اپنا دوست بنا لیتا

تم خود پرست ہو

اور تم ذہن کے غرور میں مبتلا ہو

تمہیں ناک سے دلچسپی ہے؟ گوتم نے موضوع بدلا

تھی.... مختصر جواب ملا

اچھا... مگر الفاظ کا ناک تو تم ہر سہ کھیلے ہو.. ہری شکر خاموش رہا.. اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے گوتم جوش میں آ کر بولتا رہا.. تین سو سال ہوئے تمہاری تکسلا میں ایک شخص گزرا ہے جس کا نام پانچی تھا.. اس نے الفاظ کے اسرار کی ایک نئی کائنات دریافت کی تھی جب تلاش ختم ہو چکی ہے تو الفاظ کا استعمال کیوں کرتے ہو.. الفاظ کو بھی ملتی کر کے دیکھو

ہری شکر کروٹ بدل کر کہنیوں کے بل لیٹ گیا.. گوتم میں نے پانچی کی آٹھوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے.. میں کاٹھیرا کے مدرسوں میں گیا ہوں.. جہاں سنسکرت کو مکمل بنایا جا رہا ہے.. میں نے یانوں کی بولی بھی سیکھی ہے اور پارسیکاؤن کی بھی... لیکن اب میں الفاظ ختم کرنا چاہتا ہوں

کیونکہ... ہری شکر کہتا رہا.. زبان... الفاظ وعدے کرتے ہیں جو کہ نبھائے نہیں جاتے.. خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں.. ان کے معنی کی کھوج میں بھاگنا شروع کیا تو بھٹک کر میں کہاں سے کہاں جا نکلا.. اسی وجہ سے گوتم سدھارتھ نے کہا تھا کہ...

لیکن گوتم نیلمبر نے ہری شکر کی بات کاٹی.. لیکن اوم کے تین حرفوں اور ساپا سما کے تین سروں کے درمیان..... تو کائنات کا سارا وجود بندھا ہوا ہے... آواز آکاش کا ایک گن ہے کہے جاو.. ہری شکر بولا

برہسپتی مادہ پرست آکاش کو نہیں مانتے... تم تو مانتے ہو مگر تمہارے ہننام... گوتم..... نے تو کہا تھا کہ اگر آواز ابدی ہے تو زبان سے پہلے ہی لفظ سنائی دے جانا چاہیے... کیونکہ آکاش اور ہمارے کانوں کے درمیان کوئی روک نہیں ہے.. ہری شکر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا

لفظ بھی ابدی ہے... گوتم نے جواب دیا.. حرف ہمیشہ سے موجود ہے یا حرف ن اس کو جب بھی ادا کیا گیا ہو گا اس کی آواز یہی رہی ہوگی.. جیمنی کہتا ہے کہ آواز اس کے لیے ابدی ہے کہ سننے کے بعد دماغ کو یاد دہتی ہے اور بیک وقت ہر جگہ موجود ہے اور کبھی ختم نہیں کی جاسکتی

اور اسی لیے ویدوں کو..... کیونکہ وہ الفاظ ہیں.... کبھی رد نہیں کیا جاسکتا؟... ہری شکر نے نظریں اٹھا کر پوچھا

تم کیسے فلسفی ہو جو کہ الفاظ پر یقین نہیں رکھتے... گوتم نے جھنجھلا کر جواب دیا

.. پاننی تمہارے تشکل کے استاد کہا تھا اپنے یاد دوسروں کے خیالات کے مظاہر صرف الفاظ ہی ہو سکتے ہیں.. ان کی ماہیت کا مطالعہ کرنا کس قدر ضروری ہے.. الفاظ کے راستے کے بنا خالص خیال تک کس طرح پہنچ پاو گے؟ آواز الفاظ کا پراکرتک گن ہے... اور مادہ ابدی ہے... وید زبان کی شکل میں برہما ہے.. اور مادہ برہما ہے وقت کو ابدیت سمجھ کر تم لوگوں نے بہت گڑبڑ پھیلا رکھی ہے.. ہری شکر نے دو بارہ فرش پر لیٹتے ہوئے اظہار خیال کیا

معنی اصل چیز ہے... گوتم نے جواب دیا... پاننی کا کہنا ہے کہ سارے الفاظ کا ماحاصل خالص وجود ہے... ست.. اصلیت اور مختلف چیزوں کے لیے برہما کے الگ الگ نام ہیں.. وہ سامنے سے گزرتا ہوا بھورا سور... گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایودھیا کی لڑکیاں... تم... ہری شکر یہ سب مہمان آتما ہیں تم تعجب ہے اب تک ویدانت سے آگے نہیں بڑھے انت کے آگے اور کیا ہو سکتا ہے تم ہی بتاؤ

پرم آتما اور جیو آتما میں اودیا کی وجہ سے دوئی قائم ہے... لہذا لفظ اور غیر لفظ دو برہما ہیں اور لفظ پر دھیان کر کے غیر لفظ کا انکشاف ہو سکتا ہے وہ غیر لفظ میں خود ہوں... ہری شکر نے کہا.. گوتم خاموش ہو گیا

علیت کا قانون بجا ہے خود مکمل ہے... کوئی چیز دوسری چیز کے مانند نہیں ہے.. صرف اپنے لحاظ وجود کے علاوہ کسی شے کا کسی شے سے کوئی تعلق نہیں، سمجھے.. سب وقتی ہے اور مصیبت ہے.. ہر دکھم دکھم... ہری شکر نے کہا.. جسم اور آتما دونوں فانی

ہیں۔ دونوں کے اکٹھا ہو جانے سے بھی کوئی مستقل وجود پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ آتما ابدی نہیں ہے۔ انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے۔ محض واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم رہتا ہے۔۔۔ ایک لڑکی تھی۔۔۔ سو رہے ہو بھائی گوتم؟
نہیں کہے جاو

ایک لڑکی تھی۔۔۔ اس نے بھی مجھے ابدیت کا قائل کرنا چاہا تھا۔ وہ بھی ساپا سائیں
زمننا و مکان کو محیط کر لیا کرتی تھی۔۔۔ دینا پر وہ صبح بھیرا اور میگھ بجاتی۔۔۔ دوپہری
کو جب ساری دنیا سونے کے رنگ میں رنگ جاتی۔۔۔ تب میں اس سے دیک
اور شری راگ سنتا۔۔۔ رات پڑے وہ ہنڈول گاتی۔۔۔ اس لڑکی کو سنگیت کا جنون تھا
تم نے گیت اور الفاظ ملتوی کر دیے مگر سر رہیں گے۔۔۔ سرائل ہیں۔۔۔ گوتم بولا
کچھ دیر کے بعد ہری شنکر نے پھر کہنا شروع کیا۔۔۔ میں جب اتر کوشل کی سرحد
پر پہنچا تو فلم استھان کے پہرے دار نے لٹکار کر مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آرہے
ہو؟ میں یہیں سے گیا تھا اور یہیں لوٹ کر آیا ہوں۔۔۔ میں نے جواب دیا اور یہی تم
سب کا حشر ہو گا۔۔۔ اچکار سے بچنے کی کوشش کرو

تم اس کا مطلب سمجھو۔۔۔ پہرے دار نے اپنے ساتھی سے کہا۔۔۔ یہ بھی کوئی فلسفی
جان پڑتا ہے اور پھر دونوں کوڑیاں کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔۔۔ مگر میں جب ایودھیا
میں داخل ہوا تو مجھے پتا چلا کہ سرائی بھی باقی ہیں۔ گوتم زندگی کا پھیلا بہت زبردست
ہے۔۔۔ ملک بستیاں۔۔۔ نئے نئے لوگ۔۔۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔۔۔ میں نے پاٹلی پتر
سے لے کر پشکروتی تک سرائی کے کھڑاؤں پہن کر طے کیا ہے۔۔۔ یہاں سے
کچھ فاصلے پر گوتمی کے کنارے لکھش ناوتی آباد ہے۔۔۔ جسے سری پھمن نے بسایا تھا

سنگم پر پریاگ ہے.. پھر کانیا کیج.. ہتاپور اور تکلشلا.. اس کے آگے سرحد کا شہر
 پشکروتی.. اس لمبی شاہراہ پر میں نے بہت طویل سفر طے کیا.. مگر ہنڈول کے سر برابر
 میرا پیچھا کرتے رہے.. تم کئی سال میں تکلشلا میں رہا اور انہیں بھلائے رکھا.. یہاں
 لوٹ کر پھر وہ آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں.. تم مجھ سے لفظ اور آواز کی
 ابدیت کی بات کرتے ہو.. مجھ سے پوچھو.. مجھے معلوم ہے یہ سب جگہوں کے سحر کا
 اثر ہے اصلیت کچھ نہیں.. سر دم و سہم دکھم

سنا ہے وہ پراچین ایودھیا کی رانی رینوکا ایسی خوبصورت ہے
 کس کا ذکر کرتے ہو.. ہری شنکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا
 پتا نہیں گوتم نے جواب دیا.. پھر وہ بھی آنکھیں بند کر کے فرش پر لیٹ رہا
 مقدس سر جو.. رگ وید میں پہنے والی ندی.. میری ماں.... نہ جانے کب تک
 اسی طرح بہتی رہے گی.. سامنے میرا شہر ہے.. ہری شنکر کی خوبصورت مدھم آواز اس
 کے کانوں میں آتی رہی.. خوبصورت.. شاندار ایودھیا.. کتنے زمانے سے اسی جگہ پر
 راتوں کو یونہی جگمگاتا رہا ہے.. کتنے جگ بیتے جب منو کا بیٹا اس کا پہلا بادشاہ بنا تھا
 .. اور شیو بھگت بھاگیرت اور ڈگ و بے فاتح عالم.. رام چندر ایودھیا.. اجکا.. برہم کا
 شہر.. جسے کوئی جیت نہیں سکتا.. تم نے کبھی اس نگری کے رقاصوں اور سنگیت کاروں کو
 دیکھا ہے؟ یہاں کے ناچوں میں شامل ہوئے ہو؟ راج محل میں بسنت کا تہوار
 منایا ہے؟ یہیں پر جمپک رہتی ہے اور یہیں پر میرے گھر والے اور میری بہن
 میرے منتظر ہیں.. جس طرح سی کرشن کو اپنی بہن سبھدرا بڑی پیاری تھی ویسے ہی
 میں اپنی بہن کو عزیز رکھتا تھا.. مگر میں نے اس کی محبت کو دوسری محبتوں اور

وفا داریوں کے ساتھ دل سے نکال پھینکا اور پھر اوچین لوٹ آیا..... رام نے چودہ برس کے بن واس کے بعد لوٹنے کا وجہ دیا تھا... میں بھی آیا ہوں.. مگر سدھارتھ نے مجھے وعدوں کے بندھن سے آزاد کر دیا ہے.... میری بہن... رام چندر کی بہن شانتا کے جیسی خوبصورت اور معصوم ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسی ایودھیا میں جس طرح ڈیڑھ ہزار سال قبل شانتا اور سیتا کی جوڑی تھی.. ایسے ہی نر ملا اور چمپک چاند اور سورج کی مانند جگمگاتی ہیں.... دیکھو الفاظ نے پھر میرے ساتھ غداری کی ہے.. اس نے اسی سے بات ختم کی

گوتم نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا.. باہر درختوں پر بارش برسنے شروع ہو گئی تھی.. برسات کا موسم ہے.. یہ موسم سارے بھکشو و بیہاروں میں بسر کرتے ہیں.. گوتم کو خیال آیا.. اس نے کروٹ بدل کر برہی شکر سے پوچھا تم شرون کا زمانہ کہاں گزرو گے؟

پتا نہیں

تمہارے باقی دوست کہاں جا رہے ہیں؟

میرے ہم سفر.. تمہارا مطلب ہے

ہم سفر ہی کہہ لو

یہ بھی معلوم نہیں

تکشلہ تو رہنموں کی درگاہ ہے.. تم وہاں کیسے پہنچ گئے

میں... میں تو پکھناؤں کے دیس بھی رہا ہوں.. جہاں اتر کے نیلی آنکھوں

والے سفید فام ولایتی شیو کی عبادت کرتے ہیں.. میں نے ایراوتی [راوی] اور

چندر بھاگ [چناب] کی وادیوں کی سیر کی ہے۔ میں سندھو کی لہروں پر تیرا ہوں
 .. پورب میں دفن تک گیا ہوں۔ میں نے برہم پتر اور سندربن اور چندرادیپ کی
 دلدلوں میں جنگلی دھان اگتے دیکھے ہیں۔ جہاں سیاہ لباس پہنے لمبے بال ک
 ندھوں پر چھٹکائے مرگ مینی لڑکیاں ہرے بانوں کے جھنڈوں میں رہتی ہیں اور
 پریوں کی طرح گاتی ہیں۔ گوتم زندگی کا پھیلاؤ بہت عظیم ہے۔ اس وسعت سے
 بچتے رہو۔ کائنات..... اور اس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ کہاں جاتی
 ہے؟ ہم کہاں پیدا ہوئے؟ کس طرح اور کس وجہ سے زندہ ہیں۔ اور یہاں سے
 کہاں جائیں گے؟ یتیم جو برہما سے واقف ہو۔ ذرا تلاؤ دکھ یا سکھ کس کے حکم
 سے یہاں رہ رہے ہیں؟ وقت یا فطرت..... یا حادثے۔ یا عناصر کو سمجھا جائے یا
 سے پر جوش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پر مآتما ہے؟ ہری شنکر نے بات ختم کی
 اپنشدوں میں لکھا ہے کہ کائنات آزادی میں پیدا ہوئی ہے، آزادی موجود
 رہتی ہے اور آزادی میں سمو جاتی ہے

وہی ابدیت... ہری شنکر نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ آزادی اور ابدیت خود
 ایک قید نہیں؟

بارش تیزی سے شروع ہو گئی۔ دیا ہوا کے جھونکے سے بچھ چکا تھا۔ شنکر نے
 اینٹوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا گوتم نے اپنی سفید چادر اوڑھ کر دیوار کی طرف
 کروٹ بدل لی۔ دونوں کچھ دیر تک چپ چاپ اندھیرے میں پلکیں جھپکایے
 پھر پروانی کے جھونکوں سے انہیں بھی نیند آ گئی

اس رات گوتم کو عجیب عجیب خواب نظر آئے، منڈی کی کوٹھڑی میں سے نکل کر

چنڈی دیوی اپنے گوری کے روپ میں چھن چھن کرتی باہر آئیں۔ پھر وہ کیسری ساری والی لڑکی سے تبدیل ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے بعد ان کی شکل پھر مختلف نظر آئی۔ پہلے وہ دلہن بنیں۔ بتی کے روپ میں مہادیو سے ان کا بیاہ ہوا۔ پھر پل کی پل میں ایک بوڑھی عورت۔ درگاہ سے بھی زیادہ خوفناک۔ آلتی پالتی مارے ان کے سر ہانے آن بیٹھی۔ اور زور زور سے رونے لگی میری ماں۔ میری ماں۔ گوتم نے لرز کر کہا۔ لیکن بوڑھی عورت نے دانت نکوس کر جواب دیا۔ میں تمہاری ماں نہیں۔ مارے میں نے تو ویشالی کی۔ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ایک پل درخت کی شاخ پر سے ٹوٹ کر آنگن میں آن گری اور گوتم ہڑا کراٹھ بیٹھا۔ شکر بڑے سکون سے سو رہا تھا۔ بارش ختم چکی تھی۔ ہندی کے کنارے چنڈال کسی کی لاش مرگٹ کی سمت لیے جا رہے تھے اور کشتیوں کی روشنی اندھیرے میں اگیا بھتال کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی منتر پڑھنا شروع کر دیے۔ بہت دیر کے بعد اسے نیند آئی

مند اندھیرے جب شکر کی آنکھ کھلی۔ اس وقت گوتم چنڈی پاٹھ میں مصروف تھا۔ گھاٹ پر برہمن کھنکار رہے تھے ام کا باغ چڑیوں کی چہکار سے گونج اٹھا تھا۔ گوتم عبادت کے باہر نکلا۔ تو ہری شکر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ دفعتاً گوتم نے اس کو پوچھا۔۔۔ ویشالی میں کون رہتا تھا؟

میں ویشالی کی کسی مہیال سے واقف نہیں ہوں۔ شکر نے بری سنجیدگی سے سر ہلا کر جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا۔ گوتم کو اس کی بے تکلی ہنسی پر بہت غصہ آیا وہ دونوں مندر کی سیڑھیاں اتر کر جنگل کے راستے پر آ گئے۔ ہندی کے کنارے

بجکشوں کا گروہ نہانے کے لیے آیا ہوا تھا
 تم اب شرارتی واپس چلے جاتے ہو... شکر نے پوچھا
 ہاں تم نہ چلو گے... وہاں سے کچھ فاصلے پر کپڑا دتی ہے... ادھر پورب میں کوئی
 نگر ہے... اور گیا تم ان سب جگہوں کی یا ترا کے لیے نہ جاو گے؟
 تم اپنا مطلب بیان کرو
 میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو... تم میرے اثرم میں ٹھہر سکتے ہو
 ... یا اگر میرے ماں باپ کی عزت بڑھانا چاہو تو شہر کے اندر میرا گھر ہے
 میرا ارادہ کاشی جانے کا تھا... مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میری راہ میں حائل ہوتے
 ہو...

یہی بات دوسری طرح بھی کہی جاسکتی ہے... تم میرا راستہ کھونا کر رہے ہو
 ... بھائی ہری شکر... پگڈنڈی پتلی ہو اور دورا بگیر آمنے سامنے آن کھڑے ہوں تو ان
 میں سے ایک کو ہٹ جانا چاہیے... ورنہ دونوں کھڈے میں جاگریں گے گوتم نے کہا
 پھر میں تمہارے ساتھ شرارتی کیوں چلوں... اس لیے کہ تمہیں میرے مزہب
 سے دلچسپی ہے یا اس لیے کہ تم ایو دھیا کی ماری چمپک کے متعلق مزید معلومات
 حاصل کرنا چاہتے ہو؟

ہری شکر اگر تم نے شاکیہ منی کے چیلوں کا یہ گیر واپہنا واندہ پہن رکھا ہوتا تو میں
 تمہاری ٹھکانی کرویتا... گوتم نے دل میں کہا
 وہ دونوں آبادی چھوڑ کر شرارتی کی طرف بڑھنے لگے

آسمان پر سے بادل چھٹ گئے تھے، ہوا میں کچی کلیوں کی مہک اُڑ رہی تھی

..کدم کے ایک جھنڈ میں مور پر پھیلائے ناچ رہا تھا.. کھیتوں کی منڈیر پر دھانی اور
 کپاسی ساڑیاں پہنے ہوئے کسن عورتیں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں اسوک کے
 جنگلوں میں جگہ جگہ جو دیواستھان اور دیوگرہ بنے ہوئے تھے گوتم ان پر پھل پھول
 چڑھاتا راستہ طے کرتا جا رہا تھا شکر خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا

شام پڑے دونوں لڑکے مور پالنے والوں کے ایک گاؤں کی فصیل میں داخل
 ہو گئے، ان گنت مور چاروں اور بانگوں میں گھوم رہے تھے چھپروں کے نیچے مور
 کے پروں کے پنکھے اور مور پھل تیار کیے جا رہے تھے.. چوپال میں گانا ہو رہا تھا
 گوتم اور ہری شکر کنوئیں کے من پر بیٹھ گئے.. پل کی پل میں سارے میں خبر
 پھیل گئی تھی دو دیا رتی گاؤں میں مہمان آئے ہیں.. ان کی اوبھگت شروع ہوئی
 ..شکر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہا

ایک لڑکی دو خوبصورت پنکیاں نذر کرنے کے لیے آئی تھی.. گوتم نے لڑکی کے
 ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور اسے الٹ پٹ کر دیکھنے لگا.. اس کے پروں پر انگلیاں
 پھیریں.. لڑکی بڑے ادب سے آشیر باد کی منتظر کچھ فاصلے پر کھڑی رہی... یہ پنکھے
 کہاں کہاں کن کن دور دراز کے شہروں اور ملکوں کو بھیجے جائیں گے.. کیسے کیسے لوگ
 ان کو استعمال کریں گے.. وہ سوچ رہا تھا.. یہ پنکیا جو میں چھو رہا ہوں.. یہی ایودھیا
 کے بازار میں جا کر بکے گی اور شاید وہی لڑکی اسے خرید لے گی.. پھر اس نے دونوں
 پنکیاں واپس کر دیں.. ہمیں عیش و آرام کا حکم نہیں.. ہمیں تمہارے یہ خوبصورت
 پنکھے نہیں چاہیے.. مور کے پروں کو ہم بن میں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں.. اس نے
 جلدی جلدی کہا.. لڑکی نے پنکیاں اٹھالیں اور پر نام کے لیے جھکی اور شکر چونک کر بھکاشو

کانارنجی لباس پہنے ہوئے تھا اس نے آگے بڑھ کر شکر کے پاؤں چھو لیے
تمہارا نام سجاتا تو نہیں... گوتم نے ہنس کر اس سے پوچھا.. اور شکر پر نظر ڈالی وہ
اب بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا

نہیں.. میرا نام نند بالا ہے.. سجاتا میری بڑی بہن ہے لڑکی نے سادگی سے
جواب دیا اور پھر کنوئیں کے من پر سے اتر کر گاہوں کی طرف لوٹ گئی
بھائی گوتم ہر زمانے میں ہر قدم پر تمہیں کوئی نند بالا ملے گی... کوئی سجاتا اور وہ
تمہارے پاس آ کر تمہاری پرستش کرنا چاہے گی.. اب بھی وقت ہے کہ آنکھیں کھولو
.. ہری شکر نے کہا

صبح سویر پھر وہ اپنے سفر پر چل نکلے اور دو دن تک چلتے رہے.. اب شراوتی
زیادہ دور نہیں تھا... شیشم کے جنگلوں کے اختتام پر آبادی شروع ہو گئی تھی.. سڑک پر
دو روید درخت لگے تھے.. جن کے پرے امرا کے مکانات تھے.. ان مکانوں کے
باغوں میں نٹلی پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں.. اور امرود اور انار کے درختوں کے جھنڈ تھے
جن پر سبز پروں والے طوطے شور مچا رہے تھے.. پالتو مور مر میری تالابوں کے
کنارے کھڑے پانی میں اپنا عکس دیکھتے تھے.. جامن کے درختوں میں جھولے
پڑے تھے.. مکانوں کی دیواروں کی سفیدی ہلکی دھوپ میں دورست جگمگا رہی
تھی

براہر کی پگڈنڈی پر سے خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ بیلوں پر بیٹھا گاتا سجاتا گزر
گیا

چلتے چلتے دفعتاً رک کر شکر نے گوتم کو مخاطب کیا.. بھائی گوتم ویشالی کی امبیا پانی

تھی گوچمپک اور سجاتا اور نند بالاسب ایک ہی ہیں۔ اپنے ذہن کو انتشار سے محفوظ رکھو۔ اور پھر یکنخت شکر پگڈنڈی پر سے اتر کر واپس شیشم کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا گوتم اسے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا

.....۲

شراوتی کا خوبصورت شہر اپتی کے جنوبی کنارے دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اتر مے ڈرافا حملے پر ہماوت کے گلابی اور نیلے پیٹاڑیستادہ تھے اور دیودار کے گھنے جنگلوں اور اس پاس ترانی کے نرگسوں میں باگھ اور بگھلے گھومتے تھے

پیٹاڑوں کا یہ سلسلہ بہت اوپر سے آرہا تھا جاہن مان سرود کی جھیل تھی۔ جس کی شفاف لہروں پر دنیا کی آتما کاراج ہنس اکیلا تیرتا تھا۔ ہماوت کے اونچے پیٹاڑوں کا اور کامروپ تک پھیلے تھے ان پیٹاڑوں کے اس پار اتر میں سونے کی رنگت والی کچھوں کا دیس تھا، وادیوں میں ان گنت روپلے آبشار اور ٹھنڈے پانی کی ندیاں تھیں۔ اور خوشبودار پتوں کے درخت اور دھان کے کھیت اور تاریک خنک جنگلوں میں گروگل بنے ہوئے تھے جہاں ملک کے نوجوان لڑکے۔۔۔ شہزادے اور مفلس برہمن اور کشتری امیر زادے علم حاصل کرنے میں جئے تھے

انہیں جنگلوں میں۔۔ پیٹاڑوں کی ڈھلوانوں پر جہاں دن میں بھی گھپ اندھیرا رہتا تھا۔ ہاتھی پلے تھے۔۔ راجن سال میں ایک بار کھیدا کے لیے وہاں آتے تھے ہاتھی پکڑنے والے ہانکا لگاتے۔۔ درباریوں کا پڑا ہوتا۔۔ جنگل میں منگل لگ جاتا ہاتھیوں کا راستہ تلاش کرنے والا اور سدھانے والوں کا عملہ جنگلوں کے کنارے لکڑی اور بانس کے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا ان کی لڑکیاں مونگے اور فیروزے

کے رو پہلے زیور پہنے بالوں کی مینڈھیاں گوندھے ہاٹ بازار کے لیے جب
میدانوں کی طرف آئیں تو شہری لڑکیاں ان کی رنگ برنگی سیاہ۔سرخ اور زرد
دھاریوں والی پوشاک کو بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتیں

اترکوشل کی ریاست میں نگر۔۔ پورا اور نگریاں۔۔ شہر اور قصبے اور گاؤں ان ہرے
بھرے میدانوں میں آباد تھے جنگلوں کی افراط تھی۔۔ جن کی لکڑی سے خوبصورت
مکان بنائے جاتے۔۔ اب آبادی بڑھ رہی تھی اور جنگل کٹتے جاتے تھے

شرواستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا۔۔ دور کے دلشوں سے آئے ہوئے
لوگ یہاں رہتے تھے۔۔ الگ الگ محلوں میں کاری گر۔۔ سنار۔۔ بزاز۔۔ آڑھتی اور
دوسری پیشہ ور جماعتیں آباد تھیں۔۔ ان کی اپنی اپنی منڈلیاں تھیں اپنے قوانین

چوروں تک کی کنڈلی مع ایک ضابطہ شاستر کے پاس موجود تھی بارہ مہنے چہل
پہل رہتی۔۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تہوار منایا جاتا۔۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک تھا
۔۔ مصوروں اور سنگ تراشوں کی ٹولیاں نگارخانوں میں مصروف رہتی تھیں ناک
منڈلی میں صبح سے کھیل شروع ہو جاتا اور دن بھر جاری رہتا۔۔ ناک اور ناکائیں
زرق برق کپڑے پہنے،، چہروں پر روغن لگائے مشہور تمثیلیں پیش کرتیں
۔۔ چوراہوں پر مدرائی اپنے کرتب دکھاتے۔۔ بھنگ کی دکانوں پر آوارہ گردوں
۔۔ اچکوں اور ٹھگوں کا مجمع رہتا۔۔ تہواروں کے موقع پر بخارے تاڑی پی کر زور زور
سے گاتے پھرتے۔۔ دوم نقلیں کرتے۔۔ دلش ناریاں چھن چھن کرتیں اپنی گلیوں
میں، ہلتیں امیر زادیاں سولہ سنگھار کیے تھا لوں میں گلی کے چراغ جلانے مندروں
کی اور جاتی نظر آتیں۔۔ عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی

رتھہ کار۔۔ مٹی کے برتن بنانے والے۔ کلاں اور بید کی ٹوکری بننے والے شہر کے
 باہر رہتے تھے۔ آبادی سے بالکل الگ تھلگ چنڈالوں کی بستی تھی ان کا پنجم طبقہ
 چاروں زاتوں سے کم تر تھا۔ محض لاشیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسمت میں لکھا
 تھا یہی ان کا پیشہ تھا۔ وہ صرف مردوں کی اترن پہن سکتے تھے ان کو حکم تھا کہ ٹوٹے
 پھوٹے برتنوں میں کھانا کھائیں اور محض کانسی کے گہنے استعمال کریں

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شراوتی میں کپلاوتی کے شاکہ منی آن کر رہے تھے
 اور انہوں نے اور ان کے حواریوں نے اپنے واعظوں میں بتلایا کہ آدمی پیدائش
 کی بناء پر نہیں بلکہ عمل کی بناء پر بلچھ یا اچھوت بنتا ہے اور اب مارنجی لباسوں والے
 جھکشوں کی ٹولیاں بستی بستی گھوم کر چنڈالوں اور اچھوتوں کو نیک عمل کی تلقین کر رہی
 تھیں

شراوتی کی رونق ہر موسم میں قائم رہتی۔ گرمیاں آتیں تو امراء اپنے باغوں میں
 تالابوں کے کنارے جا بیٹھتے۔ یا خنک تہہ خانوں میں آرام کرتے۔ شام کے سے
 بازار میں کھوئے سے کھوا چھلتا۔ بوڑھی عورتیں موتیا اور چنبیلی کے کجرے گھروں کی
 ڈیوڑھیوں پر لے جا کر پچھتیں۔ خوبصورت لڑکیاں اونچے مکانوں کے جھروکوں سے
 نیچے جھانکتیں

شہر سے باہر کھلے سبزہ زاروں میں کشتری سورما سندھ اور ایران اور عرب کے
 اسیل گھوڑوں پر سوار ہوا سے باتیں کرتے نظر آتے۔ گاؤں کی سمت جانے والے
 سایہ دار کچے راستوں پر کسانوں کی بیل گاڑیاں اور بلیاں چرخ چوں کرتی نرم
 روی سے چلتیں

مون برت رکھنے والے برہمنوں کی مانند.. سال بھر گم سم رہنے کے بعد مینڈکوں نے طوفان کے دیوتا سے زندگی کی اہر حاصل کی ہے اور اب کیسے زور زور سے چلا رہے ہیں جس طرح طالب علم اپنے استاد کے الفاظ یک زبان ہو کر دہراتے ہیں اسی طرح ایک مینڈک دوسرے مینڈک کی بولی نقل کرتا ہے سب کے سب تلیا میں لیٹے برساتی راگ الاپنے میں جڑے ہیں

گوتم نے مسکرا کر کتاب بند کر دی اور نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا بارش جھما جھم برساتا شروع ہو گئی تھی مینڈک ٹرا رہے تھے مور جھنکارتے تھے... پیپہا نسل مچا رہا تھا.. ساون کی گھٹائیں جھوم کر اٹھی تھیں رگ وید میں صدیوں پہلے برکھارت کی جیسی منظر کشی کی گئی تھی... وہ منظر ویسے کا ویسے بالکل اس کے سامنے موجود تھا.. کئی کے پھونس پر لو کی کی بیل پھیلی تھی اس پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گوتم کے پیروں کو بھگوئے ڈال رہے تھے وہ کئی کے برآمدے میں بیٹھا ساون کی آوازیں سنتا رہا سازوں کا ایک بہت عظیم اجتماع تھا.. جس پر سرسوتی میگھ راگ بجا رہی تھی امن اور سکون کا راگ..... میگھ؟... اس کا ذکر میں نے ابھی کسی سے سنا ہے؟.. کیا میں ابھی تک اپنے حافظے پر قابو نہیں پاسکا.. مجھے غیر ضروری باتیں کیوں یاد رہتی ہیں..... اس نے اداسی سے سوچا اور کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی... اور بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگا.. ساون کی پورن ماشی آگئی تھی اور پڑھائی شروع ہو نے والی تھی گوتم نیلمبر اپنے آشرم واپس آچکا تھا.. آشرم شہر سے دور اسوک کے جنگل میں واقع تھا.. ندی کے کنارے کنارے جھونپڑوں میں طالب علم رہتے تھے.. اس

پارگرو کے کھیت تھے جو کہ سرکار کی طرف سے آشرم کو ملے تھے... بارش تھمتی تھی تو طالب علم ان میں کام کیا کرتے تھے۔ یخزان کے مہینے میں تبت کی طرف سے اڑتے ہوئے ہنس آتے اور بسنت کے زمانے میں لوٹ جاتے۔ طالب علم صبح صبح جب اشنان اور عبادت کے لیے گھاٹ پر جاتے تو انہیں اپنے یہ خاموش رفیق سنیا سیوں کی طرح مراقبے میں ڈوبے ملتے

گوتم اپنے گرو کے پاس جنہیں اچار یہ کا درجہ حاصل تھا۔ بدقوتوں سے پڑھ رہا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ اس دوران اس نے ناک لکھنے اور تصویریں بنانے میں بہت شہرت پائی تھی اپنے آشرم سے باہر دوسری درسگاہوں میں بھی اس کا نام عزت سے لیا جاتا تھا اگر یہ پیدائشی شاعر ہے تو اسے پروہت بنانے کا کیا فائدہ؟ اس کے معلم نے سوچا تھا... مگر گوتم کے پاس یہی راستہ اٹل تھا راج دربار میں پروہت کی مسند اس کی منتظر تھی جس پر اس وقت اس کا باپ بیٹھا تھا... ممکن ہے کہ ایک روز وہ ایک پروہت کے رتبے تک پہنچ جائے اور اترکوشل کے عالیہ دوسری ریاستوں کا بھی مشیر بنے وہ بے حد ذہین لڑکا تھا اور اس کے پورو دیس میں علم کی بہت قدر کی جاتی تھی اسے فنون جنگ بھی سیکھنے پڑے تھے اور اگر اسے لکھنے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہ ہوتی تو تب بھی اس کا کوئی نقصان نہ تھا مغرب کے کورو پنچالوں کے ہاں سیناپتی کو پروہت پر فوقیت حاصل تھی۔ گوتم اندر پرستھ جا کر فوج میں نوکری کر سکتا تھا۔ مگر اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ صرف ناک لکھا کریگا۔ فن کے نظریوں پر کتابیں تصنیف کرے گا۔ تصویریں اور مجسمے بنائے گا۔ شاعروں نے سماج سے ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ پر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گرو کا بڑا خیال تھا

.....وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس سے اس کے گرو کو دکھ پہنچے۔

گرو چیلے کا یہ سلسلہ صدیوں سے .. خالموں کے بادشاہ جنگ اور رشی دتا تریہ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اسی آشرم کے اُس پاس .. ایک ہزار سال قبل .. سرجو کی ایک شاخ ملینا ندی کے کنارے ایک مشہور درگاہ موجود تھی یہ کنج .. جہاں گوتم اور اس کے ساتھیوں کے جھونپڑے تھے .. یہیں دوسرے لڑکے گھوما کرتے ہونگے دوسرے لڑکے .. دوسری لڑکیاں

برہمچاریہ کی زندگی بسر کر کے لڑکیاں بھی اکثر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتیں .. رگ وید کی کئی نظمیں اور ، راہبات کے نغمے ، ہڑکیوں نے لکھے تھے .. شاعرہ اپالا کی نظمیں گوتم نے پڑھی تھیں .. لڑکیاں بھی کیسی عجیب ہستیاں ہوتی ہونگی .. گوتم کو اکثر خیال آتا

دوسرے برہمن زادوں کی مانند گوتم نیلمبر کی پڑھائی بھی پانچ سال کی عمر سے شروع کر دی گئی تھی .. اب وہ پورے چوبیس سال کا ہو چکا تھا .. اور اس نے الہیات .. تمثیل .. ادب .. بھوت و دیہ .. علم عناصر .. ریاضی .. صرف و نحو .. منطق .. فلسفہ .. اخلاقیات .. اداکاری .. کیمیا .. طبوعات .. نصاب کے بھی علوم پڑھائے گئے تھے .. فن سپہ گری کے علاوہ وہ راگ و دیا کا بھی ماہر تھا .. اتر پردیش کے رہنے والے اہل زبان سمجھے جاتے تھے .. گوتم کو بھی زبان کی صحت کا بہت خیال رہتا

برسوں سے اس کی زندگی اسی دھڑے پر چل رہی تھی .. وہ ماں باپ سے الگ آشرم میں رہتا .. گرو کے جاگنے سے قبل طلوع آفتاب کے وقت اٹھ بیٹھتا .. ندی پر جا کے نہانے کے بعد .. جنگل کے خاموش ترین حصے میں بیٹھ کر عبادت کرتا

..دورختوں کے مقدس کنجوں سے ..جود بیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے معنون تھے اس سے سریلے بھجوں کی آوازیں بلند ہوتیں ..عبادت کے بعد گوتم آبادی میں جا کر دن بھر کی خوراک کے لیے بھیک حاصل کرتا ..پھر لکڑیاں چن کر ایتا اور روگ کی کٹی کی آگ روشن کی جاتی ..آشرم میں روزانہ چاول ابلے جاتے تھے ..اور جو کی روٹی بنتی تھی ..شراوتی میں بڑے بڑے قصاب خانے موجود تھے ..شہر کی دعوتوں میں اکثر گائے کا گوشت بھی پکتا تھا ..لیکن طالب علم کو گائے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی لہذا گوتم اور اس کے ساتھی گرو کو کھلانے کے بعد خود بھی اکیلے بیٹھ کر ساگ پات ہی کھاتے تھے

اس دلیس کے رہنے والوں کو صفائی کا جنون تھا ..آشرم میں دن میں دس بار جھاڑو بہاری کی جاتی ..پیتل کے برتن جھونپڑوں کے برآمدے میں رکھے جگر جگر کرتے ..بات بے باپیر دھوئے جاتے ..تینکا بھی فرش پر نظر نہ آتا، پھر باغ کی صفائی کی جاتی ..اس ساری مشقت، کے بعد پڑھائی ہوتی ..پڑھائی کے بعد یاد خدا برہمچاریہ کے قوانین کٹھن تھے ..گوتم کو شروع سے سکھایا گیا کہ وہ عطر پھول استعمال نہیں کر سکتا ..سرمہ لگانے ..جوتا پہننے ..بارش یا دھوپ میں چھتری لے کر چلنے کی اسے سختی سے ممانعت تھی ..دور یا پار کرنے کے لیے وہ کشتی استعمال نہیں کر سکتا تھا ..اسے بتایا گیا تھا کہ طالب علم کو دن بھر کھڑا رہنا چاہیے ..رات بیٹھ کر گز ارنی مستحسن ہے ..موٹا جھوٹا پہنا اور روکھا سوکھا کھانا اس کا وطیرہ ہے ..یڑکیوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا اس کا فرض ہے ..بے ضرورت دوڑ بھاگ نہ مچاؤ ..زبان نہایت صاف اور شستہ بولو ..ایک لفظ بھی غیر فصیح منہ سے نکلنے نہ پائے ..یڑکیوں کا

مزاق کبھی نہ اڑانا.. عیش و عشرت.. راگ رنگ سے تمہیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے
 .. شہر کے سرکاری قمار خانے میں معززین شام کو جمع ہو کر جوا کھیلتے.. گوتم جو کہ طالب
 علم کی حیثیت سے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتا تھا.. محض خواب میں ہی سکوں کے
 درشن کر سکتا تھا.. چنانچہ ایک روز اس نے خواب میں دیکھا کہ قیمتی دو شالہ اوڑھے
 گھٹنوں کے بل بیٹھا پن پہ پن داو پہ لگا رہا ہے.. اور اس کے چاروں اور عجیب
 عجیب شکلوں کے لوگ جمع ہیں.. ایسے لوگ جو کہ اس نے جاگتے میں شراوتی کے
 بازار میں بھی کبھی نہیں دیکھے تھے

لیکن گوتم اپنے گرو کا نہایت فرمانبردار اور عقیدت مند پیلا تھا اور گرو کے
 احکام کی تعمیل کرنا اس کا ایمان تھا لہذا جب کبھی وہ شراوتی کے ناچ گھریا قمار خانے
 کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزرتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کرتا
 ناچ گھر کی سیڑھیوں پر سے اکثر پاتریں گھنگھرو سنبھالے اترتی یا چڑھتی نظر
 آتیں بھی طالب علم اسی طرح گور کے تابع تھے بعض مرتبہ وہ گرو کے لیے اپنی
 جان پر کھیل جاتے بھیک مانگ کر سب سے پہلے گرو کو لا کر دیتے اور اکثر خود بھو
 کے رہ جاتے پچھلے وقتوں میں پنچالوں کے علاقے کا ایک طالب علم جو کہ تکشلا میں
 پڑھتا تھا، اپنے استاد کے کھیتوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے بند باندھنے کے
 بجائے خود پانی کی آڑھ میں لیٹ گیا تھا

طالب علم کو حکم تھا کہ وہ ذات و نسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور
 رہے، شیخی اور خود نمائی کے جذبات پر قابو پائے دماغ کا سکون اور دل کا صبر و ضبط
 حاصل کرے

ساون کی پورنماشى سے لے کر پوس کی پورنماشى تک پڑھائی ہوتی تھی، طریقہ تعلیم سوال و جواب پر مبنی تھا۔۔۔ چیلہ سوال کرتا، گرو اس کا جواب دیتا۔۔۔ پھر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر آپس میں بحث و مباحثہ کرتے، بال کی کھال نکالی جاتی اگر کبھی سیاسی ہنگاموں، جنگوں یا بیرونی حملوں کی وجہ سے پڑھائی ملتوی کرنا پڑتی یا تہواروں کی چھٹیاں مانتیں تو گوتم اکیلا ہی اپنی کئی میں بیٹھا چراغ جلائے رات رات بھر نظمیں لکھا کرتا۔۔۔ گیدڑوں کا چلانا پڑھائی کے لیے برا شگن تھا۔۔۔ مرگھٹ میں اور سرک کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا منع تھا

جاڑوں کی راتوں میں نزدیک کے جنگل میں گیدڑ چلاتے۔۔۔ بے چاروں کو سردی لگتی ہے۔۔۔ اوڑھنے کے لیے راجن سے کمرے مانگتے ہیں۔۔۔ گوتم کی ماں بچپن میں اس سے کہا کرتی تھی۔۔۔ جب وہ اپنے شاندار مکان کے ایک اندرونی کمرے میں گرم، کپڑوں میں ملفوف۔۔۔ چھپر کھاٹ پر لیٹا شیخ تنتر کے قصبے۔۔۔ چند اماؤں اور ان کی بیوی روہنی اور راہو اور کیتو کی کہانی سنتا تھا۔۔۔ چند اس کے ماموں تھے۔۔۔ سب بچوں کے ماموں تھے۔۔۔ کیونکہ ماموں کا رتبہ اس عہد میں بڑا تھا۔۔۔ وہ ماں کا بھائی تھا۔۔۔ اور ماں بے حد تکریم ہستی تھی۔۔۔ جاڑوں کی طویل راتوں میں گیدڑ چلاتے تھے۔۔۔ سارے جنگل چاندنی میں سائیں سائیں کرتا، چند اماؤں اوپر کمرے میں تیرا کرتے۔۔۔

اسے اپنی ماں یاد آ جاتی۔۔۔ پھر وہ کوشش کر کے دوبارہ صرف و نحو میں منہمک ہو جاتا

طویل چھٹیوں کے زمانے میں گوتم نیلنبر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یا تھا اپنے موقلم یا رنگوں کی کلیاں لے کر دور دور نکل جاتا۔۔۔ اسی طرح وہ ایودھیا گیا۔۔۔ ایک مرتبہ کوئمبی جا پہنچا۔۔۔ بلگدھ میں راج گیر کے کھنڈر اس نے چاندنی رات میں دیکھے اور

بہت اداس ہوا اور وہیں بیٹھ گیا... اس نے بھیم بسیار کے آخری دنوں کے متعلق ایک ناک لکھا۔ یہ ایک واقعہ تھا کہ اب اس کا دل صرف ونحو میں نہیں لگ رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ محض فن کے نظریات پر اور بہت کچھ پڑھے اور لکھے قدم قدم پر جو سوالات ذہن کو الجھاتے ہیں ان کا کوئی حل کھو جائے۔ ہری شنکر جو کہ اسے ایودھیا سے واپسی پر ملا بہت دلچسپ تھا۔ مگر اس کے معدومیت کے فلسفے سے بھی گوتم کو ڈر لگنے لگا۔۔۔ قدیم برہمنوں کا فلسفہ تھا۔ زندگی سے موسیقی سے۔ زندہ رہنے کی لگن سے بھرپور لیکن انپشندوں کی موسیقی نے زندگی کو اور گہرا کر دیا تھا۔ وہ جواب تک بڑے صبر و ضبط اور ذہنی سکون کی زندگی گزار رہا تھا اسے اب سر جو کے گھاٹ پر بیٹھی لڑکی یاد آ جاتی جس نے کیسری ساری پہن رکھی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ ایودھیا واپس جا کر اسے تلاش کرے پتا چلائے کہ وہ کون ہے کیا کرتی ہے؟۔۔۔ شنکر اس کمبخت منحوس بودھ بھکشو سے، جو کہ پل کی پل میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔۔۔

اقامتی درگاہوں میں نئے نئے نظریات کی ہوا و فوافقا چلا کرتی تھی اسی طرح انپشندوں کے مختلف فلسفے وجود میں آئے۔۔۔ ان کی شرحیں لکھی گئیں مختلف مدارس فکر قائم ہوئے۔ بدھ مت تازہ ترین ذہنی رواج تھا گوتم نیلمبر کے مدرسے میں بہت سے لڑکے اسی مسلک کے حامی ہو چکے تھے گوتم کی کنیا میں شام پڑے دوسرے طالب علم آن بیٹھتے شہر کے مصور۔ سنگ تراش؛ شاعر؛ لیکھک اور اس طرح کے دوسرے لوگ جن کا تعلق فنون لطیفہ سے تھا اور کلا جن کا پیشہ تھا گوتم کے چھوٹے سے کمرے میں محفل جمتی لپے تلے فرش پر چٹائی بچھائی جاتی۔۔۔ درمیان

میں چراغ جلتا رہتا۔ رات گئے تک مختلف موضوع زیر بحث لائے جاتے۔ ادب اور فنون کے نئے اور پرانے نظریوں پر تبادلہ خیالات ہوتا۔ سنگیت کا مظاہرہ کیا جاتا۔ سیاست کا بھی فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ گوتم کے دوستوں میں سجاو کے نیتا شاہل تھے طالب علم تھے جو کہ سیاست پر کتابیں لکھا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں سیاسی موشگافیاں کی جاتیں۔ ریاست اور عدم ریاست میں کائے فرق ہے؟ راجہ اور پراجا میں کیا تعلق ہونا چاہیے۔ یہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جائیداد ریاست کو غیر ریاست یا مہاتما بدھ کی سکھوتی سے ممتاز کرتی ہے اور سکھوتی وہ کیفیت ہے جن میں انسان کا جسم بھی اس کا اپنا نہیں اور ریاست اور ریاست کی حدود سے ماوراء ہو کر انسان یا تو جانور بن جاتی ہے یا خدا۔ ملکیت۔۔۔ یہ میرا ہے۔۔۔ کے تصور اور دھرم کے احساس سے ریاست بن جاتی ہے اور ملکیت کی اجازت راہت عطا کرتی ہے ملکیت ریاست کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ نہیں۔ لہذا سیاست کے طالب علموں نے طے کیا کہ ریاست اس کیفیت کا نام ہے جہاں دروازے کھلے چھوڑ کر سو سکتے ہوں۔ عورتیں زیور پہن کر مرد کے بغیر رکھوالی کے باہر نکل سکتی ہوں اور ملکیت۔ فرض اور سزا کی بنیاد پر ریاست قائم ہوتی ہے۔ مہا بھارت میں لکھا تھا کہ ڈنڈ یعنی سزا نہ ہو تو طاقتور کمزور

کو اس طرح کچلیں۔ جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ اور مہا بھارت کی کتاب۔۔۔ شانتی۔۔۔ میں لکھا تھا کہ انسان خطرناک حد تک حریص اور تشدد پسند ہے۔ لہذا یہ میرا ہے کا فقرہ بھلا دینا چاہیے۔ مامٹو! احساس ملکیت سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔ ظلم انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ تہذیب اسے

اخلاق سکھا دیتی ہے اور متمدن بناتی ہے۔ ریاست ڈنڈ کے ذریعے انسان کی جبلت کو ضابطے میں لاتی ہے۔ بادشاہ ڈنڈ دھر ہے۔ مگر وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ لہذا امنوں نے حکم دیا تھا۔ کہ مالک بادشاہ کو بھی ڈنڈ سزا دے سکتا ہے۔ ریاست اور سیاسی نظام انسان کے لیے ضروری ہے۔ مہا بھارت اور منو دھرموں کے نزدیک حکومت کو سخت گیر ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ انسان فطرتاً بد تھا۔ عوام کا فرض تھا کہ وہ اپنے وزن کے لحاظ سے اپنا فرض ادا کریں۔ سپاہی کو محاذ پر مرنا ہوگا۔ طالب علم شادی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کا کام انصاف کرنا ہے۔۔۔ یہ تفریق عمرانیات کی بنیاد پر کئی گئی تھی۔ چنانچہ ریاست ظہور میں آتی ہے۔ تو پر جا کے ساتھ الاموال ورنہ آئندہ کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ اگر پر جا اپنے فرائض انجام نہ دے تو ورنہ آئندہ کا خاتمہ ہے۔

سیاسیات بڑے متضاد نظر آتے تھے جو کہ گوتم نے پڑھے تھے۔ جیمینی نے کہا تھا کہ افعال اچھے اے برے انسان کے خود پیدا کردہ ہیں۔ ورنہ دنیا کے دکھوں کا سرچشمہ اگر خدا کو قرار دے دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا ظالم ہے۔ لہذا جیمینی نے ثابت کیا کہ دنیا کی اخلاقی قوت کے لیے کسی خدائی نظام کی ضرورت نہیں۔ گوتم کے بدھ سا بھی یہی کہتے تھے۔

سیاسی آزادی کا تصور ان سب کو بہت عزیز تھا۔ یہ آزاد انسانوں کا سماج تھا۔۔۔ یونان۔ مصر۔ بابل۔۔۔ نینوا۔ اور ایران کی ہم عصر تہذیبوں کے برعکس اس دلیں کا معاشی نظام غلامی کے ادارے پر مبنی نہ تھا۔ شہنشاہ بھی ابھی تک نمودار نہ ہوئے تھے۔۔۔ ایرانی کے مال قوں میں کشتریوں کی جمہوریتیں مہا بھارت کے زمانے سے بھی پہلے سے موجود تھیں۔ بادشاہ زمین کا مطلق العنان مالک نہ تھا۔ اسے الوبی درجہ بھی

حاصل نہ تھا۔ کرم کی طاقت کے ساتھ کسی خود مختاری کی گنجائش نہیں۔ کرم نے ہر شے کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ گوتم کے ایک ہم جماعت نے اپنے ایک مقالے میں لکھا: "ہندو خدا بھی پاداش اور مکافات کے قانون کو توڑ نہیں سکتا۔ اس قسم کے نظریات کی موجودگی میں مطلق العنان حکومت کا قیام ناممکن تھا۔ جمہوریتوں کے زمانے میں کوئی نے بادشاہ کو سنگھ لکھیا کی حیثیت سے مخاطب کر کے کہا تھا۔ تیرے ہاتھ میں راج آیا ہے۔ اٹھ اور اسی شان سے حکومت کر کے۔۔۔ تجھ کو عوام نے اپنا بادشاہ چنا ہے۔۔۔ انسانوں کے اندر کی طرح اپنی راہ چل۔۔۔ تو جو گویا ہے گویا۔۔۔ ورنہ۔۔۔ اٹھ اور دنیا کے گلے کی رکھوانی کر۔۔۔"

سارے ملک میں مختلف حیثیتوں کی حکومتیں موجود تھیں۔ جنوب کے راجہ بھون کہا کرتے تھے۔۔۔ شمال کے وراث اور مغرب کے سورات لیکن سامراجیہ کی داغ بیل مگدھ میں پڑنی شروع ہو چکی تھی۔۔۔ یہاں کے بادشاہ بدقوتوں سے سمرات کہا رہے تھے۔۔۔ جس ناگمیر قومیت اور شہنشاہی کے تصور کا ذکر نمیتی شاستروں میں کیا جا رہا تھا۔۔۔ اس کو قائم کرنے کے لیے کوئی ایکڑ بادشاہ جو کہ سارے ملک کا بادشاہ ہوا بھی تک پیدا نہیں ہوا تھا۔۔۔ چکروتی بادشاہ۔۔۔ جس کی مملکت کے ساتھ ساتھ کاپہیہ بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا رہے۔

اور شکیمنی نے کہا تھا۔۔۔ میں شہنشاہ ہوں اے سیلا۔۔۔ میں نے اچھائی کے رتھ کا چکر چلایا ہے۔۔۔

.....

وشنو گپتا۔۔۔ گوتم بلمبر کی کئی میں ایک شام حسب معمول محفل بھی ہوئی تھی

اکلیش نے جو کہ نیا نیا تکلشلا سے لوٹ کر آیا تھا۔ ایک نئے نام کا ذکر کیا۔ وشنو گپتا
...نہتی پر اس کے وچار بھی سننے کے قابل ہیں۔۔۔ تکلشلا میں تو اس نے اپنی ذہانت کی
دھوم مچا رکھی تھی میں نے سنا ہے کہ وہ آجکل کسم پور کے دربار میں موجود ہے

تم کالے کرتے رہتے ہو۔۔۔ گوتم نے اکلیش سے پوچھا

میں۔۔۔۔۔ میں نے ایک نئی مورتی شروع کی ہے۔ کسی روز شہر آؤ تو دکھلاؤں
تم شیلا کاروں کی منڈی میں شامل ہو گئے ہو؟ کیوں کشتریوں کا نام ڈبوتے
ہو۔۔۔ گوتم نے اسے چڑاتے ہوئے کہا

تکلشلا سے لوٹ کر بہت دن ہاتھ پرہ اتھ دھرے بیٹھا رہا۔۔۔ کوئی جنگ ہی
شروع نہیں ہوئی۔۔۔ کیا کرتا۔۔۔ اکلیش نے ہنس کر جواب دیا

جنگ۔۔۔۔۔ یوڈیشور جو کہ ایک کونے میں بیٹھا ایک ایشیائی شاعر سے زبردستی
اس کی نظم سن رہا تھا۔۔۔۔۔ کان کھڑے کر کے بولا۔ تم کو کسم پورے کی تازہ خبریں
معلوم ہیں؟

سب اپنی اپنی باتیں چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔۔۔ ڈھن نند جوال بھی
کے منہ پر بیٹھا ہے۔۔۔ وہ کہتا رہا۔ اتنی بڑی فوج کا خرچہ دیس کو اٹھانا پڑ رہا ہے۔ پھر
جو گیشور نے مڑ کر کہا۔ یہ شراوتی میں وقائع نویس تھا۔ دودھ۔ دی۔ نمک۔ کھانڈ
۔ گھاس۔ لکڑی۔ پھل۔ پھول۔ ترکاری۔ بیگار۔ ڈھور ڈنگر۔۔۔ ہر چیز میں سرکار اپنا
حصہ بٹا رہی ہے۔ تم سمجھتے ہو پر جا چپ رہے گی؟

ملک کے سیاسی حالات پر زور و شور سے گفتگو شروع ہو گئی۔۔۔ گوتم ایک طرف کو
خاموش بیٹھا سنتا رہا۔۔۔ عجیب عجیب نام لیے جا رہے تھے۔۔۔ واقعات دہرائے جا

رہے تھے۔۔۔ راکیں دی جا رہی تھیں۔۔۔ ان سب میں شامل اور سب سے الگ بیچا وہ
سنتا رہا۔۔۔ خود بھی اپنے تئیں بحث و مباحثہ میں شامل پایا۔۔۔ کبھی وہ جوش میں آ کر زور
سے بولتا کبھی ہنستا۔۔۔ کبھی کسی ساتھی سے کسی نکتے پر جھگڑا کرنے لگتا۔۔۔ لیکن ایک گوتم
نیلمبر کنیا سے باہر موجود تھا۔۔۔ جنگلوں میں گھوم رہا تھا سر جو کی لہروں کو عبور کرنے میں
مصروف تھا۔۔۔۔۔

ترائی کے نرگلوں میں گھاس پر سر رکھے لیٹا تھا۔۔۔ جبکہ یہ گوتم نیلمبر اپنے ساتھیوں
سے مگدھ کی سیاست پر تبادلہ خیالات کرنے میں منہمک رہا
مگدھ میں ان دنوں نندوں کی حکومت تھی
۔۔۔ جو خدائے دولت کبیر سے بھی زیادہ امیر تھے

مگدھ ملک کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔۔۔ ایک زمانہ تھا جب کو
شل بھی عروج پر تھا اجین کے بادشاہ مہاسین نے یہاں کی شہزادی سے شادی کی
تھی مہاکو شل اور اور پر سن جیسی ہستیاں یہاں حکومت کرتی تھیں۔۔۔ عہد غنیتی میں،،
جب ابو دھائے اس سارے دیس کی راج دھانی تھی۔۔۔ اس کے سورما شہزادے دور
دور و کن اور لنکا تک ہمیں سر کرنے کے لیے جاتے تھے۔۔۔ ابو دھیا کے شاہی خاندان
کی ایک شاخ نے شرواستی میں اپنا راج قائم کرنے کے بعد شاکیہ اور کاشی کے علا
قہ بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔۔۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب اتر کو شل کی
طاقت کی نگر جنوبی مگدھ سے ہوئی

مگدھ والے ہمیشہ سے کوئی نہ کوئی گڑ بڑ پھیلاتے آئے تھے۔۔۔ یہاں کا ایک
راجہ جراسندھ جنگ عظیم میں سری کرشن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف لڑا تھا

...اور بھیم کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا... پرستان کا ایسا شہر گری ورج اس کا پایہ تخت تھا اور وہ راجہ ایسا زور آور تھا... مہا بھارت میں لکھا تھا کہ بھوج ہنس کے اٹھارہ حکمران اس کے رعب سے اتر چپتم بھاگ گئے تھے... کری ورج کے قلعے میں سینکڑوں بادشاہ اس نے قید کر رکھے تھے جس طرح پہاڑوں کے غار میں شیر ہاتھیوں کو قید کرتے ہیں اور انہیں سری کرشن دیو کے پتر نے آکر آزاد کیا تھا... اسی جہاں سندھ کے باپ راجہ برہدرتھ نے تخت و تاج اس کے حوالے کر کے غور و فکر کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی دونوں رائیوں کے ہمراہ بن کی راہ لی تھی اور بنوں میں جا کر فلسفی ساکیانہ کا پیلا بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ رشیوں کے گھر میں راکھ شمس جنم لیں گے

مگر جنگ عظیم سے بہت پہلے اسی علاقے کی شمالی ریاست متھلا پوری کی راج داراری ایودھیا کے شہر واے سے بیاہ کر آئی تھی، کوشل دیس کی اس بہو کا نام بیتا تھا ویدوں کے عہد سے لے کر اب تک مگدھ پوری طرح سے برہمنوں کے اثر میں کبھی نہ آیا تھا... یہاں کی آبادی ہمیشہ مخلوط رہی... ان کی اونچی ذاتوں کو بھی باہر والوں نے کبھی خالص نہ سمجھا تھا... اور مگدھ کے برہمن اور کشتری بھی کوشل دیس والوں کی نظروں میں حقیر تھے کچھلی دونوں صدیوں میں شیش ناگ خاندان کی مگدھ پر حکومت رہی... اس خاندان کے بادشاہ بھیم ہمارے عہد میں شہزادہ مہاویر اور شہزادہ سدھارتھ نے اپنے فلسفوں کا پرچہ کیا تھا

زندگی کی ندی پر پل بنانے والا چوبیسواں مہاویر جو ویشالی کے کند گرام میں پیدا ہوا... انہما کی تلقین کرتا سارے دیس میں گھوما... اور پھر دو رنگا کے جنگلوں کی

طرف نکل گیا۔۔۔ کپڑے ہستی کے لمبائی گرام میں پیدا ہونے والا سدھارتھ جو کہ گری ورج کی سبز پھاڑیوں پر چلا۔ زرخیز ندی میں نہایا۔۔۔ پیپل کے درخت کے سائے میں جسے گیان حاصل ہوا۔ شراوتی اور کاشی کے باغوں میں۔۔ جہاں ہرن کلیاں بھرتے تھے۔۔ اس نے وعظ کہے اور جو کوئی نگر میں مرا۔۔

بھیم بسپار کے زمانے میں یہ دونوں آئے تھے۔ اس کی راجدھانی کا نام گری ورج تھا۔ اس کے چاروں اور سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ اور خوبصورت دریا اور اس کی سرزمین شاداب تھی اور سونا بھاگرا نے والی سون ندی اس میں بہتی تھی

کوشلا دیوی... شروعاتی کی شہزادی... مہاراجہ پر سین جیت کی بہن... بھیم بسیار کی ملکہ نے گری ورج کے اتار میں راج گیر آباد کیا لیکن اس کے بیٹے اجات سترو نے اپنے لپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا... اور کوہ سنگھاسن پر جا بیٹھا... رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رو رو کر جان دے دی... تب شروعاتی کے پرسن جیت نے گرج گرج کر کہا... میری لاڈلی بہن مرنے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی... اتر کی جمہوریتیں کاشی کوشل کی ساتھی بنیں... اور کوسی نگر اور ویشانی اور شروعاتی مگدھ کے مقابلے میں صف آراء ہوئے

تب مگدھ کے وزراء نے ویشالی والوں کے حملوں کو روکنے کی خاطر پائلی گرام کی چھوٹی سی بستی کے چاروں اور ایک فکیل بنائی

مگر اجات سترو جیتا اور اپنے ماموں راجہ پرسن جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا .. اس کے پوتے اودے نے کسم پور آباد کیا پاٹلی گرام ... پشپ پور، پاٹلی پتر .. پھولوں کا شہر۔۔۔ یروں کا شہر ... ملک کا سب سے عظیم الشان دارالسلطنت ... جہاں

سون ندی کے کنارے کنارے دلش ماریوں کے نفرتی بحرے تیرا کرتے تھے۔۔
جہاں پائلی کی کلیاں بالوں میں سنوارے سنہری آنکھوں والی سورنا کشتی لڑکیاں مر
مریں چبوتروں پر قرض کرتیں

اور گوتم سدھارتھ نے پیش گوئی کی تھی کہا یک وقت آنے والا ہے۔۔۔ جب یہ
شہر آگ اور سیلاب اور جنگ کی نذر ہوگا۔۔۔ اودے اس شہر کا بانی ایران کے شہر
دار یوش اول کا ہم عصر تھا جس نے یونان پر قبضہ کیا

گوتم نبلمبر کو ایران سے بہت دلچسپی تھی اکلش اور جو دوسرے طالب علم تلمشا
سے واپس آتے، گوتم ان سے کرید کرید کر اس انوکھے ملک کے متعلق پوچھتا
۔۔۔ پارسیکاؤں کے شہنشاہ جو کہ بہت زبردست اور مطلق العنان تھے۔۔۔ ان کی
راج نمیتی کے اصول جانے کیا ہونگے ان کے مذہب

میں اگنی کی پرستش مقدم تھی وہ ویدوں کے سارے خداؤں کو پوجتے تھے۔۔۔ یو
و کے علاوہ جسے وہ واہیو کہتے تھے۔۔۔ وہ سورج دیوتا مترا کو مانتے تھے۔۔۔ ان کی زبان
سنسکرت کی بہن تھی۔۔۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خود بھی آریا تھے۔

مگر دوسرے ملکوں پر وہ حملہ کیوں کرتے ہیں؟۔۔ گوتم نے اداسی کے ساتھ کہا
۔۔۔ انسانوں کیا ایک جماعت کو دوسری جماعت پر قابض نہ ہونا چاہیے۔۔۔ کسی ایک قوم
کا دوسری قوم کو خیر کرنا۔۔۔ کسی ایک تہذیب کا دوسری تہذیب کی جج کئی کرنا غلط ہے
۔۔۔ اخلاقی گناہ ہے۔۔۔ سائیت کے نظریے کی بات مت کرو کہ ایک مچھلی دوسری مچھلی
کو کھاتی ہے

ایرانیوں نے جب گندھارا دیس پر حملہ کیا تو وہاں کے راجہ نے بھیم بسیار کے

پاس اپنا سفیر بھیجا تھا بخانشی شہنشاہیت نے سپت سندھو کے اتر چھبھی علاقوں کو اپنا
بانج گزار بنائے رکھا۔ سب سے زیادہ چاندی یہیں سیایارنی خزانے میں داخل کی
جاتی تھی

ایرانی سلطنت بہت زبردست تھی۔۔۔ اتنی زبردست کے ایک لمحے کے لیے بھی
اسے احاطہ تصور میں نہ لایا جاسکتا تھا۔۔۔ اس سامراج میں مصر اور بابل اور شام اور
ایشیائے کوچک اور یونان کے شہر اور جزیرے اور سپت سندھو کے اتر اچھ صوبے
کبھی شامل تھے اور سر یوش کے بعد دارا نے کہا تھا۔۔۔ میں دارا یوش ہوں۔۔۔ شہنشاہ۔۔۔ شا
ہوں کا شاہ۔۔۔ ملکوں کا بادشاہ۔۔۔ جن میں بھانت بھانت کے انسان بستے ہیں۔۔۔ اس
وسیع و عریض زمین کا حاکم۔۔۔ لٹشاپ اک بیٹا۔۔۔ ایرانی۔۔۔ ایرانی کا بیٹا۔۔۔ آریہ۔۔۔
آریہ گھرانے کا فرزند۔۔۔ اور اس کے جہازوں کے بیڑے مقدس سندھو کی لہروں پر
تیرتے تھے۔۔۔

اور دارا یوش اول کے بیٹے ارتخشیر نے اتر اچھ کی ان مقبوضات کے متعلق
فخر یہ اعلان کیا تھا۔۔۔۔۔ یہ علاقے جہاں دیو پوجے جاتے تھے۔۔۔ اہور مزہ کی خواہش
کے مطابق میں نے ان م دیوں کے مندروں کی بنیادیں ہلادیں۔۔۔
سوس کی کیا خبریں ہیں۔۔۔ تم تو وہاں آئے ہو۔۔۔ وقائع نویس نے اکلش کو
مخاطب کیا تاھ

پچھلے دنوں کچھ تاجر پری سی پولیس سے جان بچا کر تکلشد آئے تھے وہ کہتے
تھے کہ ایران میں بہت زبردست لڑائی چھڑی ہے
کہیں اور جنگ چھڑ گئی ہے۔۔۔؟۔۔۔ و ملیشور نے دوسرے کو نے سے سراٹھا کر

سوال کیا

یونوں نے جب سے ایران کی غلامی سے چھٹا کارہ پایا ہے... ایرانی سلطنت کمزور ہوتی جا رہی ہے... تمہیں ایک بات بتا دوں... کلش نے گوتم کو مخاطب کر کے کہا... وشنو گپتا مجھ سے کہتا تھا کہ ہمارے دیش کو بھی ایک چترانت ریاست کی ضرورت ہے... جس کی دنیا کے چاروں کھونٹ تک وسعت ہو... مضبوط سامراجیہ مجھے مضبوط سامراجیہ نہیں چاہیے... گوتم نے کہا..

ایرانیوں کی سلطنت ان کے شاہی خاندان کی پھوٹ نے ختم کی... کلش اطمینان سے کہتا رہا... پچھلے دنوں اروشیر سوم قتل ہوا... پھر اس کے بیٹے کو زہر دے دیا گیا... ان کے یہاں اتنی خون کی ندیاں بھی ہیں کہ اس کے بعد تخت پر بٹھانے کے لیے انہیں کوئی بھائی بھتیجا زندہ نہ ملا... اور وہ ایک دور کے عزیز دار کو پکڑا لائے... پرسی پولیس کے اتھر کہتے تھے کہ دارا ایش سوم بہت بہادر بادشاہ ہے... لیکن اس غریب کو یونوں کے سیناچی سکندر نے شکست دی جو کہ دور پچھتم سے بڑی بھاری فوج لے کر آیا تھا

گوتم سنتا رہا... بھاری فوجیں... خون کی ندیاں... شکست... فتح... کلش کتنے مزے سے یہ خوفناک واقعات بیان کر رہا تھا

اور اب سارا یاران سکندر کے ہاتھ میں ہے... کلش نے بات ختم کی یعنی پارسیکاؤں کی چترانت ریاست کا مالک... اب جس کا تم نے نام لیا ہے... سکندر ہے....

گوتم نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ پوچھا... ہاں... وہی ہے... کلش نے

یکلخت ذرا ہچکچا کر جواب دیا۔ وہ گوتم کے تبسم کے معنی سمجھ گیا تھا.....

بھائی اکلش تم کھشتری ہو۔ حکومتیں قائم کرنا اور حکومتیں اکھاڑ کر پھینک دینا تمہارا کام ہے۔ میں تمہیں کیا سمجھا سکتا ہوں۔ گوتم نے کچھ دیر کے بعد آہستہ سے کہا.....

گوتم اکلش نے چراغ میں تیل ڈال کر اسے پھر وسط میں رکھ دیا۔ اور گوتم کو غور سے دیکھنے لگا تم کو اگر کسی جنگ میں شامل ہونا پڑے تو کیا تم لڑنے سے انکار کرو گے؟

گوتم اکلش کے اس سوال سے لڑکھڑا گیا۔ یہ سوال وہ مدتوں سے اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایسے لوگوں کی جگہ ہے جو کہ بغیر لڑے زندہ رہنا چاہتے ہوں۔؟ اسے جو نون جنگ سکھائے گئے ہیں کیا وہ استعمال کرے گا.....؟

تم سمجھتے ہو کہ پر جا چپ رہے گی۔ کئی کے دوسرے کو نے میں بیٹھا ہوا جو گیش ویشور سے کہہ رہا تھا.....

ہرگز نہیں۔ دوسرے نے جوش سے جواب دیا۔ کوئی دن جاتا ہے۔ کوئی دن..... دیکھ لینا

گوتم ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو کہ مگدھ کے سیاسی حالات پر زور شور سے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے.....

اجات سترو کے پوتے کے بعد مہاپدم نند پائلی پتر کے تحت پر قابض ہوا۔ اس کی ماں شودر تھی اور اس کا باپ نانی۔ یہ مہاپدم پتی نند تھا..... بے حد و حساب دولت کا مالک۔ اور اگر سین تھا۔ زبردست فوجوں کا سپہ سالار۔ اس کے

بعد اس کے آٹھ بیٹے بارہ سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اسی لیے یہ خاندان نونند کہا گیا... اس کا آٹھواں بیٹا دھن نند تھا... جس کے خزانے ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے چٹے پڑے تھے... اور جس کے لشکر میں بیس ہزار سوار، دو لاکھ پیادے، دو ہزار جنگی رتھ اور تین ہزار ہاتھی تھے... اور جو محصول بڑھائے جا رہا تھا... اور جس کی پر جا بے چین تھی

سارے دلش میں برہمنوں اور کشتریوں کا راج تھا... سندھ کی وادی میں برہمنوں کی حکومت تھی... لیکن مگدھ میں مہاپدم پتی نند کے عہد سے کھشتریوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کے آغاز سے ہوا تھا

شر اوپتی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے... برہمنوں کا احساس برتری... آریاؤں کے اس دور کی یادگار تھا... جب انہیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی... اس زمانے میں روما کا ہم عصر سماج اور فرانس کا کینٹلک معاشرہ کاہنوں... جنگجو سپاہیوں اور عام کاریگروں کے فرقے میں بنا ہوا تھا... اور اس احساس برتری کا برہمنوں کے پاس اب بہر حال کوئی مانع نہ تھا...

اور گوطالب علم کا فرض تھا... کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے... لیکن گوتم اور اس کے جمہوریت پسند ساتھی شودروں کو بہر حال برداشت نہ کر سکتے تھے...

پاٹلی پتر کا دھن نند جو الاکھی کے وہانے پر بیٹھا تھا

.....۵

ایک روز طالب علموں کی ایک ٹولی کے ساتھ ہری شنکر بھی آشرم میں آن موجود

ہوا۔۔۔ گوتم جو اس سے اپنی کٹی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک تصویر بنا رہا تھا۔۔۔ اسے
دروزاے میں کھڑا دیکھ کر بھونچا رہ گیا۔۔۔

میں اندر آ جاؤں۔۔۔ وہلیز پر پہنچ کر شکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا
آؤ آؤ۔۔۔۔۔ کیسے آنا ہوا۔۔۔۔۔ گوتم نے گلہری کی دم کا مو قلم اور رنگوں کی کلیاں اور
سفید چین پٹہ ایک طرف کو میٹے ہوئے کہا

ہری شکر آتے کے ساتھ ہی چین پٹے کو گور سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا
گوتم نے جلدی سے فرش پر دوبارہ جھاڑو پھیر کر چٹائی بچھائی۔۔۔۔۔ بھونچ پتر۔۔۔
ریشم اور تانبے کی تختیوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو جو انبار چاروں طرف بکھرا پڑا تھا
اسے سمیٹ کر ایک کونے میں رکھا۔۔۔ دوسرے کونے میں گنتی کے چند برتن اور ندھے
سیدھے پڑے تھے۔۔۔ کھڑکی کے نزدیک اس کا کھل بچھا تھا۔۔۔ جس پر وہ رات کو سوتا
تھا۔۔۔ اس کا کشول چھپر کے ایک بانس میں لٹکا تھا کتیا میں اس وقت خاصی بے تر
تھی تھی۔۔۔ گوتم کو بڑی ندامت محسوس ہوئی۔۔۔ وہ ہری شکر کی سحر انگیز اور پرسکون
شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا۔۔۔ جانے یہ مجھے کیسا بے ڈھنگا لڑکا سمجھے گا۔۔۔ اس نے

پریشان ہو کر سوچا۔۔۔ پھر سرعت سے مہمان نوازی میں جت گیا
اس نے ٹھنڈے پانی کی گڈوی ہری شکر کے س سامنے رکھی۔۔۔ پھر برآمدے
میں جا کر چوہا روشن کے اور چاول ایلنے کے لیے چڑھا دیے۔۔۔

ہری شکر منہم انداز میں اپنے میزبان کی یہ ساری تیاریاں دیکھ رہا تھا گوشت
کے بغیر مہمان نوازی مکمل نہ ہو سکتی تھی۔۔۔ اسی بڑا بڑا ہٹ میں وہ چادر کو کندھے پر ڈا
ل کر باہر جانے کے لیے اٹھا

کہاں جاتے ہو...؟ شکر نے چونک کر دریافت کیا

ہستی سے ماس مانگ لاؤں... ابھی آیا

ماس..... ہری شکر کے خوبصورت چہرے پر کرب کی ابر دوڑ گئی

ارے... گوتم دفعتاً خاموش ہو گیا۔ اسے اور زیادہ خفت محسوس ہوئی۔ اسے اپنی بے وقوفی پر سخت غصہ آیا۔ وہ جانتا ہے کہ ہری شکر بھکشا ہے۔ اور اہنسا کے اس نئے اصول کا قائل... پھر اسے شکر کو ماس کھلانے کا خیال کیسے آیا کیونکہ وہ خود مدتوں سے ماس کھانے کے لیے بے چین ہے۔ لیکن بر مچاریہ کے قوانین کو توڑ نہیں سکتا۔ اور یہ انوکھا بے ٹکا بھکشا اسے بے حد عزیز ہے اور اپنی عزیز ہستی کو اپنی پسندیدہ شے ہی پیش کر کے دل کو سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس طور پر اپنی حماقت کا تجزیہ کر کے اسے ذرا اطمینان حاصل ہوا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ ایک اور پسندیدہ شے ہے جو کہ وہ سوجو کے پاس چھوڑ آیا ہے۔ غالباً وہ دونوں چھوڑ آئے ہیں۔ اور اس، ہری شکر جانتا ہے۔ اور حسد کا جزبہ اس کے دل میں اٹھا۔ اور اس کے چہرے پر سے ایک بادل سا گزر گیا۔

پھر وہ ہری شکر سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ اتنے دنوں تک کہاں رہا؟ کہاں کہاں گیا؟ کیا کیا سوچا۔ کیونکہ سوچنا ہی ان لوگوں کا خاص مشغلہ تھا اس کے بعد اس نے شکر کے سامنے سے اس کے جھوٹے برتن اٹھائے تم میری اتنی عزت کیوں کرتے ہو۔ شکر نے پوچھا۔

پتا نہیں۔ کیونکہ اگر دیکھا جائے تو میں خود کافی عزت کے قابل ہوں۔ اس نے ہنس کر جواب دیا

برہمن ایک بات بتلاؤ

ہوں

خواہشیں تم کو بہت ستاتی ہیں

یعنی

مثلاً... یہی ماس کی خواہش

پتا نہیں...

تم نے کبھی قربانی کے فلسفے پر غور کیا ہے؟

آج کل میں اسی پر غور کر رہا ہوں... مگر کس طرح کی قربانی... جان کی

... یا روح کی...؟ جو بھی شے تمہارے تصرف میں آئے گی... وہ گویا اپنے وجود کی

قربانی تمہیں دے گی

میں سمجھا نہیں

تم خوب سمجھتے ہو

میں کیا کر سکتا ہوں اگر... گو تم نے گھبرا کر بات کو مائلنا چاہا... اگر میرے پس منظر

میں خون ہے... میرے چاروں طرف خون ہے... میں اتنے سارے خون کا کنارہ

کس طرح ادا کروں گا؟

ہری شکر خاموش رہا... پھر وہ دونوں کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے

باہر سبزہ زاروں میں کسانوں کے بیلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں... اور

چرواہوں کی بانسریوں کی آوازیں آرہی تھیں... شکاریوں کے بالوں میں بچے ہو

ئے پر ہوا میں لہراتے تھے... ہندی کے اس پار کھشتری امیر زادے اپنے باغوں میں

تیر اندازی سیکھنے میں مصروف تھے

زندگی جاری تھی

مجھے زندگی کے متعلق کچھ بتاؤ

تمہاری زندگی تمہاری اپنی ہے... میری زندگی سے علیحدہ ہے... میں تم کو کچھ
نہیں بتا سکتا

گوتم نے دھیرے سے کونے میں جا کر تار کا ایک صاف پتہ اٹھایا... مجھ سے
اس کے متعلق باتیں کرو... میں لکھوں گا... وہ... اس نے قلم نکالا اور فرش پر آلتی پالتی
مر کر بیٹھ گیا... میں اپنی کتاب کا دوسرا باب لکھوں گا
لیکن تمہاری کتاب کا آخری باب کون لکھے گا...

سارے میں تاریخ کا انتخاب سمندر ہے... جس میں ہم اور تم پتوں کی طرح ڈول
رہے ہیں... مجھ سے پہلے اب تک جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے یا نہیں
...؟ بتاؤ میں کیا لکھوں... گوتم نے پوچھا

وقت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں... سب خواب کی طرح گزر رہا ہے
... گزر جائے گا... ہری شکر نے جواب دیا
گزر جائے گا یا گزرتا رہے گا...؟ گوتم نے پوچھا

یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے....

مجھے اہنسا کے متعلق بتاؤ

برہمن ہو کر اہنسا کے قائل ہونا چاہتے ہو... ہری شکر نے ہنس کر پوچھا
گوتم بھی ہنسا... ہاں بڑی عجیب بات ہے ہے ناں؟ اس نے نظریں اٹھا کر

شکر کو دیکھا

جانوروں کو مارنا ہزاروں برسوں سے برہمنوں کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ جب یہ آریہ مشرقی یورپ اور وسط ایشیا کی چراگاہوں میں گھومتے تھے۔ تب زندہ رہنے کے لیے اور گرم رہنے کے لیے درندوں کا شکار ان کے لیے ضروری تھا۔ اسی وجہ سے انکا اور جمنا کے اندر ویدی علاقے میں آن کر بسنے کے بعد بھی ان کی معرفت اور ان کے فلسفے کے ارتقاء میں جانوروں کے خون بہانے کا بڑا دخل رہا ہے۔ ان کی کوئی عبادت قربانی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ سام ویدوں کے اصولوں کے مطابق قرابن گاہ ایک زبردست رمزیت کی حامل تھی۔ خود تخلیق کائنات مابعد الطبیعیات کے نقطہ نظر سے ایک عظیم آفاقی قربانی تھی۔ اور کائنات کی کائیت اور اس کے بقاء کی علامت تصور کی جاتی تھی۔ چکروتی راجہ کے لیے گھوڑے کی قربانی لازمی تھی

کھیتوں کے اس پار الاوروشن کیے جا رہے تھے۔ بہت دور گاؤں کے سرے پر چوپال میں محفل جمی تھی۔ بھاٹ جنگ عظیم کی داستان سنا رہا تھا۔ شام کے مکمل سنائے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ اس کی پاٹ دار آواز کی لہر تیرتی ہوئی گوتم کی کئی سے آنکرائی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

لیکن گوتم کا دل دھڑکتا رہا

یہ سنائے مجھے طرح طرح کی داستانیں سناتے ہیں۔ الفاظ کے خاتمے میں بھی میری نجات نہیں۔ گوتم نے اپنے آپ سے کہا اور ہری شکر کو دیکھتا رہا۔

قربانی کا تصور۔ لڑائی کا فلسفہ۔ جنگ اور امن کا مسئلہ۔ یہاں برہمن تلوار

لیے گھومتے تھے.... اور کھشتری فلسفی بن جاتے تھے... ورن اور جاتی کی تفریق
 ابھی شدید نہیں تھی... مبنی شاستر... ویدوں اور اتھاس پرانوں کی تعلیم برہمن اور
 کھشتری دونوں کے لیے لازمی تھی... ویدوں کے عہد میں پتھی کرت اگنی
 ... راستے تیار کرنے والی مقدس آتش... کی عبادت گھنے جنگلوں میں پگڈنڈیاں
 بناتی مشرق تک پہنچ چکی تھی... پورب میں گوتم نیلمر کے سفید نام ہم قوموں نے
 ناگاوں کو اپنی مہزب کے دامن میں سمیٹا... پچھتم میں سندھو کے کنارے بسے ہو
 ئے شہروں پر اندر کا قہر ٹوٹا... ہری یوپیا کا نگر میدان کارزار میں تبدیل ہو گیا
 ... جہاں نادر کے زرہ بکتر میں ملبوس... سپاہی لڑے اور فتح یاب ہوئے... سندھو کا
 شہر... جہاں کہنیوں تک کپڑے پہنے ہوئے... ماتھے پر تلک لگائے ہوئے... گئے
 میں سیاہ پوتھ پہنے... کندن کے رنگوں والی سہاگنیں... شیو... درگاہ... دیپ... کاشمی
 اور پٹیل کی دیوی کی آرتی اتارتیں یہ لوہ جنہوں نے اپنے تمدن کو راجھستان
 ... سوراشٹر اور پچھمی اتر پر دلش تک پھیلا یا تھا... ایک روز شمال مغرب کے اونچے
 پہاڑوں کے اس پار... کسی انجانے دلش سے گویا اندر مہاراج کا سب رفتار جنگلی
 رتھ آیا... اور ان سب کو روندتا ہوا آگے نکل گیا

برہم ورت پہنچ کر یہ سنہری رتھ رک گئے... اور ان لوگوں نے اندر پرستھ آباد
 کیا... اور حمدیں لکھیں اور موسیقی تیار کی

اب مہزب کے مرکز اندر پرستھ اور یادو خاندان کی راجدھانی سے جٹ کر
 مشرق تک آچکے تھے... یہ ایودھیا اور شر و اسق اور اجینی کے عروج کا زمانہ تھا
 ... مگدھ اور اتر کوشل کے انتہائی مہزب باشندے اب شمال مغرب اور سرسوتی کے

اس پار رہنے والوں کو نیم وحشی اور جاہل گردانتے تھے
گوتم نلیمبر کی تاریخ عظیم ناموں سے پر تھی۔ ان میں سے بہت سے نام اب
روایت اور اسرار کے دھندلکے میں جا چھپے تھے۔ جس طرح ہماوت کی اونچی
پیٹریوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے۔۔۔

گوتم کو ماضی سے ڈر لگتا تھا۔ کیا ضرورت تھی۔۔۔ کیا وجہ تھی کہ ان سب کا یہ
تسلل قائم تھا۔ جاری و ساری۔۔۔ اور کب تک ایسا رہے گا۔۔۔ ڈگ و بے شری رام
چندر کے عہد سے دواپار شروع ہوا تھا۔ جس کا اختتام جنگ عظیم پر ہوا۔ مہا بھارت
کے بعد۔۔۔ سری کرشن کے عالم موجودات سے روپوش ہونے کے ساتھ ہی کالی
یگ شروع ہو گیا۔۔۔ جو کہ اب تک باقی تھا
اس کالی یگ میں کیا ہوگا؟

پرانوں کی داستانیں اس نے پڑھ رکھی تھیں۔۔۔ جن میں کائنات کی مادے سے
تخلیق کا بیان تھا۔۔۔ اور خداؤں اور فلسفیوں کے قصے اور شاہی خاندان کے نسب
نامے۔۔۔ پر اکرت کی تاریخوں پر ان قصوں کی بنیاد تھی۔۔۔ جو کہ صدیوں سے
درباروں اور چوپالوں میں داستان گو سناتے آرہے تھے۔۔۔ ان پرانوں میں چا
لیس چالیس ہزار اشعار ہوتے تھے۔۔۔ جو دشنو اور شیو کی حمد کے ساتھ شروع کیے
جاتے تھے۔۔۔ پرانوں کے مطابق ارجن کے پوتے کے وقت سے لے کر جس کے
دربار میں پہلی بار جنگ نامہ مہا بھارت سنایا گیا تھا۔ مہاپدم نند کے عہد تک ایک
ہزار سال کا وقفہ گزر گیا تھا۔۔۔ ارجن سے لے کر اودے تک چوبیس پشتیں گزر چکی
تھیں۔۔۔ اودے کے دور حکومت میں شاکیہ منی پیدا ہوئے

گوتم نیلمر نے نظریں اٹھا کر شکر کو دیکھا جو کہ بڑی دلچسپی کے ساتھ بیتل کی ایک تنہائی پر ہنسنے میں مصروف تھا۔ کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول غروب آفتاب کی روشنی میں قرمزی نظر آ رہے تھے۔ گوتم کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی

اس کا فیصلہ کرنے والا کون ہوگا؟ کہ کون کس سے برتر ہے۔۔۔ کس نے کس پر فتح پائی۔۔۔ کون کورو ہے کون پاٹو؟

جنگ عظیم آج سے سینکڑوں برس قبل کورو کی شہر میں لڑی گئی تھی۔۔۔ اور ہسٹنا پور کے ان بہادروں کے قصے۔۔۔ جنہوں نے درو پدی سے بیاہ رچانے کے بعد اندر پرستہ کا ایسا خوبصورت شہر آباد کیا تھا۔۔۔ گانے والے وینا اور مردنگ بجا بجا کر گاؤں گاؤں سناتے پھرتے تھے سوراہوں کا تذکرہ رک وید اور قدیم ترین برہمن ادب میں موجود تھا جس میں ہر چیز اصل سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔۔۔ بادلوں کی گرج۔۔۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔۔۔ عظیم معرکے۔۔۔ دلا اور سورما۔۔۔ نوارنی رشی۔۔۔ آسمانی سنگیت۔۔۔ پری وں لڑکیاں۔۔۔ شکتلا۔۔۔ مہنستی۔۔۔ کاشی کے راجہ کی بیٹی امبا۔۔۔ یہ سب طلسماتی ہستیاں ڈیڑھ دو ہزار برس قبل زندہ رہی ہوں گی۔ انہی جگہوں پر چلتی پھرتی ہوں گی۔۔۔ یہ سب سوچ کر گوتم کو بڑا عجیب سا لگتا۔ کہ ایک وقت تھا کہ نرہ اور تاپتی کے درمیان راجہ نل کی حکمرانی تھی۔۔۔ مہنستی براہ کی راج مای تھی۔۔۔ سینتا مہارانی کے بابا کا ملک اسی گنگا کے اتر میں گندک ندی کے کنارے آباد تھا۔۔۔ پل کی پل میں وہ سارا زمانہ داستان میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ وقت جس میں وہ زندہ تھا وہ خود گوتم نیلمر برہمن۔۔۔ ہری شکر بھکشو۔۔۔ جو کہ کھڑکی کے پاس بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا۔ اور ایودھیا کی چمپک اور باہر آشرم کے کنج میں ٹہلتے ہوئے طالب علم۔۔۔ یہ سب کے سب ایک آن میں ما

ضی کے دھندلے... ناقابل یقین... غیر حقیقی کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیں گے
.. جن کی کائنات کے.. وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں کوئی حیثیت نہیں ہوگی
.. جہیم.. دریودھمن.. کرشن.. ارجن..

اگر کسی وقت مجھے جنگ میں شامل ہونا پڑ گیا تو کیا میں لڑوں گا؟.. اس نے
چوروں کی طرح ہری شکر کو دیکھا.. اکلش کہہ رہا تھا کہ جنگ کوئی دن جاتا ہے کہ
چھڑ جائے گی.. تم لڑو گے؟.. اس نے یکلاخت آواز بلند سوال کیا..
ہم شخص اپنے خیالات کا نتیجہ ہیں.. ہری شکر نے جواب دیا
لیکن کیا تم لڑو گے؟ گوتم نے ضد سے دہرایا

ہر انسان سے اس کے افعال.. ضرورت یا حادثے یا اس کی فطرت کی وجہ سے
سرزد ہو جاتے ہیں.. وہ خود مختار نہیں ہے ذمہ داری کی کوئی اہمیت نہیں.. ہری شکر
تختیاں ایک طرف رکھ کر کھڑکی کے نزدیک چلا گیا
دفعتاً دریا پر بہت سی روشنیاں جھلک اٹھیں..
کسی کی بارات جاری ہے.. گوتم نے اظہار خیال کیا....
ہوں....

یا ممکن ہے شاہی بجرے نے ادھر کا رخ کیا ہو..
چلو باہر چلیں.. اندھیرے میں میرا دم گھبراتا ہے.. ہری شکر نے بیک وقت
وحشت زدہ ہو کر کہا

وہ دونوں آشرم کے باغ سے نکل کر گاؤں کے راستے پر آ گئے.. بارشوں کا
زمانہ... ختم ہو چکا تھا.. فضا میں ہلکی سی نکلی آگئی تھی چوپال کی طرف سے بھاٹ کے

گانے کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھی

گوتم خاموشی سے شکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر ٹھٹک کر اس نے اداسی سے کہا تم خود پرست ہو ہری شکر۔ تم کو دوسروں کی پروا نہیں۔ اپنے ذہن کے بل پر اپنے آپ کو ارہت کے درجے پر پہنچا دینا کوئی بڑی بات ہے۔ تم کو اس سے کیا غرض کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے

مجھ کو خوب معلوم ہے کہ دوسروں پر کیا بیت سکتی ہے۔ ہری شکر نے مختصر جواب دیا۔ آواہر چل کر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے؟

گوتم چپ ہو گیا۔ وہ دونوں چوپال کی طرف بڑھنے لگے
تم بھیشم کا قصہ سنو گے۔ مجھے کے قریب پہنچ کر گوتم نے غیر یقینی سے انداز میں اپنے اس تھی سے پوچھا

کیا حرج ہے اسے جواب ملا

ان دونوں کے برہمچاری لباس دیکھ کر سامعین نے فوراً تعجب مان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ بھاٹ لہک لہک کر قصہ سنایا گیا۔ گوتم نے اسے پہچان لیا۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے مسکرا کر اسے پر نام کیا اور خود بھی قصی سننے میں مصروف ہو گیا۔ یہ لوگ صدیوں سے اسی طرح گاتے بجاتے اور ان داستانوں پر سر دھنتے چلے آ رہے تھے۔ رگ وید کے زمانے سے اندرا اور دوسرے خداؤں کی تقدیس کے لہن الاپے جاتے تھے بادشاہوں کے اشومیدھ [گھوڑے کی قربانی] منعقد کروانے والے فرمانرواؤں کے قصے پڑھے جاتے تھے۔ اس نے ایسے ایسے دان دیے۔ ایسی ایسی لڑائیاں لڑیں۔ ایسی ایسی فتوحات حاصل کیں اور کاہن ہوترا

سے کہتا... قہصے کا آغاز کرو۔ قربانی کرنے والے کو دوسرے انسانوں سے اوپر اٹھا
و۔۔۔ شام پڑے برطانوی اتر مند راگ کی دھن میں رمزیہ گیت چھیڑتے

عہدِ شہتق میں ارجن۔۔۔ واسو دیو اور دوسرے بہادروں کے دربار میں اسی طرح
وینا۔۔۔ مردنگ اور شکھ کی سنگیت میں یہ نغمے الاپے گئے تھے
سر مسلسل ہے۔۔۔

پرانے زمانے میں درباری بھاٹ کھشتری ہوتا تھا۔۔۔ بعد میں درباری شاعری
نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا۔۔۔ اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر ختم
ہو رہی تھیں۔۔۔ اور شاعر جو کہ پہلے درباروں سے وابستہ تھے۔۔۔ اب گلی گلی اور گاؤں
گاؤں گھوم کر اپنی روزی ماتے تھے۔۔۔ رنجی اور باضا بھٹ مزہب کی جڑیں مضبوط ہوتی
جاری تھیں۔۔۔ خالص رزمیہ شاعری میں مزہبی عنصر شامل ہو رہا تھا۔۔۔ پڑھتوں نے
مہا بھارت کے جنگ نامے کو اخلاقیات کے درس میں تبدیل کر دیا تھا۔۔۔ کھشتری
بھاٹ کی جگہ برہمن داستان گو نے حاصل کر لی تھی۔۔۔ تاریخ رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتی
جاری تھی۔۔۔ تاریخ کے کردار فلسفیانہ اور مذہبی لبادہ اوڑھ چکے تھے

اب داستان گو کاشی کے راجہ کی بیٹی تینوں بیٹیوں کی کہانیاں سن رہا تھا۔۔۔ جن کو
بھیشم میں ان کے سو بھرتوں کے وقت لے اڑے تھے۔۔۔ کچھ دیر کے بعد ارجن کا قصہ
شروع ہوا۔ گوتم اب ذرا آرام سے ایک ستون کا سہارا لے کر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ ہری شکر
ماحول سے بے نیاز دوسری سیڑھی پر بیٹھا رہا۔۔۔

یہ ارجن بھی خوب شے تھے۔۔۔ گوتم نے سوچا۔۔۔ سب سے پہلے انہوں نے درپردی
سے بیاہ رچایا۔۔۔ جب بارہ برس کی بن باس انہیں ملی تو وہ سری کرن کی بہن سمجھ را کو

بھگا کر لے گئے جال وطنی کے زمانے میں منی پور کی شہزادی چترانگدا سے شادی کر لی۔ ان سب کے علاوہ بھائی ارجن نے الوپی کو پرچایا۔ وہ الگ۔ گوتم کو ہنسی آگئی وہ ذرا غور سے کہانی سننے میں مصروف ہو گیا

اس وقت تک دونوں فریق کو روکھیشتر کے میدان میں آمنے سامنے پہنچ چکے تھے۔ رزمیہ شاعری میں نسلوں یا قوموں کی ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ بہادر سوراؤں کا مقابلہ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ اصل موضوع تھا۔ شہرت حاصل کرنا سوراؤں کا اصل مقصد حیات تھا۔ اور اپنی شجاعت پر نازاں ہونا اس کے لیے جائز۔ اس کے حریف کے لیے لازم تھا کہ اس کے ہم پلہ ہو۔ بادشاہوں کے بیٹے اپنے سے کم حیثیت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ جس وقت گوتم سجا سے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ اس سے ارجن لا کار کر کرن سے اس کا شجرہ نسب دریافت کر رہا تھا

مہا بھارت کے یہ سارے کردار جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے۔ یہ روایتیں نہیں تھیں۔ تاریخی شخصیتیں تھیں۔ حنکہ نیم الوپی کردار بھی صحیح تھے۔ جن کی دیہی کشمی کی طرح کنول کے پھول سے تخلیق ہوئی تھی۔ اور جن کی جٹاؤں سے گنگا بہتی تھی۔ کیونکہ گوتم اپنے ملک کے شعراء کے زور تخیل کا بڑا قائل تھا۔ اور دیو مالابہر حال فلسفے کی ٹھوس شکل تھی۔ اور روایت کا جال بن لینا ذہن کے لیے بہر حال آسان ترین بات ہے۔ گوتم خود بھی شاعر تھا اور شاعر ہمیشہ اپنے کرداروں کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہی آئے ہیں۔ اروشی اگر اپسرا تھی تو کیا وہ لڑکی جو کہ ایودھیا کے گھاٹ پر بیٹھی تھی۔ کوئی بھی کوئی اسے اپسرا نہیں سمجھے گا تو کیا سمجھے گا کیا وہ اس روز پا

نی کے کنارے بیٹھی جل پری نہیں محسوس ہو رہی تھی؟

سڑک پر آگرتاروں بھرے آسمان کے نیچے گوتم نے ایک لمبا سانس لیا۔ بھاٹ کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔ جھیم۔ راجن۔ کرن۔ جھیم

جگمگاتے ہوئے بجزے دریا کو عبور کر چکے تھے۔ اور دور سے ندی کے گھاٹ پر بڑی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ یہ کسی کی بارات ہے؟

اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا

نہیں تو۔۔ راجن ایو دھیا سے آئے ہیں۔ راہ گیر نے جواب دیا

گوتم نے چونک کر شکر کو آواز دی۔ پھر پیٹ کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن شکر حسب معمول غائب ہو چکا تھا۔ اور گاؤں والوں کی بھیڑ میں جو کہ چوپال کے باہر جمع تھی شکر کا پتا چلا نا لا حاصل تھا۔

گوتم نے چادر کندھے پر ڈالی اور شہر کی طرف چل کھڑا ہوا

وسط شہر میں پہنچ کر اسے اپنی حویلی کی روشنیاں دکھلائی پڑ گئیں۔ وہ فوراً دوسری گلی میں مڑ گیا۔ سنہرے اور سبز اور گلابی مکان پر ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ ایک عورت لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے چھاگل بجاتی قریب سے گزر گئی۔ تاڑی خانوں میں بلڑ مچ رہا تھا

دکانوں پر خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ بازار کی سڑک پر دونوں طرف مشعلیں روشن تھیں۔ ان کی جھلملاتی روشنی میں شہر کے امیر زاوے اور بانکے زرتار کپڑے پہنے موچھوں پر تاو دیتے اکڑتے پھرتے تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس جھوم میں خود کو موجود پا کر ایک لمحے کے لیے گوتم کو بڑا اچھا لگا

ہوا۔۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ شہر سے باہر نکل گیا۔ جدھر آم کے کنج میں ایک خاموش عمارت چٹوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس عمارت کے سامنے جھیل تھی۔ جھیل میں ایک اکیلی ناوجس کا ملاح مسافروں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔

اس عمارت میں سو سال ادھر شاکیہ منی آکر رہے تھے۔ اس کنج میں ان کے چیلے گھوما کرتے تھے۔ صرف سو سال ادھر

گوتم کا جی چاہا کہ وہ عمارت کے اندر جائے اور اس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر سوچتا رہے۔ مگر قریب جانے کی بجائے وہ پھر صرف آدھے راستے سے لوٹ آیا۔ اور آہستہ آہستہ آشرم کی طرف روانہ ہو گیا۔

آزادی نہیں ہے۔ آزادی نہیں ہے۔ کھلی فضاؤں میں۔ ہر ساگر کی لہروں میں۔ بڑھن کی وسعت میں۔ آزادی کہیں نہیں ہے میں بندھا ہوا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ نہیں کر سکوں گا۔

یہاں تک کہ ایک روز تاریخ۔۔۔ ناموں کا تسلسل۔۔ زمان و مکان مجھے نکل جائیں گے۔

آشرم میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گرو کے جھونپڑے میں چراغ جل رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ جہاں اکلیش اور دوسرے طالب علم جمع ہو چکے تھے۔

۶.....

گرو نے وینا ایک طرف رکھ دی اور سر اٹھا کر گوتم کی طرف دیکھا۔۔۔ یہ ہے۔۔۔ یہ ہے۔۔۔ یہ نہیں ہے۔۔۔ یہ نہیں ہے۔۔۔

ہاں گوتم نے جواب دیا۔۔۔

قید کی حالت میں آنند مایہ سب سے بڑی مسرت ہے جو جیو حاصل کر سکتا ہے
..گرو نے کہا

آنند مایہ سب سے بڑی مسرت ہے..گوتم نے دہرایا

مقید روحوں کے لیے پرکھوں کی راہ موجود ہے..وہ جسے بار بار جنم لینا ہے۔۔۔

میرے پرکھ۔۔۔ بھاٹ کی آواز گوتم کے کانوں میں گونجی

اور روح دھوئیں اور رات اور اماؤس کی اندھیری تاریخی راتوں میں سے گزرتی

ہے..وقت اپنے آپ سے منحرف نہیں ہوتا..وقت سے تم بچ نہیں سکتے..اور اپنی

اصلی حالت کو پا کر کوئی چیز اپنے آپ سے انحراف نہیں کرتی۔۔۔

گرو نے مزید کہا

وقت کے سامنے کوئی رشتہ نہیں ہیں..کوئی منطق..کوئی طاقت..وقت پر تمہار

اتقاؤ نہیں رہ سکتا..جو آنکھیں رکھتا ہے وہ وقت کے ارتقاء کو پہچان لیتا ہے

لیکن آنکھیں کہاں ہیں؟..گوتم نے سوال کیا..پراکرتی اندھی ہے..اور پرش

لنگڑا رہی ہے..جو کہ اندھی پراکرتی پر سوار ہے..

پراکراتی اندھی ہے اور بے حس..گرو نے جواب دیا..پرش اسے دیکھتا ہے تو

شعور کا خارجی اور مادی دنیا میں اور داخلی اور ذہنی دنیا میں اکٹھا ارتقاء ہوتا ہے..اور

ادراک اور خیال کی تخلیق..پراکرتی ابدی ہے..ہمہ وقت مصروف عمل..جب تک

پرش کی نظروں میں رہے ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے..بے حس مادہ ذہن کی

جوت سے روشن ہو جاتا ہے..ذہن میں بڑی طاقت ہے

ذہن میں بڑا خطرہ ہے۔۔۔ کلکیش نے کہا۔۔۔ ویدانت میں لکھا ہے۔۔۔ گیان نیکی اور
بدی سے زیادہ اہم ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ خیر و شر مایا میں شامل ہیں۔۔۔ اور گیان مایا سے
نجات دلاتا ہے

۔۔۔ میں گیان سے عاجز آچکا ہوں۔۔۔

گرو نے کہا۔۔۔ اور اک امانیت کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔۔۔ لہذا دنیا کو خارجی اور
عملی میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔۔۔ یہ میں ہوں۔۔۔ یہ باقی دوسری چیزیں ہیں۔۔۔ برہما
ایک ہے۔۔۔ جیو آتماں بہت سی ہیں۔۔۔ جو کچھ ہے وہ اس کا نتیجہ ہے۔۔۔ ہم اپنی حیات
کی وجہ سے نہیں ہے۔۔۔ پراکرتی رقا صہ ہے۔۔۔ پرش اسے دیکھ رہا ہے۔۔۔ جب وہ اس
کی طرف سے آنکھیں اٹھا لیتا ہے۔۔۔ تو وہ بھی اسے نہیں دیکھتی۔۔۔ کیونکہ دوسرے پرش
اسے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ بالآخر وہ ان پرشوں کو آزادی عطا کر دیتی ہے۔۔۔ پرش باہر
اندھیری رات میں آکر آزاد ہو جاتا ہے۔۔۔

لیکن دکھ کون سہتا ہے؟ پرش یا اس کی پارکراتی۔۔۔ گوتم نے سوال کیا
دکھ کا تعلق پراکرتی سے ہے۔۔۔ بتقید زندگی کا حساس بذات خود تکلیف ہے۔۔۔ گرو
نے جواب دیا

ویدانت والے کہتے ہیں۔۔۔ کہ پرش ایک ہے۔۔۔ اکیم است۔۔۔ کلکیش نے پوچھا
ہاں اور کیل کا کہنا ہے کہ پرش ایک ہوتا ہے۔۔۔ تو اگر ایک انسان خوش ہوتا ہے تو
سارے انسان خوش ہوتے ہیں۔۔۔ ایک رنجیدہ ہوتا تو سارے کے سارے رنجیدہ
ہو جاتے۔۔۔ لیکن انسان اپنے اعمال اور اپنی نسل اور اپنی زندگی کے ادوار اور ورن
آشرم کے لحاظ سے مختلف ہیں۔۔۔ گرو نے کہا

بھگوت گیتا میں سری کرشن نے کہا.. کہ پراکراتی کے گن اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں.. لیکن خودی یہ سمجھتی ہے کہ یہ میں ہوں.. اکلش نے کہا اور شکیاہ منی نے پوچھا ہے کہ کوئی محدود خودی ہے بھی یا نہیں.. ممکن ہے یہ سب احساس کی مختلف کیفیتیں ہوں.. گوتم نے دل میں سوچا پراکراتی کے تین گن ہیں.. نیکی.. شدت اور تارکی.. گرو نے کہا گوتم آہستہ سے اٹھا.. اور جھونپڑے سے باہر نکل آیا.. اور دوبارہ ندی کی سمت چل دیا.. کچھ دیر قبل جس طرح بھاٹ کی آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا.. اب گرو اور اکلش کی مدھم آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں.. ست کاریہ وار.. او دیا.. مایا.. شکتی.. پراکرتی.... پراکرتی کے گن..

ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے خود کو ٹھنڈی گھاس پر گرا دیا اپنشد میں لکھا تھا کہ جس کو اپنی آتما کی تمنا ہے اس کے لیے باپ باپ نہیں، ماں ماں نہیں.. دنیا دنیا نہیں.. دیوتا دیوتا نہیں.. چور چور نہیں.. قاتل قاتل نہیں ہے.. اس کو نیکی اور بد کی فکر نہیں ہے.. کیونکہ وہ دل کے سارے رنجوں پر فتح پا چکتا ہے گوتم نیلہر اب چوبیس سال کا ہو چکا تھا.. اتنی مدت میں پہلے وہ سوفسطائی بنا پھر اس نے شوکی پوچا کی.. ہری کا بھگوت بنا.. کبل کے نظریوں پر اس نے بسیط شرحیں لکھیں.. اس نے اپنے ہم نام فلسفی گوتم کا مطالعہ کیا.. جس نے براہمنوں کے مذہب کے قوانین بنائے تھے اور وقت کے میلے پر سوچ بچار کیا تھا.. ہری شکر سے ملنے کے بعد اسے گوتم سدھارتھ سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی.. لیکن ابھی تک وہ اس دلیس کی ازلی اور ابدی سوچنے اور کھوجنے والی روح تھی.. جو کہ کبھی اور کسی جگہ مطمئن

نہ ہوتی تھی... جو برابر اس سوال کے جواب کی تلاش میں مصروف تھی کہ ہم کس طرح جانیں؟

وہ مدتوں سے اس کھوج میں تھا...

ہم کس طرح جانیں یہ سب کیا ہے..

وہ سہا ہوا گھاس پر لیٹا رہا.. پچھلے پہر کی مہم چاندنی سائیں سائیں کر رہی تھی.. لٹے لیٹے آہستہ آہستی اس کا ذہن صفر کے نقطے تک پہنچ گیا.. پھر اس نے اپنے آپ کو ان گنت حصوں میں تقسیم کر دیا.. بہت سے گوتم جو بول رہے تھے.. گا رہے تھے.. لکھ رہے تھے.. تہمتیں لگا کر نہس رہے تھے.. ادا سے.. اچنبھے میں تھے.. اسے اور زیادہ ڈر لگا.. گرو کی آنکھوں میں اسے وہ خود نظر آیا.. جو کہ چراغ کی روشنی میں اسے گھور رہی تھیں.. اور بالوں کی سفید جٹائیں اسکے کندھوں پر بکھری تھیں.. کلیش کا مسکراتا چہرہ.. بازار کے لوگوں کی شکلیں.. فوکیلی مونچھوں والے زرگر ک.. پرسکون چہرے والے بھکشو.. چندھی آنکھوں والے پھاڑی.. ان سب میں اسے اپنا آپ نظر آیا.. اور اسے اور زیادہ ڈر لگا.. آجکل اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی ویران مندر کے تاریک گر بھگرہ میں چھپ جائے اور اندر سے کندھی چڑھالے.. گر بھگرہ کے خیال پر اسے چند ہی کی بھیا نک مورتی یاد آئی.. جس نیا سے سر جو کے کنارے ڈرایا تھا

یہ ساری دے مل کر چاروں طرف سے اس پر حملہ آور کیوں ہو رہی تھی؟ سب اس کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے تھے.. اس لشکر میں وہ گھاٹ والی لڑکی شامل تھی.. ہری لشکر شامل تھا.. گرو پر شوم اور سارے نئے اور پرانے حکماء شامل تھے... خدا

کا تصور شامل تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کوشش کر کے اپنے ذہن کو
ماسوا سے عاری کرنا چاہا اس نے سوچا کاش وہ کم از کم یوگا کا ہی ماہر ہوتا۔ کاش
ایک لطیف سا خلا، اس کے ذہن میں آ کر کہیں سے بھر جاتا۔ آخر اس کا کیا تصور
ہے؟ اس نے تو ہمیشہ جاننے کی کوشش کی ہے۔۔۔

اسے وقت سے نہیں ڈرنا چاہیے

وقت کے راستے سے ہٹ کر وہ ایک طرف سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ تھکے
ہوئے آرام کے احساس کے ساتھ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سوچا جیسے
وہ زمان مکان سے آزاد بہار کے بادلوں کی طرح اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ چاروں اور
خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح صرف وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی
انسان ایتھکا ہوا۔ شکست خور وہ۔ پشاش۔ پر امید۔ رنجیدہ۔ انسان جو خدا میں ہے
اور خدا سے الگ ہے۔ کائنات کا اولین زری ہوش جسے یہ ساری چاندنی۔ سارے
پھول۔ ساری ندیاں۔ سارا حسن دے دیا گیا ہے۔ اولین روشنی کا زمانہ اور برہمنا کا
سارا محل سنان پڑا ہے۔ اس میں محض نور ہے۔ نور کی دنیا سے ایک ہستی آن گری
ہے جو پرش ہے اور اکیلا ہے۔۔۔

اس اولین انسان نے آنکھیں کھول کر چاروں اوڑھ نظریں دوڑائیں۔ اور
اس نے دیکھا کہ چاروں اور دور دور تک بستیاں جگمگا اٹھی ہیں۔ اور کھیتوں میں
سرسوں لہراتی ہے اور اود گاتری برہمن ست تانتو ساز کے سوسوتا چھیڑ کر سام وید
کے گیت گارہے تھے۔ اور اندورم جھم برس رہی ہے۔ بانگوں کا نوجوان خدا اندر
لڑکیوں کی چڑیاں اپنی پھور سے بھگوائے ڈالتا ہے۔ سنہرے بالوں والے نوجوان

آریہ سورما میدان میں رتھ دوڑا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تیرکمان ہیں۔ یہ جنگ اور شاعری کے دیوتاؤں کے پرستار نو جوانوں کا عہد ہے۔ شجاعت کا دور۔ طاقتور کمزور کو زیر کرتا ہے۔ یہ بے خوف نڈر انسان عناصر سے۔ ظلم سے۔ موت سے لڑتے ہیں۔ سوم پٹی کو رقص کرتے ہیں۔ ان کا فلسفہ تیاگ کا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ زندگی پر جی جان سے عاشق ہیں۔ انہوں نے پھولوں کے نگر آباد کیے ہیں۔ مٹی کے فصیلوں والے پور بنائے ہیں۔ لکڑی کے مکانوں میں اگنی شالائیں روشن ہیں۔ پتھر کے قلعے تعمیر کیے جا رہے ہیں جمنائی وادی میں گائیں چر رہی ہیں۔ رنگین پگڑیاں باندھے۔ بالوں کی چار چار چوٹیاں گوندھے۔ مرگ نہیں لڑکیاں پشپ کرما کے لیے پھول چن رہی ہیں۔ ہالمیہ کی وادی میں عظیم شوالک دریا بہہ رہا ہے۔ بہرہ زاروں میں ویویکا۔ اورالکھ نند اور بھاگرتی ندیاں گنگناتی ہیں۔ سریو۔ اور ورناتنی کوشل دیس کو سیراب کر رہی ہیں۔ اتر میں گیہوں کے کھیتوں کی کبھ اور وتنا اور ویاس آبپاری کرتے ہیں۔ جنوب میں مہاندی بہتی ہے

یہ سریلی ندیوں کا بہت اتم سنگیت ہے

دراے کی لہریں چاندی میں راویں ہیں۔ گوتم نے آنکھیں بند کر تصور کیا وہ اس سے دو ہزار برس قبل کی دنیا میں پہنچا۔ ہے۔ وہ اس خنک۔ آرام دہ۔ پیاری زمین پر بیٹھا ہے۔ یہ زمین اس کی زمین ہے اسے اس زمین سے عشق ہے۔ صدیوں سے وہ اس زمین کو پہنچ رہا ہے اس نے اس میں خوبصورت درخت لگائے ہیں۔ دُفرب شہر بسائے ہیں۔ اس زمین پر اس نے محبت کی ہے

سنہرے بالوں والا بلند و بالا آریہ جو اپنے سنہری رتھ پر دھرتی کو روندنا مغرب

سے مشرق کی طرف آیا تھا۔ اندر کی کمان اس کی معیت میں... پارہی اس کے ساتھ ساتھ چلتی آرہی ہیں... برہما کی بی بی سرسوتی نے اپنی پنج پر سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کاہ... علم تیرا ہے... گنیش نے سوٹ اٹھا کر قلم اس کے ہاتھ میں دے دیا

تخیل میں کتنی طاقت ہے... جس نے عناصر اور چہندوں پرندوں کو شخصیتیں عطا کی ہیں... پرتھوی اور ورونا... اندھیرا آسمان اور اگنی اور اندر... عناصر کی یہ تمثیلیں فلسفے کی اولین بسم شکلیں ہیں... ان کے ذریعے سب کے قانون کو مزین کیا جا رہا ہے... یہ دناے کے اولین فلسفی ہیں... فلسطین کی پھاڑیاں خاموش پری ہیں... اسرائیل کے نغمہ نواز ابھی پیدا نہیں ہوئے... مگر ان شاعروں کی آواز برہم ورت پر جھکے ستاروں سے جا ٹک رہی ہے... یہ صبح کے ستاروں کے راگ ہیں... اور خدا کے بیٹوں کی لٹکار... انہوں نے فطرت کے اس عظیم الاشان مالک کو اتنے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے... ان کو کھوج لگی ہے... یہ سب کیوں ہے؟ اس کا مصنف کون ہے؟ ادا کار کون؟ تماشا کی کون؟ متراروز روشن کو سامنے لاتا ہے... ہم سب کا دوست ورونا اندھیرے آسمان کا مالک ہے... سور یہ روشنی کا خزانہ ہے... او شاح کی کنواری... وایو ہوائیں چلاتا ہے... ماروت طوفان کے فرشتے ہیں... پیش دیوتا سرکوں اور گلوں کا نگہبان ہے... روز آسمانوں کا چنگاڑتا بیل ہے... عالم بالا کا سرخ سور...

او ورونا... ایک صاف گہری آواز فضا میں گونجی... گوتم نے گاہس پر لیٹے لیٹے پہچانا... یہ اس کی اپنی آواز تھی... جو کہ دو ہزار سال قبل بلند ہوئی... وہ اونی شال پیٹے

..کانوں میں کرن شو بھا اور گئے میں سنہری رما پہنے ایک اونچی چٹان پر کھڑا تھا
..اس کے ہاتھ میں سر منڈل تھا.. اس نے پکار کر کہا.. کیونکہ اندھیرے آسمان کے
نیچے اس سے وہ تنہا کھرا تھا

ادورونا..... ہم نے اپنے رفیق.. اپنے بھائی.. اپنے دوست.. اپنے ہمسائے یا
کسی اجنبی کا دل دکھایا ہے.. تو ہماری اس خطا کو درگزر کر...
اپنی کمزوریوں کی وجہ سے تیرے قوانین کی جو خلاف ورزی کی ہو...
ادورونا اس کی سزا نہ دے

اور اسی تاریکی میں کوئی دوسرا شاعر آہستہ آہستہ کہتا تھا
میں؟؟ جو بیوقوف ہوں اور جاہل ہوں
میں نے چاہا کہ دیوتاؤں کے چہرے ہوئے گھر کا پتا چلاؤں
میں نے مینوں سے پوچھا

وہ جس نے چھ آسمانوں کو سہارا دیا
کہیں یہ وہی تو خدائے واحد نہیں؟

پہلوٹھی کے لڑکے کو کس نے دیکھا ہے؟

وہ جس کے جسم میں ہڈیاں نہیں.. اس نے ہڈیوں والی مخلوق کو جنم دیا
وہ کون جنگل تھا.. کون درخت.. جس کی لکڑی سے یہ کائنات گھڑی گئی؟
وہ کون تھا کہ جو جاننے والے کے پاس یہ پوچھنے کے لیے گیا؟

یم..... دنیا کا پہلا انسان جس نے مر کر موت کا پتا لگایا
پھر اس شاعر نے سوچ کر دوسرے شاعر کو جواب دیا

وہ طاقتور ترین دنیا کا باپ ہے

وہ مبارک ہے یعنی شیو ہے

اس کے قہر سے گائیں اور انسان مر جاتے ہیں

پھر اس نے پوچھا

موت مجھے ختم کر دے گی۔ موت کو کون ختم کرے گا؟ وہ کون سی چیز ہے جو کہ

انسان سے اس کی موت کے گھنٹے میں جدا نہیں ہوتی؟ مرنے کے بعد انسان کا کیا

ہوتا ہے؟ راجہ پرکشت کی نسل کہاں گئی؟ وہ کون ہے جو کہ ہر شے پر قادر ہیلیک ہر

شے سے علیحدہ ہے؟

موت سے ہم کر شاعر نے زمین سے استدعا کی...

وسیع مہربان دھرتی... ماں... اسے اپنی گود میں جگہ

نو جوان لڑکی... جو کہ اون کی طرح ملائم ہے

تجھے تباہی سے بچائے رکھے گی

دھرتی.... اپنے آپ کو دھیرے دھیرے جھکورے دے

اسے اپنے بوجھ سے نہ دبا

اسے آرام کرنے دے

اسے اس طرح چھپالے جس طرح ماں اپنے بچے کو آنچل اور صافیتی ہے

شمشانوں میں روشنی ہو رہی ہے

اگنی اس کو جلا نا نہیں اس کی کھال... اس کے جسم کو بھون کر رکھ دینا

اسے کھالینے کے بعد اسے اس کے پرکھوں کے پاس بھیج دینا

جب یہ اپنے پرکھوں کے پاس پہنچ جائے گا تب خدا کی مرضی پوری ہوگی
اور ایسا ہوا کہ اس کی آنکھیں سورج کے پاس جائیں... اس کی سانس ہوا میں
تخلیل ہو یا آسمان کے پاس جائے یا زمین پر رہے.. جیسا سنا کا مقدر ہو.. اور اس
کے ہاتھ پاؤں پودوں کی شکلوں میں پھر سے نمودار ہوں

انسان بہت کمزور نکلا... جو کہ اپنی ساری دھوم دھام.. سرائی شان و شوکت..
سارے ارادوں کے باوجود ختم ہو جاتا ہے.. شاندار شہر نیست و نابود ہو جاتے ہیں
... دریا غائب ہو جاتے ہیں.. پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں.. باغوں میں بسنت
منانے والوں کا نشان تک نہیں ملتا

ہر شے فانی ہے... صرف ستوپ باقی بچتے ہیں
مسرت بیکار ہے... دل کی لگن بیکار ہے.. اب میں کسے پکاروں؟.. کس کی
مناجات کروں؟

اندر کی مناجات کرو.. رگ وید کے شاعروں نے کہا...
اندر کی مناجات کرو.. آواز بازگشت لکڑی کے مکانوں اور پتھر کے قلعوں میں گو
نچی...

اندر کی مناجات کرو.. اگر وہ واقعی ہی موجود ہے
اندر کا کوئی وجود نہیں... دوسرے شاعر نے سوال کیا
اسے دیکھا کس نے ہے؟ میں کس کو پوچھوں اور اندر نے گرج کر گھنگھور
گھٹاؤں کو جواب دیا..

میں ادھر ہوں... او مفتی مجھے دیکھ...

میں ساری مخلوقات سے عظیم ہوں
نظام کائنات نے مجھے عظیم تر بنایا ہے۔۔

پھر انہوں نے کہا۔۔ اوپھاڑوں پر رہنے والے رور۔۔ اپنے تیز۔۔ قہرناک تیروں
سے

کسی انسان کو کسی حیوان کو نقصان نہ پہنچا
کیونکہ موت خوفناک ہے۔۔

لیکن موسیقی موت کو ختم کر دے گی۔۔ موسیقی کی وسعت۔۔ اس کی گہرائی میں
موت کہیں تنکے کی طرح ڈوب کر رہ جاتی ہے۔۔ موت دراصل بہت حقیر ہے
۔۔ موسیقی خدا ہے

روید کے شاعر چٹان پر بیٹھے رہے۔۔ نیچے وقت کا تاریک دریا بہہ رہا تھا۔۔ اس
دریا کی سطح پر چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا ہو گئے۔۔

اس اولین موسیقار کے ہاتھ میں وینا تھی۔۔ انہوں نے سات سروں کی سرگم
تخلیق کر لی تھی۔۔ سرگم کا ایک ایک سروینا کے تاروں پر علیحدہ علیحدہ گونج رہا تھا۔۔

اب سارے تار اکٹھے ہو کر ایک آواز پیدا کر رہے ہیں۔۔۔

ویشو دیو۔۔۔ سارے خدا ایک ہیں۔۔۔ گنی۔۔۔ اوشا۔۔۔ وردنا۔۔۔ سوما۔۔۔ کندھرو۔۔۔ ساری

طافتیں ایک دوسو بھونانی ہیں۔۔۔۔

تداکیم۔۔۔ خدا ایک ہے۔۔۔ مضراب کی ایک جھنکار سے فضا مرعش ہو گئی۔۔۔۔

مگر میں کس کی عبادت کروں

کس کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں

اور شاعر نے خود ہی جواب دیا
و شوکر ماہ و شو دیا مہمان اسی
تو سب کا خالق ہے خدائے بزرگ و برتر۔۔۔ پر جاپتی۔۔۔
کون کھمبا تھا۔۔۔ کون سہارا
کس طرح ایسا ہوا کہ و شو کر مانے اپنی طاقت سے زمین بنائی اور آسمان تانا

....

وہی ایک خدا ہے جس کی چاروں طرف آنکھیں ہیں۔۔۔
اور منہ۔۔۔ اور بازو۔۔۔ اور پاؤں
جو اپنے دو بازوؤں اور پروں کی دھونکنی سے دنیا کو گھڑتا ہے
سب سے پہلے نور پیدا ہوا۔۔۔ وہ سارے وجود کا خدا تھا۔۔۔
اس نے آسمان اور زمین بنائے۔۔۔
میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں؟
وہ جو زندگی اور طاقت بخشتا ہے۔۔۔
ابدیت اور فنا جس کی پر چھائیاں ہیں۔۔۔
میں کس خدا کی بارگاہ میں قربانی چڑھاؤں؟
وہ جو اس سانس لیتی اور سوتی ہوئی کائنات کا مالک ہے
وہ جس نے فضا میں روشنی کی پیمائش کی ہے
جس نے جگمگاتے عظیم پانیوں کو تخلیق کیا ہے۔۔۔
وہ جو ایک دیا ہے اور پران اور سکھما [سہارا]

قصہ مختصر یہ کہ وہ برہما ہے

خدائے واحد.... جو کہ نہ مرد ہے اور نہ عورت... اس کی کوئی جنس نہیں... کوئی نیا
نی نہیں... نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے... نہ یہ کسی کو پیدا کرتا ہے... ایک ادیو
برہما جو کہ بڑھتا ہے جو بڑھاتا ہے... اور پھیلاتا ہے... جو کہ دنیا کی تخلیق کا مادی
سبب ہے... لیکن خود غیر مادی ہے... اور دنیا جو اس نے تخلیق کی خود غیر حقیقی ہے
محض اوم اصل حقیقت ہے... خلا... روشنی اور آواز

لفظ..... جو اس زبان سے ادا ہوتا ہے... برہم سہتی... جو پھیلتا ہے... برہم سہت
کی حیثیت سے برہما خدائے نطق ہے

لفظ جو کہ شروع میں تھا اور خدا تھا... بدتوں بعد فلسطین کے حکماء یہ جملہ دہرا کر
ایک نئے خیال کا پرچار کریں گے... یونان میں لوگوں کے مسئلے کی ترویج ہوگی... عہد
نامہ قدیم میں صوفیہ علم کی صورت میں ظاہر ہوگی
ویدیوں کی تقلیدیں مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے
کیونکہ وید زبان کی شکل میں برہما ہے...

اب لفظ اور خیالات کے باہم رشتے پر غور کیا جا رہا ہے... زبان نے ایک حمد
میں کہا...

میں وایو اور رورا اور شودیو کے ساتھ گھومتی ہوں

میں متر... دیونا... اور گنی کی مددگار ہوں

میں ملکہ ہوں... دولت جمع کرتی ہوں... میں جاننے والی ہوں...

ان سب میں افضل جن کی عبادت کرنا چاہیے

بغیر جانے انسان مجھ پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔۔

میں جسے پسند کروں اسے برہما۔ رشی اور اگنی بنا دیتی ہوں۔۔۔

میں روہ کی کمان موڑتی ہوں تاکہ وہ جو برہما سے متنفر ہے۔۔ اسے ختم کیا جاسکے

..

میں جنگیں کرواتی ہوں۔۔ میں ہوا کی مانند چاروں کھونٹ پھیلانی ہوں

شہد برہما۔۔

برہما جو کہ بذات خود ذہن ہے اور کنول کے ریشے سے زیادہ لطیف بادل کی

چھایا سے زیادہ ہلکا۔۔ جو کہ اس کائنات کا حامل ہے۔۔ جو کہ اپنے آپ کو تقسیم کرتا ہے

تاکہ دوسرے پیدا ہوں۔۔

وہ دوسرا میں خود ہوں۔۔ آتما۔۔۔ جو ذہن اور زبان اور سانس کا دوسرا نام ہے

۔۔ جو کہ خود اپنی گواہ آپ ہے۔۔ اور جو روح۔۔ کائنات اور۔۔ پرماتما بھی ہے

اب برہمن اور آتما کا مجرد تصور وحدت وجود کے نظریے کے لیے راہیں تیار کر

رہا ہے

پر جاپتی کے تخیل نے واحدانیت کا جج بویا

شروع میں پانی تھا جس پر پر جاپتی ہوا کی طرح منڈ لایا۔۔ اور کائنات کی تخلیق

کی

فلسطین کا فلسفی بعد میں کہنے والا تھا۔۔۔ شروع میں پانی تھا جس پر روحیں

دھونیں کی طرح منڈ لاتی تھیں

ان شاعروں کے تخیل نے ساری کائنات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔۔ ان

کے اشعور کی وسعت میں قطب شمالی کی طویل راتیں... مدھم سرخ سورج اور وسیع
 سبزہ زار تھے کھلی فضا میں موسم کی تبدیلیاں... پھولوں کے رنگ... بسنت رت کی
 زردی... سرسوں اور کپاس اور ٹیٹو اور ہار سنگھار اور ساون بھادوں کی جھڑیاں اور مور
 کی... مینہ آو... مینہ آو کی صدائیں اور جب درخت جامن... فالسے اور کروندوں
 سے لہر جاتے ہیں اور خزاں... جب دھان کی فصل کٹتی ہے اور سردیاں... جب
 چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور کھلیانوں کے اوپر بہمت کا چاند دھند میں تیرتا ہے...
 یہ موسموں کی راگ مالا انہوں نے اس ویٹا کے تاروں میں قید کر لی ہے... برہما اور
 شکنتیا کا تصور سنگیت میں ڈھل چکا ہے... برہما راگ ہے... سرسوتی راگ رانی... پا
 نچ سر مہادیو نے تخلیق کیے ہیں... کھرج اور پنچم پاروتی نے بنائے ہیں... فضائے
 بسیط تو نبور و... نارونی اور چتر سمن کی موسیقی سے گونج اٹھتی ہے... یہ عناصر کی موسیقی
 ہے جسے متشکل کر لیا گیا ہے

نٹ راج کا ڈمرو... آکاش تات ساء کا مظہر ندا جس میں ساری آوازیں پیدا ہو
 تی ہیں... رورا ندھیوں کا خدا اپنی پر شکوہ وینا چھیڑ رہا ہے
 جمن کے کنارے مہاوشنوبانسری پر نغمہ حیات بجا رہے ہیں... گویاں... آفاقی طا
 قتیں... اس کی دھن پر رقماں ہیں

کائنات ان گنت سازوں کی جھجکا سے گونج رہی ہے... راگ تخلیق ہو رہے
 ہیں... جن کی پردیپ سے آواز کی دنیا جھلک اٹھی ہے... فضائے بسیط میں بھیرو...
 مالکونس... ہنڈول... میگلہ... دیپک... سری کے دیو گرج رہے ہیں

اساوری اور رام کلی کی نازک پریاں ہوا میں پر پھیلاتی ہیں... جنگل کے پر

ندے اور جانور بھی شاعر اور موسیقار کے ساتھ ہیں، ان کی آواز.. ان کے رنگ اور ان کی چال کو قص و نغمہ کے تخیل میں محیط کر لیا گیا ہے مور کھرج میں جھکارتا ہے چہا رکب میں اپنی گھٹ لگاتا ہے بکری گندھار میں منماتی ہے کلنگ مدھم میں پکارتا ہے کوئل کی کوک میں پنچم کا سر ہے.. دھیوت گھوڑے کا ہنہاتا ہے.. نکھاد ہاتھی کی چنگماڑ ہے..

تان پورے پر سر چھیڑا گیا.. تان پورے کی آواز جو گیت سے پہلے شروع ہوتی ہے گیت کے دوران موجود ہوتی رہتی ہے اور گیت ختم ہونے کے بعد تک گونجتی رہتی ہے.. سر جو ذات مطلق ہے.. جو ہمیشہ سے تھا... ہے... اور رہے گا سنگیت کار کے فن میں فلسفے.. رنگ و نور خیالات اور جزبات کا دھارا کھابہ رہا ہے

اس شاعری اور موسیقی کے پس منظر میں بہت عظیم رنگوں اور آوازوں کی دنیا پھیلی ہے.. آسمان سے الو ہی پانی برستا ہے اور الو ہی شفاف ندیوں میں بدل جاتا ہے.. آسمان کی روشنی کا سمندر اوشما کے اجالے کے ساتھ ساتھ صبح کے راگوں میں گھل مل جاتا ہے اور اس مقدس کھرے پر سنہری دیہی سرسوتی تیرتی ہے سرسوتی جو کہ تخلیق کرنے والی ماں کا تصور ہے.. جو راگنی ہے.. جو علم ہے... جو زندگی کا مقصد ہے.. علم سے آزادی ملتی ہے.. علم سرائے وجود کی بنیاد ہے.. گیان میں نجات ہے.. [سوچتے سوچتے گوتم وقت کے اس نقطے پر لوٹ آیا جہاں وہ اس سے موجود تھا].. قید اس لیے ہوتی ہے.. اس نے گھاس پراٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا کہ خودی اپنے آپ کو اپنے ذہن سے مماثل کر لیتی ہے اور لہذا اس دکھ اور گناہ اور ذہنی اور اخلاقی

کمزوریوں کا شکار ہو جاتی ہے.. اور پراکرتی کا تجربہ کسی کو تو کرنا ہوتا ہے...

یہ تجربہ خالص روح کرتی ہے.....

یہ تجربہ میں بھی کر رہا ہوں..

یہ تجربہ کرتے کرتے میں کدھر نکل جاؤنگا..

لیکن کوئی پروا نہیں

سوال حقیقت پسندی یا تصوریت کا نہیں.. صحیح عمل اصل چیز ہے

وہ گھاس کی پتیوں کو توڑ توڑ کر اکٹھا کرتا رہا اور پھر زمین پر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی.. اور درختوں کے جھرمٹ میں کسی یوگی کی جھونپڑی کے سامنے آگ جل رہی تھی.. اس نیم تاریکی میں اس کی روشنی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہوئی..

پتا نہیں چچا اس وحشت اور ویرانے میں وہاں بیٹھا کیا سوچتا ہوگا.. گوتم کو پاک لمحے کے لیے بڑا اچنچا ہوا

وہ ان شعلوں کو ٹککی باندھے دیکھتا رہا.. وقت سنسناتا ہوا اس کے چاروں اور ڈول رہا تھا.. ذہن کی جوت کے آگے اب قربانیوں کی آگ مدھم پڑ چکی تھی.. انسانی دماغ دیو مالا کی تخلیقی مدتیں ہوئیں کر کے ختم کر چکا تھا.. خیال کے صنم خانے آباد ہو کرنے پرانے بھی ہو گئے.. دماغ اب دقیق مسلوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف تھا.. مذہب اب محض کمتر درجے کا علم سمجھا جاتا تھا.. اصل چیز فلسفہ تھا اور ما بعد الطبیعات.. سارے ملک میں خیالات کی فرمانروائی تھی اور آزادی.. افکار اور مزہبی رواداری.. ایک ہی کنبے کے افراد ہر ہما کے مختلف مظاہر کی کوشش کرتے اور

متضاد نظریوں پر یقین رکھتے... مادہ پرست... شویت کے قائل... ملحد... بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے کیونکہ سچائی کی تلاش ان سب کا مشترکہ مقصد تھا۔ ہر فلسفی اپنی اپنی جگہ سے جو اس نے اپنے لیے منتخب کی تھی... ذرا برا بر سر کرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر ان سب نے علم معقولات کو سب سے زیادہ فوقیت دی تھی... حسی ادراک... استنباط... اور لفظ کی شہادت اور سند پر اس جستجو کی بنیاد تھی۔

ملحد حکیم کپل کئی سو سال قبل گزر رہا تھا... چونکہ ادراک... استنباط اور لفظ کی شہادت میں سے کوئی چیز بھی خدا کے وجود کا ثبوت بہم نہ پہنچا سکتی تھی... لہذا کپل نے بڑی دلیری سے ایشور کی بجائے ان ایشور پر زیادہ توجہ دی تھی... منطقی کی حیثیت سے وہ خدا سے منکر ہونے کی بجائے محض اسی پر مطمئن رہا کہ شہادت کے عام ذرائع سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا... گو اس قدر روادار تھا کہ عوام کے دیوتاؤں شیو اور وشنو تک گوارا کر لیتا تھا کہ ممکن ہے کہ وہ موجود ہی ہوں... لیکن اس کے نزدیک یہ محض تخلیق شدہ دنیاوی خدا تھے اس کے خیال میں ایشور تک کا وجود مظاہری تھا... ساتھ ہی وہ کہتا تھا کہ کوئی چیز زمان و مکان میں مقید ایسی نہیں جو بڑا خر حقیقت اور ابدیت پر مبنی نہ ہو

کپل ناستک یا معدومیت پرست نہ تھا... سیدھا سادا ملحد تھا... برہما کے بجائے اس نے پراکرتی کو وجہ کائنات ثابت کیا... پراکرتی یا فطرت... جو کارن کا ریہ نظریے کی بنیاد تھی پر ان کرتی اولین کارن ہے... مذہن خودی... جو اس خمسہ اور عناصر اربعہ اس کی ترکیب اور سارا ارتقاء اس میں مشتمل ہے اور پرش جو کہ خالص روح ہے... جو کہ نہ کسی کا کارن ہے اور نہ کاریہ... اور پراکرتی الگ کھڑا ہے... پرش ابدی

شخصی شاہد ہے۔ اور اس کے اوپر پراکرتی کے ملاپ سے دنیا ٹھوڑی آتی ہے۔ ان دونوں کے مالوہ تیسری کوئی طاقت نہیں ہے۔ اور دونوں کی علیحدگی سے قطعی کامل مسرت اور مطلقیّت پیدا ہوتی ہے۔ کپل کا کہنا تھا کہ ارتقاء محض اتفاقاً نہیں ہوا۔ موجودہ کائنات کے پس منظر میں کوئی اور حقیقت رہی ہوگی۔ کاریہ کارن میں پہلے سے موجود رہتا ہے

ویدانت والے موصد خدا پرست جو کہا یک برہما کو قادر مطلق جانتے تھے کاریہ اکرن بھید کے مسئلے پر متفق نہیں تھے۔ ان کے نزدیک کاریہ اور کارن ایک ہی تھے کیونکہ ہر شے برہما تھی۔ بت قوم اسی۔ تو۔ وہ۔ ہے۔ جیو آتما۔ بندہ۔ دراصل۔ وہ۔ ہے۔ تو ہی خدا ہے۔

لیکن ہر شے برہما ہے۔ تو یہ دوئی کا ہے کے لیے؟ کپل کے ملحد ساتھیوں نے پوچھا

یہ دوئی دراصل مایہ کا فریب ہے۔ مایا پراکرتی کا۔ انہوں نے جواب دیا۔ بندہ پرست کپل کی فطرت کو ویدانت والوں نے برہما کا سایہ قرار دیا۔ انہوں نے اوراک پر الہام کو ترجیح دی۔ اوراک اور استنباط محض عالم موجودات کے لیے ہی سند سمجھے جاسکتے تھے۔ اگر برہما ایک ہے تو دنیا میں کثرت کیوں ہے؟ تجربے متنوع کیوں ہوتے ہیں؟ لیکن برہما کی ذات کا ایک پہلو۔ نام روپ بھی ہے۔ اس کی مایا۔ شکتی اور پراکرتی دنیا کی تخلیق کرتی ہے۔

لیکن اصل ذات خداوندی نام۔ روپ اور مایا سے بلند تر اور بے نیاز ہے۔۔۔۔۔ گنی جن کے لیے ساری دنیا سراپ کی مانند ہے۔ اصل برہما غیر مشروط اور قطعی ہے

..ہماری اودیا کی وجہ سے وہ ہمارے ذہن میں آ کر شروط .. عملی .. خالق اور شخصی بن جاتا ہے دنیا کی تخلیق بھی اودیا اور اصلی اودیا کی وجہ سے ہمارے ادراک سے باہر ہے ... یا شکلی کے ذریعے ہوئی اور اس کی وجہ سے برہما کا درجہ کم ہو گیا بڑھا نہیں .. برہما صفات سے متاثر نہیں .. جس طرح ہمارا اپنی مشروطیت ہماری اصلی روح کو متاثر نہیں کرتی .. جس طرح صفات زدہ برہمائیں تکلیف کرتا ہے .. اسی طرح ہماری مشروط آتما اس برہما کو تخلیق کرتی ہے ... مایا کی دوسرا تھ میں نرگن برہما سگن بن جاتا ہے

نا..... نا..... برہما کے لیے ہم محض یہی کہہ سکتے ہیں .. وہ یہ نہیں ہے ... وہ یہ بھی نہیں ہے .. ویدانت میں لکھا تھا وہ ست بھی ہے اور است بھی ہے .. وجود بھی ہے اور عدم وجود بھی ہے .. عظیم ترین وجود اور عدم وجود .. یوں کہ جن چیزوں کو دنیا وجود سمجھتی ہے وہ اس سے مختلف ہے .. برہما شخصی ہے .. اس کی خارجی صفات نہیں .. اگر وہ جانتا ہے تو محض خود کو جان سکتا ہے .. جس طرح سورج اپنے آپ کو روشن کرتا ہے .. ہمارا برہما کے متعلق علم محض برہما کا احساس ہو سکتا ہے .. جو کہ خود ہمارا اپنا احساس ہے .. یکتی سے الیشوری مظہری خدا اپنے آپ سے غائب ہو سکتا ہے

یہ حکماء بجائے خود بدعتی تھے .. کیونکہ فلسفی تھے ویدانت والوں نے اسی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے خود ویدوں کو منتخب کیا اور الہام سمجھ کر ان کے آگے جھکے .. گو سند کو بڑی آسانی سے منظور یا نا منظور کیا جاسکتا تھا .. خود کو پیل کا ایسا منطقی بھی ویدوں کو کہیں کہیں سے اس شرط کے ساتھ مان لیتا تھا کہ وید بھی غلط کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے

ابدیت پرست کہتے تھے کہ روح اور دنیا دونوں ابدی ہیں۔ محض زندگیوں کا تسلسل قائم ہے۔ اور ابدال اباد تک رہے گا۔ چندو کے نزدیک آتما اور دنیا ایک حد تک ابدی تھیں اور ایک حد تک نہیں۔ آتما نکتوں کے نزدیک دنیا یا محدود تھی یا غیر محدود اس کے استھ ہی دناے محدود تھی نہ غیر محدود۔ سیاوا دیوں کا خیال تھا کہ ہر چیز ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ کو کسی بارے میں قطعی رائے نہیں دیتے تھے۔ دوسری دنیا ہے یا نہیں حادثہ ہے یا نہیں۔ جزا و سزا ہے یا نہیں۔ حیات بعد الممات ہے یا نہیں۔۔۔

کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آتما محض حادثے کے طور پر ظہور میں آئے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انہیں خود یا د تھا کہ کچھ عرصہ قبل وہ نہیں تھے اور اب ہیں صدیاں گزرتی گئیں۔ ذہنی ایشندوں کی شدید مابعد الطبیعات سے اکتا گیا۔ رفتہ رفتہ خدا جو کہ فلسفے کا مسئلہ تھا شخصی بنا تا کہ بالآخر دل کو ذہن پر فتح حاصل ہو۔ رور ایک ہے۔ ایک اپنشد میں لکھا گیا۔ جو انسانوں کے دل میں رہتا ہے اور اسے پہچان کر ساری اودیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔۔

مابعد الطبیعات کے کارن نے اوتار کا روپ دھارا۔ اضافی کا مطلق سے تعلق خرد کے بجائے وجدان ٹھہرا۔۔۔ بے جنس برہما مرد بنا۔۔۔
 وشنو جو پتے کے گرنے میں نہاں ہے۔
 نارائن جو خود مجھ میں ہے

دردنا بن سے بانسری کی تان بلند ہوئی۔ اور گنگا اور جمنا کے کناروں پر چھا گئی

انگ رنگ سا گرم

مدھوسودن.... جو کہ محبت کا اتھاہ سمندر ہے.. گردھر گوپالا.. کرشنا.. کرشنا
گوتم نے گھاس پر سے سر اٹھایا اور ندی پر سے برستے سنائے کو دھیان سے
سننے لگا..

اور کرشنا نے کہا.. اوارجن میں بے پایاں وقت ہوں.. میں تباہ کن موت ہوں
.. میں رازوں کا سناٹا ہوں.. میں ابتدائے عالم ہوں اور میں ہی اس کی انتہا ہوں.. او
کننتی کے بیٹے میں پانی کا سودا ہوں.. سورج اور چاند کی روشنی.. میں سارے
ویدوں میں لکھا ہوا ام ہوں.. میں آکاش کی آواز ہوں.. میں انسانیت کا اجتماعی
شعور ہوں.. اوکننتی کے بیٹے.. میں عورت کی ذہانت اور وفاداری اور رحم دلی ہوں
.. میں گاتری منتر ہوں.... میں اچھوں کی اچھائی ہوں.. اوارجن میرے الوہی مظاہر
بکراں ہیں.. میں عالم الغیب ہوں.. لیکن مجھے کوئی نہیں جانتا

اور کرشنا نے کہا.. مجھے چاہو.. مجھ سے محبت کرو.. میں تمہارا سکھا ہوں.. تمہارا
ساتھی.. تمہارا محبوب.. میں محبت کا سمندر ہوں.. انگ رنگ سا گرم

کائنات اس کی بانسری کی آواز سے مسحور ہو گئی.. پھر ویشالی کے مہاویر نے کہا
.. خداوند عالم کا کوئی وجود نہیں.. دنیا بادی ہے اور اپنے وجود میں قائم اور مادے اور
خلا اور دھرم اور ادھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے.. صرف یہی ایک حقیقت
ہے..

اور شکھیا کیہ منی نے کہا.. خدا ہو یا نہ ہو.. حقیقت مخض یہی ہے کہ دکھ موجود ہیں..
باسٹھ فلسفے او دیا کے باسٹھ گن ہیں.. محبت بے کار ہے.. فلسفہ بے کار ہے.. سب مہا

موہ ہے۔۔ سب مایا ہے۔۔ سب دھوکہ ہے۔۔ شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود۔۔ ہر شے خلا غیر حقیقی ہے۔۔ پھر یہاں خواہشوں کا گزر کہاں؟۔۔ کون تمنا کرے گا اور کس چیز کی؟۔۔ کسی چیز کا کسی چیز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔۔ ہر شے اپنا لحاتی وجود خود ہے۔۔ اور شاید منی نے کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں۔۔ حالانکہ ہم اضافیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔۔

ہر شے تکلیف ہے۔۔ سروم دکھم دکھم۔۔ ہر شے فانی ہے۔۔ جسم اور روح دونوں کی کوئی اصلیت نہیں۔۔ روح لازوال نہیں۔۔ محض اس کو تشکیل دینے والے عناصر باقی رہتے ہیں۔۔ روح کا آواگون نہیں محض کرم کا آواگون ہے۔۔ انسان اس طرح دفعتاً بجھ جاتا ہے۔۔ جیسے چراغ کو پھونک مار کر گل کر دیا جائے۔۔ صرف واقعات اور احساسات کا دور تسلسل قائم ہے۔۔ اور رہے گا

پانی کی نثرنی لہریں کنارے تک آ کر لوثی رہیں۔۔ گوتم نے آگ پر سے نظریں ہٹالیں اور ندی کو دیکھا جو کہ بڑے سکون سے رواں دواں تھی۔۔ میں دکھ سہنا چاہتا ہوں۔۔ میں کمزور بننا چاہتا ہوں۔۔ میں اپنی حماقتوں کا نظارہ خود کرونگا۔۔ میں تکلیفیں اٹھاؤں گا۔۔

دل اور دماغ کے رنج اور آزمائشیں۔۔ میں مکتی نہیں چاہتا۔۔ میں مکتی بالکل نہیں چاہتا۔۔ رحم بہت بڑی چیز ہے شاید منی۔۔ لیکن ممکن ہے کہ مجھے خود ہی تم پر بہت ترس آتا ہو۔۔ سوال یہ بھی ہے کہ مقدس شہزادے کہ کون کس پر ترس کھائے گا؟۔۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔ افق پر صبح کا اجالا بکھر نے لگا۔۔ لیکن دھندلکے کی وجہ سے ندی کا دوسرا کنارہ ابھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔۔ اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔۔ اور پانی

میں کود گیا۔۔۔

رات وہ کچھ سویا تھا کچھ جاگا تھا۔۔۔ رات اس نے بڑی بے چینی سے گزرائی تھی
.. پانی سے باہر نکل کر اس نے آشرم کی طرف جانے کی بجائے اس نے گھنے جنگل
کا رخ کیا۔۔ اور ساحل کی ریت پر ایک سمت کو روانہ ہو گیا۔۔۔

.....

ترائی کا راستہ جو شراوتی سے اتر کی طرف جاتا تھا۔۔ اس میں دونوں طرف پیڑ
تھے۔۔ اور اونچے اونچے سرکنڈے اور ڈھاک کے جنگل اور رنگ برنگے پھولوں وا
لی جھاڑیاں میں لمبی دموں اور جھلملاتے پروں والے پرندے سیٹھاں بجاتے تھے
.. اور ادھر ادھر چکر کاٹ کر پھر گھنے جنگلوں میں چھپ جاتے تھے۔۔ دریا اس پھولوں
کے جنگل میں سے لہراتا ہوا گزرتا تھا۔۔ اس کے مشرقی کنارے پر گھاٹ تھا۔۔ جہاں
شامی بجزرات کو کنارے پر آن کر لگا تھا

ایودھیا اور اتر کوشل کے علاقے کے حکمران ارجن اور ان کے کا دربار صبح
سویرے کھیدا کے لیے اتر کی طرف کوچ کرنے والے تھے مگر راسی تلاش کرنے وا
لوں نے اطلاع دی تھی کہ ہاتھیوں کے علاقے میں بالکل غیر متوقع بارش شروع
ہو گئی ہے۔۔ بجرے سے اتر کر شامی قافلہ ہاتھیوں۔۔ پالکیوں۔۔ رتھوں اور بیلوں پر
سوار ہو رہا تھا۔۔ جب یہ خبر ملی تو قافلے نے اپنا رخ پھر گھاٹ کی طرف موڑ لیا۔۔ اور
گرو پر و شتم کے آشرم سے چند میل کے فاصلے پر مہوا کے جھنڈ میں خیمے لگ گئے۔۔
آنا نانا جنگل میں منگل ہو گیا۔۔ باغ جہاں صرف ہرنوں کی ڈاروں اور
مرغابیوں اور موروں کی عمل داری تھی۔۔ اور جہاں کبھی اکا دکا طالب علم مرا تے ہیں

غرق کسی پگھلنے پر سے گزرتا نظر آ جاتا تھا۔ وہاں پل کی پل میں میلہ سا لگ گیا
 ... شراوتی کے سنار اور بزاز اپنی دکانیں شہزادیوں کی خدمت میں حاضر کرنے
 کے لیے اٹھالائے۔ پھول والوں نے تازہ کلیوں کے انبار لگا دیے۔ بھانٹوں نے
 اپنا ڈیرا جمایا۔ اور لہک لہک کر قصیدے گانے لگے۔ بخاروں کی ٹولیاں۔ طوطے۔
 مینائیں۔ پالتو بندر اور موتی منکے خچروں اور بیلوں پر لاد کر اس امید میں آ کر دور
 کھڑی ہو گئیں کہ شاید کوئی راجہ ہماری طوطا خرید لے۔ کئی مصور اور سنگ تراش اپنا
 اپنا سامان لے کر فروخت کرنے کی نیت سے آن موجود ہوئے۔ بٹ اور بازیگر
 اپنے کرتب دکھلانے لگے۔ رات کو مشعلوں اور الاؤ کی روشنی سے جنگل کی چڑیاں
 جگ اٹھتیں اور خوب شور مچاتیں۔

شامی قافلے کی لڑکیاں دن بھر باغوں میں گھومتیں۔ اندھیرا پڑے ندی میں جا
 کر تیرتیں۔ کبھی دن میں تیر کمان لے کر ہرنوں کا شکار کرتیں۔ ورنہ پھر کیموں کے
 نیچے یا درختوں پر بیٹھ کر کہیں ہانکتیں۔

دو تین دن کے اندر ہی چمپک کا اس بے مصرف زندگی سے جی اکتا گیا۔ وہ
 بخاروں سے ان کے موتی۔ بزازوں سے ان کے ریشم۔ چینی اور چمنے۔ سناروں
 سے ان کے گہنے اور مصوروں سے ان کی تصویریں خرید چکی تھی۔ کسی سائل کو لوٹانا
 اس کے بس کا کام نہیں تھا۔ دکانداروں سے اس نے بیکار کی چیزیں بھی خرید لی
 تھیں۔ کہ کہیں ان کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ وہ لوگوں سے ان کی بیوقوفی کی باتیں سنتی
 رہتی تھی اور کبھی ان سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ آپ لوگ سب کے سب عموماً کس قدر
 گدھے ہیں۔ لوگ اسے اپنی اپنی کتھائیں سناتے تھے۔ ہر انسان اس سے

ہمدردی کا خواہاں تھا۔ کیونکہ سارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑی گنی ہے۔ بڑی نیک
دل ہے بڑی فیاض ہے۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ دنیا بھر کی باتیں اس کے لیے مشہور
رہیں اور اسے ہنسی آتی تھی۔

تین دن جنگل میں رہ کر اس کا دل مسلسل اس سیر و شکار سے گھبرا گیا۔ اس نے
ز ملا کو ساتھ لیا۔ اور چپکے سے آبادی کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ سامنے آم کا گھنا
جھرمٹ تھا۔ یہاں بڑا سکون تھا۔ اور خنکی۔۔۔ آسمان پر جھٹ پٹے کے قرمزی رنگ
بکھر گئے تھے اور باغ میں رہٹ چل رہا تھا۔

آواہر چلیں جدھر سے گانے کی آواز آرہی ہے
ز ملانے کان لگا کر کچھ سنتے ہوئے تجویز کیا
چلو یوں سب راستے ایک جیسے ہیں۔ جمپک نے کہا
وہ بچوں کو روندتی آم کے جھرمٹ کی اور بڑھتی رہیں۔ درختوں کی شاخوں
میں سے دور کسی اثرم کے جھونپڑے نظر آرہے تھے۔
یہ کون جگہ ہے۔ جمپک نے کدم کی ایک شاخ پر ہاتھ رکھ کر ٹھٹھکتے ہوئے کہا۔
یہ سامنے کون لڑکے ہیں۔ ز مال نے بے ساختہ سوال کیا
ہر جگہ برہمچاری لباس والے لڑکے دیکھ کر اسے اپنا بھائی یاد آ جاتا تھا

.....۸

گوتم نیلمر تین دن اور تین راتیں مستقل بھوکا پیاسا ندی کے کنارے کنارے
اوہر اوہر گھومتا رہا۔ رات کے وقت وہ گھنٹوں ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا
رہا۔ پھر ریت پر بول کے کانٹے بچھا کر ان پر سویا

ایک دن سارا اس نے چیونٹیوں کو آنا کھلانے میں صرف کیا.. جو کہ وہ ملاحوں
سے مانگ کر لایا تھا.. پہروں اس نے آنکھیں بند کر کے منتظر پڑھے
لیکن چوتھے روز وہ اس قدر جھنجھلایا کہ اس نے والپسی کی ٹھان لی
شام پڑے وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا آشرم کی کوچانے والی سڑک پر چل رہا
تھا کہ اس نے کسی نے پیچھے سے آواز دی
اس نے مڑ کر دیکھا.. کلش اس کی سمت ہنستا ہوا آ رہا تھا
بھائی گوتم.... تم تین دن سے کہاں غائب تھے.. سارے میں تمہاری ڈھنڈیا
مچی ہوئی ہے..

میں تو یہیں تھا.. تم یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو...؟ گوتم نے سکون سے پوچھا

وہی جو کہ تم کر رہے ہو.. کلش نے خوش دلی سے جواب دیا..
میں تو بھگوان کی لیا دیکھ رہا ہوں..
میرا بھی ان دنوں یہی مشغلہ ہے

آشرم میں سب خیریت ہے.. گوتم نے یونہی بات جاری رکھنے کے لیے
پوچھا.. اس وقت اسے احساس ہوا کہ ہری شکر ٹھیک کہتا تھا.. الفاظ بیکار ہیں
ہاں تم اس طرح خیریت پوچھتے ہو جیسے برسوں کے بعد لوٹے ہو... وہاں تو یہ
خبراڑ گئی ہے.. کہ تم پتھروں کے لیے اندھیرے جنگلوں میں چلے گئے.. اب کبھی نہ
لوٹو گے

مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے.. گوتم نے دفعتاً کہا.. چلو سامنے پڑاؤ ہے.. وہاں

سے لے کر دکھنا لے لیں۔۔

میں دیکھتا ہوں تم کسی اور چکر میں یہاں آئے تھے۔۔

کیسا چکر۔۔ گوتم نے سادگی سے پوچھا۔۔ وہ بھوک کی وجہ سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔۔

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہو گئے کہ پیلا اتنا سعادت مند نکلا۔۔ کلش نے پھر خوش دلی سے کہا۔۔

گرو یہ معلوم کر کے بہت خوش ہو گئے۔۔ کہ پیلا اتنا سعادت مند نکلا۔۔ کلش نے پھر خوش دلی سے کہا۔۔۔۔

گرو کو تو خوش ہونا چاہیے۔۔ تین دن تین راتیں میں نے بھگوان کی لیا کا نظارہ کیا۔۔ گوتم نے معصومیت سے جواب دیا

بھگوان کی لیا کی ایک جھلک تو کل میں نے بھی دیکھی۔۔ تیر مان لیے ایک ہرن کے پیچھے

بھاگ رہی تھی۔۔ مجھے آتا دیکھ کر فوراً درخت پر چڑھ گئی۔۔

گوتم کو سمجھ میں نہ آیا کہا کلش کیا کہہ رہا ہے۔۔ وہ اواسیسا کلش کی بشارت شکل دیکھتا رہا۔۔

املاس کے پتے ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور پگڈنڈی پر آ کر ان کے چاروں اور گر گئے۔۔

ہر طرف خوبصورت درختوں پر زرد اور سرخ پتوں نے آگ ایسی لگا رکھی تھی۔۔ سارا باغ شام کی مختلف روشنیوں سے جھلملہا رہا تھا۔۔

بن دیوی... بن دیوی دور جھر مٹ میں کوئی بھیجن گاتا ہوا جا رہا تھا... بن دیوی
تھوڑے جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہو..

کبھی ہمارے گاؤں میں آو..

کیا تمہیں آدمیوں سے ڈر لگتا ہے..؟

گوتم اور کلش ہوا کی مدھم خوشبو حلق میں اتارتے گھاس پر چلتے رہے...

جب گنیوں کے ڈکرانے کا جھینگر جواب دیتا ہے اور گھنٹیاں بجتی ہیں.. اس

سے بن دیوی ہرے کنجوں میں رقصاں ہوتی ہے..

طالب علم بھیجن گاتا ہوا جھر مٹ میں غائب ہو گیا..

بن دیوی..... کبھی اس کی جھلک دکھلائی پڑ جاتی ہے....

جیسے بہت دور گائیں چر رہی ہوں

یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہوا

رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے...

جیسے کہیں دور گائیں چر رہی ہوں..

یا درختوں میں کوئی گھر چھپا کھڑا ہو...

رات کو بن دیوی کی آواز ایسی آتی ہے..

جیسے کہیں دور بیل گاڑیاں گزرتی ہوں...

جیسے کوئی اپنی گنیوں کو پکارے

جیسے درخت گرے....

یا بہت دور کوئی چپکے چپکے روتا ہو..

بن دیوی جو کہ جنگلی پھول کھا کر جیتی ہے... جو جہاں جی چاہے ٹھہر کر آرام کرتی ہے..

جو مہکتی ہے... جو سارے جنگل کی ماں ہے۔

گوتم اور اکلش گاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے... کچھ فاصلے پر بانسری بجاتے ہوئے لڑکوں کی ایک ٹولی آبادی کی اور جاری تھی... آج زراعت کی دیوی سینتا اور کھیتوں کے خدا کھیشتر پتی کی عبادت کا تہوار تھا.. گاؤں میں بڑی چہل پہل تھی

....

بالآخر گوتم تھک کر ایک درخت کے نیچے ٹھٹک گیا..

ایک طرف دیویاں ہیں.. دوسری طرف اپسرائیں اور درختوں کی پریاں.. دونوں وقت ملتے ان درختوں کے سائے میں کھڑے نہ ہونا.. اکلش نے اسی طرح مصنوعی سنجیدگی سے کہا

کیونکہ درختوں کی پریاں انسانوں کو ورغلا کے لے جاتی ہیں.. دیکھنا کسی اور پا ٹلی پتر کی بنیادیں نہ پڑ جائے

ارے یہ سامنے کون کھڑا ہے.. گوتم نے یکدخت ہڑ بڑا کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

کون.. اکلش نے کہا.. مہا باہرت کے کوئی نے پوچھا.. ہے تو کون ہے جو کہ کد م کے درخت کی ٹہنی جھکائے ہے..؟ دیوتا ہے اے یکشی یا اپسرا؟ درختوں کے اسرار بہت گہرے ہیں گوتم بھائی.....

کیسے درخت؟

گوتم تم بھولتے ہو کہ ہمیں لڑکیوں پر نظر نہ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اکلش
نے دفعتاً سنجیدہ ہوتے ہوئے جواب دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک درخت کی
اوٹ میں چلا گیا

گوتم نے چونک کر دوبارہ سامنے دیکھا
کدم کے نیچے اجودھیا کے گھاٹ والی لڑکی کھڑی تھی

.....۹

چمپک نے گوتم کو نہیں دیکھا۔ وہ نرملا سے باتیں کرتی ہوئی دوسری پگڈنڈی پر
مرگئی

اکلش ایکل پتھر پر بیٹھ کر دھیان میں مصروف ہو چکا تھا۔ آواز مرم چلیں۔ اس
نے ایک آنکھ کھول کر گوتم کو مخاطب کیا

انہوں نے پھر راستہ طے کرنا شروع کر دیا

گاؤں کے قریب پہنچ کر گوتم رک گیا۔ آشرم میں کچھ کھانے کو ملے گا۔۔۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم بچہ مادہ پرست ہوتے جا رہے ہو۔۔۔

میں پوچھتا ہوں تمہاری مکئی میں چاول ہونگے؟

نہیں آج صبح سے سب لڑکے سیتا کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک روز اور

پھو کے رہ لو

میں دکھشنا لے کر ابھی آتا ہوں

اچھا اکلش چپ ہو گیا مگر جلدی آنا گوتم بھائی۔۔

بھائی اکلش ابھی آیا۔۔

اکلیش سے پیچھا چھڑا کروہ تیزی سے اس سمت روانہ ہو گیا جدھر لڑکیاں گئی
تھیں۔ جلدی میں کانتوں پر دوڑنے سے اس کے پاؤں بھی زخمی ہو گئے
چمپک پڑاؤ کے نزدیک پہنچی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا
ہے۔ اس نے پٹ کر دیکھا

اس کے سامنے وہ سر جو کو تیر کر پار کرنے والا لڑکا کھڑا تھا جس کی کالی آنکھیں
تھیں اور کھلی رنگت اور جس نے برہمن طالب علموں کا سفید لباس پہن رکھا تھا
مجھے معلوم تھا کہ ایو دھیا والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آج کی
بھیک ادھر سے ہی لے لوں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

تم کہاں پڑھتے ہو؟ چمپک نے پوچھا
ادھر کل پتی گرو پرشوتم کے آشرم میں۔
جنگل میں بن دیوی کا بھیجن تم ہی گارہے تھے
کہہ نہیں سکتا کہ میں کون ہوں اور جو بھیجن گارہا تھا وہ کون ہے

اچھا یہ بات ہے۔۔؟ تو کسی روز مجھ سے بحث کرو چمپک نے تبسم کے ساتھ کہا

..

اس جگہ میں ماتیری اور گارگی کی جانشین بننے کا تمہارا ہی ارادہ ہے۔ وہ فوراً
بحث پر تیرا ہو گیا

ارادہ ایک نہایت فضول لفظ ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ عام طور پر الفاظ
کے معنی نہیں ہوتے۔ تمہارے مضامین کیا ہیں؟

فلسفہ.. اخلاقیات.... اور... پھر گوتم دفعتاً جھنجھلا کر چپ ہو گیا... یہ لڑکی اسے
بیوقوف بناری تھی

تم تصویریں بناتے ہو؟

ہاں.....

میں نے سنا ہے کہ گروپر شوتم کے آشرم کا گوتم نیلمبر تصویریں اچھی بناتا ہے
..تمہاری شکل دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہارا نام ہی گوتم نیلمبر ہو سکتا ہے.. میں انہوں کے
اسرار کی بہت قائل ہوں.. تم ناموں کے اسرار کے قائل نہیں ہو؟

میں وہی ہوں جس کا تم نے شاید چند احمقوں سے ذکر سنا ہو اور تم نے ٹھیک سنا
ہے

تو غالباً تم بھی میری تصویر بناؤ گے.. آج صبح یہاں سے چتر کارائے تھے
میں پر.. تمہا کا ریک ہوں.. صرف تخیل کی بناء پر دل کی آواز سن کر تصویریں
بناتا ہوں

اس نے ذرا فخر سے کہا میری قدر وشوا کر من الوہی مصورتک کو کرنا پڑے گی جو
کہ سب سے بڑا چتر کار ہے

وشوا کر من.... تو تم ملحد نہیں ہو؟ آج کل تو طالب علم پہل اور شاکہ منی کے زیادہ
قائل ہیں

مجھے آنا لا کر دو.. میرا راستہ کھٹا ہوتا ہے.. گوتم نے زرا بگڑ کر کہا.. اس لڑکی کو
دو براہ دیکھنے کے لیے وہ مدتوں گھوما گھوما پھرا تھا اور اب جب کہ وہ اس کے سا
منے تھی تو وہ کھڑا کھڑا اس سے جھڑا کر رہا تھا.. کیونکہ اسے یہ لکھت یہ احساس ہوا کہ

وہ اس کی اپنی چیز تھی اس کے اپنے وجود کا۔ اپنے ذہن اور دل کا ایک حصہ۔ یہاں
دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کسی تکلف۔ غیریت یا حجاب کی گنجائش یا
ضرورت نہ تھی وہ اسے ازل سے جانتا تھا

اس نے دوسری لڑکی پر نظر ڈالی جو کہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم نے
اسے پھر ذرا دھیان سے دیکھا۔ یہ لڑکی ہری شکر کی بہن تھی
چمپک خیمے کے اندر جا کر آنا نکال لائی۔ اور گوتم کے کشکول میں ڈال دیا
اب جاو۔ پھر کبھی آنا۔۔۔ چمپک نے کہا

وہ اسے پر نام کر کے پڑاؤ سے باہر آ گیا۔ اسے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ یہ
دونوں لڑکیاں کون ہیں۔ اور راجن کے ادا شکر سے ان کا کیا تعلق ہے۔ خیموں کے
آس پاس ناکی طرح کی بہت سی لڑکیاں گھوم رہی تھیں۔ مگر یہ دونوں اس جھوم میں
سب سے علیحدہ اور ممتاز نظر آتی تھیں۔

یہ دونوں کون ہیں۔ اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بڑھیا سے پوچھا جو کہ تیز
تیز قدم رکھتی رسوئی کی طرف جا رہی تھی

بڑھیا نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورا۔ تم تو بڑھ چاری نظر آتے ہو۔ اس
نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ پھر تم کو یہ جان کر کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہیے کہ ان میں
سے ایک راج گرو کی بیٹی چمپاوت ہے۔ اور دوسری راج کماری نرمل ہے اور یہ
دونوں راجن کے ساتھ کھیدا کے لیے جا رہی ہیں اور تم آئندہ ادھر نہ آنا۔ آج کل
بہت سے چوراچکے سنیا سیوں کا بھیس بدل کر ٹھگی کرتے پھرتے ہیں۔

کلنی کہیں کی چڑیل۔۔۔ گوتم نے چپکے سے کہا اور آئندہ کی طرف روانہ ہو گیا

دوسرے دن وہ چادر لپیٹ کر پھر پڑاؤ کی سمت چل کھڑا ہوا۔ سارے میں گھوما مگر وہ اسے نظر نہ آئی۔ [راج گھرانے کی لڑکیاں یوں بھی مجمع عام میں سامنے نظر نہ آتی تھیں] ممکن ہے کہ وہ اندر کسی زینت کے شامیانے کے نیچے کسی طوطے کو بیٹھی پڑھا رہی ہو۔ یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ طوطوں کو پڑھانا امیر زادیوں کا مشغلہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہ پالکی میں بیٹھ کر سیر کرنے کے لیے شہر چلی گئی ہو وہ شراوتی کی طرف مڑ گیا۔ جہاں سڑکوں۔ بازاروں اور جھروکوں میں بہت سے چہرے نظر آئے جو کہ ایک جیسے تھے۔ وہ پھر باغ کی سمت لوٹ گیا۔ شاہی خیمے میں کا تک پورنیا کے تہوار کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ان گنت لڑکیاں پھول سنبھالے ساز اٹھائے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ رنگ برنگی ساریاں پہنے ہری شاخوں کے نیچے رقص میں مصروف تھیں۔ ان میں چمپک کون سی ہے۔ اس نے ہڑا کر سوچا۔ کیونکہ اب اسے ہلکا سا شبہ ہوا کہ عورتیں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ ان میں سے چمپک کون ہے۔ اس نے ذرا چنبھے سے ل میں کہا میں یہ ہوں۔ کدم کے درخت کے پیچھے سے کوو کروہ نیچے اتر آئی وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

تم بھی اداس ہو۔۔۔ میں اس اداسی سے اب عاجز آ چکی ہوں۔ کل سے نرملا بھی بہت رنجیدہ ہے۔ آو ہمارے ساتھ ناچو۔

میرا خیال تھا کہ تم میرے ساتھ بحث کرن اچا ہتی تھیں۔

فی الحال تو میرا جی نا چنے کو چاہ رہا ہے

نزل کیوں رنجیدہ ہے۔

اس کا بھائی راج پاٹ چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے۔ کل تمہیں دیکھ کر اسے اپنا
دلارا بھائی یاد آ گیا

آنند نے بھی دنیا ترگ دی تھی یہ راہیں بہت کھٹن ہوتی ہیں۔
ٹھیک کہتے ہو۔۔۔

اس کے بھائی کا نام کیا ہے؟
مہارا جکمار ہری شنکر۔۔۔

اور اس نے دنیا۔۔۔

دنیا کے علاوہ اس نے اور بہت کچھ تیاگ دیا۔ گدھا کہیں کا۔۔۔ چمپک نے گوتم
کی بات کاٹی

گوتم نے اسے دھیان سے دیکھا

سنا ہے آنند نے اپنی چیمتی سندری کو چھوڑ دیا تھا اور وہ بھی سدھا رتھ گوتم کے
ذرا سے کہنے پر

تو پھر تمہارا مطلب۔۔۔؟

میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں لاکھوں سندریاں اور ہوں گی اور لاکھوں آنند
اور ہری شنکر۔۔۔ یہ چکر تو بہت وسیع ہے چمپک رانی

تیاگ کا فلسفہ خود اپنی جگہ ایک اور چکر نہیں؟

اس سندری کو کیا اس بات کا بہت رنج ہے۔ گوتم نے تجاہل عارفانہ سے کام
لیتے ہوئے پوچھا

وہ خاموش رہی۔۔۔

اور اگر آئندہ واپس آجائے تو.... کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی پورا راہت
نہیں بن سکا.. اس کی ارہ کی مشکلیں ابھی باقی ہیں.. وہ بار بار لوٹ آتا ہے.. وہ ابھی
پوری طرح آزاد نہیں ہوا..

یہ تو بہت بڑی خبر ہے.. چمپک نے کہا.. کیونکہ آزادی بڑی بھاری چیز ہے
.. اس سے کہنا کہ کیا وہ بھول گیا.. کہ شاکیہ منی نے مہامتی سے کیا کہا تھا؟
کیا کہا تھا؟ گوتم نے زراچہ کرپو چھا

شاکیہ منی نے کہا تھا.. اے مہامتی جس طرح ٹاکک کے تاج گانے.. وینا
بجانے مصوری اور دوسری کلاؤں کی مہارت بتدریج حاصل ہوتی ہے اسی طرح
ارہت بھی ایک دن میں نہیں بن جاتا ہمارے مہاراج مہار نے بھی تو تیاگ کو ایک
قسم کی کلا سمجھ رکھا ہے

وہ باتیں کرتے کرتے تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئے جو کہ خیمہ گاہ کے عقب میں
تھا.. دور سے آشرم کے جھونپڑے نظر آ رہے تھے.. جن پر پھیلی ہوئی کدو اور لو کی کی
بری بنیلیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں.. لیکن تم کچھ کہنا چاہتے ہو.. کیا بات
ہے؟ چمپک نے سوال کیا

اظہار... اسے محسوس ہوا کہ وہ اظہار نہیں کر سکتا سارے اظہار کا ایک مقصد
ہے جو کہ اظہار سے ماورا ہے.. میں کیا کہنا چاہتا ہوں.. چلو میں تمہیں اپنی تصویریں
دکھاؤں.. اس نے گڑبڑا کر کہا

اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا... اس نے ہنستا ہنستا سے پوچھا
تم سمجھتی ہو کہ میں بالکل نکمناختیل پرست مسخرہ ہوں.. جیسے سب طالب علم ہو

تے ہیں۔ مگر چمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراوتی کا گوتم نیلمبر بہت بڑا چتر
 آچاریہ بن چکا ہے۔ اس نے بچوں کی طرح غصہ سے کہا اور پھر چمپک کو دیکھنے لگا
 کہ شاید وہ خفا ہو گئی اور اب اسے ترکی بتر کی جواب دے گی۔ مگر وہ چپ رہی
 وہ منڈیر پر خاموش بیٹھی رہی۔ کیونکہ اسی طرح آج سے چند سلا پہلے ہری نے
 اس سے کہا تھا۔ تم مجھے نکما اور تنخیل پرست مسخرہ سمجھتی ہو جیسے سب طالب علم ہوتے
 ہیں۔ لیکن ایک روز تم سنو گی چمپا رانی۔ کہ ایودھیا کا مہاراج کمار بہت بڑا ریاضی
 دان بن چکا ہے

اظہار مقصد سے ماورا ہے۔ ویدانت میں آیا ہے۔ کہ آتما کو اپنی خواہشوں کے
 زیر اثر کائنات سراب کی ایسی دکھائی پڑتی ہے۔ جس طرح پیا سے ہرن کوریگستان
 میں ندیاں نظر آتی ہیں۔ اسی مرگ ترشنا نے مجھ کو۔ ہری کو بہت پریشان کیا تھا
 مقصد کیا ہے؟ اصل مقصد کیا ہے۔۔۔ وہ منڈیر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اگر
 تمہارا آئندہ تمہیں کہیں ملے تو اس سے کہ دینا سندری مرگ ترشنا سے بھی آزاد ہو
 چکی ہے اسے فکر نہ کرنا چاہیے

تم۔۔۔۔۔ یہ خبر صحیح ہے کہ دیہار میں جانے والی ہو۔؟
 شاید۔۔۔ کیا حرج ہے؟۔۔۔ یہ تجربی بھی کر دیکھنا چاہیے۔۔۔ سبھارانی نے تو اپنی
 آنکھیں اکا کر دی تھیں۔ کہ دنیا کی ترغیبات سے بچیں
 چمپک تمہاری عمر کتنی ہے؟

کئی سو سال۔۔۔ اتنے سو سال کہ مجھے بھی یاد نہیں رہا۔ اس نے ہنس کر کہا
 چند روز ہوئے میں نے بھائوں سے بھیشم اور راجن کا قصہ سن کر یہ سوچا تھا

..کہ چتر انگد اور الو پی کیسی رہی ہوگی۔

مجھے دیکھ کر تمہیں معلوم ہو گیا...؟ وہ پھر نفی.. اور اسنے کہا...تم تو پر..تما کا ریک

ہو

ہاں

لیکن تم بھولتی ہو کہ ہر فن پارہ نام و ت اور روپ و ت کا امتزاج ہے.. ایک سے کان دوسرے سے آنکھ آشنا ہوتی ہے...

لیکن جوشے خالص ماہیت ہے.. جس کا ادراک خالی عقل کے ذریعے کیا جاتا ہے.. اسے محسوس نہیں کیا جاسکتا.. ورنہ تم خود اپنے نظریے کی تردید کر رہے ہو
خالص ماہیت صرف ماہیت ہے موزونیت نہیں.. گوتم نے جواب دیا... کسی مادی علامت کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے اسے مادی علامات سے مماثل نہیں سمجھ جاسکتا

آکاش روپم لکھیا.....چمپک نے ہنس کر کہا

خالص ہیئت... گوتم نے جوش سے بولنا شروع کیا.. جو وہی تشریح کرتی ہے خود اس کا وجود نہیں..

تم کیا بنانا چاہتے ہو؟

میں تم کو بتاؤں گا ایک دن ضرور بتاؤں گا کہ میں کیا بنانا چاہتا ہوں.. تم میرے گرو سے نہیں ملو گی؟

نہیں.... میں نے ایودھیا میں اپنے اساتذوں سے تھا پڑھا ہے کہ وہ لوگ مجھے پڑھا پڑھا کر اکتا گئے.. دیکھو تو نرملا کے کتنے مزے ہیں... دن بھر سنگھار پٹاریں

مگن رہتی ہے... ناسمج اور گانا سیکھ چکی ہے... پڑھنے میں اس کا جی نہیں لگتا...

نرملہ تمہاری بہت دوست ہے؟

وہ ہماری اور تمہاری مہاراج کماری ہے

پڑھنا تو اس کا بھی فرض ہے

اس کا فرض ہے کہ اب وہ گھر بسائے... چمپک نے بزرگوں کی طرح کہا... تم بھی تو اپنا برہمچاریہ کا زمانہ ختم کر کے بیاہ ویاہ کر ڈالو گے.....

بیچھے سے چھاگل کی آواز آئی... نرملہ بہت سارے پھول ٹوکری میں اٹھائے مانگی بنے ہوئے پگڈنڈی پر سے آ رہی تھی... گوتم کو دیکھ کر اس نے ٹوکری منڈیر پر رکھ دی... اور ہاتھ جوڑ دیے... گوتم نے برے پہنچے ہوئے اور مقدس برہمن کی طرح اسے آشیر باد دی اور اٹے پاؤں لوٹ گیا...

علاوہ تصویریں اور مجسمے بنانے کے تم ناٹک بھی اچھا کھیل سکتے ہو... چمپک نے بشارت سے کہا اور گوتم کو درختوں میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی

.....*

مبارک ہیں وہ جن کو شامتی میسر آ چکی ہے... چمپک نے دل میں دہرایا اور اسے گوتم سدھارتھ کا وہ وعظ یاد آ گیا جو کہ انہوں نے گیا میں دیا تھا... ساری چیزوں میں... اے پروہت... آگ لگی ہے... آنکھیں آگ میں جلتی ہیں اور اشکال... اور بصیرت... حیات... وفور شوق... آوازیں... خوشبوئیں... ذہن و دماغ... جسم... تصورات... سب دھڑ دھڑ آگ میں جل رہے ہیں... اور نفرت اور محبت اور پیدائش اور بڑھاپے اور موت اور رنج و الم اور دکھ اور گریہ زاری اور مایوسی نے اے

پر وہت یہ الود تیار کیا ہے۔۔۔

آشرم کا طالب علم لڑکا واپس جا چکا تھا۔ جنگل پروائی ہوا میں سنسنار رہا تھا۔۔۔ درختوں کے نیچے سے چند بھگوانیاں کشتول سنبھالے اپنی جھونپڑیوں کی طرف واپس جاری تھیں ان کے چہروں پر کس قدر سکون تھا کیونکہ وہ ندی میں داخل ہو چکی تھیں۔۔۔ اس راستے پر چل رہی تھیں جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی۔ کیا میں بھی ندی میں داخل ہو سکوں گی۔۔۔ چمپک نے اوسی سے سوچا۔۔۔ مبارک ہیں وہ۔۔۔ اس نے دل میں دہرایا۔ اس نے پٹ کر خیمہ گاہ پر نظر ڈالی۔۔۔ جہاں جشن کی تیاریاں کی ارج رہی تھیں۔۔۔ پھر وہ چپکے سے منڈیر سے اتر کر اس پگڈنڈی پر آگئی۔۔۔ جدھر سے گوتم اپنے آشرم کی طرف اور لوٹا تھا۔۔۔ اور جس پر سے گزرتی ہوئی بھگوانیاں ندی کے کنارے اپنی جھونپڑی کی طرف گئی تھیں

چمپک درختوں کی ٹہنیوں کو اپنے سامنے سے ہٹاتی راپتی کی طرف روانہ ہوگئی۔۔۔ سامنے کچھ فاصلے پر کئی تھی۔۔۔ جس پر ترنی کی بیل پھیلی تھی۔۔۔ اور اس میں سے گانے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔۔۔ یہاں اس نے سن رکھا تھا کہ بزرگ ترین راہبہ بمن رہتی ہے۔۔۔ جو کہ کوشل دیس کے ایک راجہ کی بہن تھی اور پچاس سال سے سنیا سن کی اس کئی میں رہتی آئی تھی

شر و اسچی بھگوانیوں اک سب سے بڑا امر کز تھا۔۔۔ اس وقت ان کی ٹولیاں بھیک مانگ کر لوٹ رہی تھیں ان میں ہر ختہ اور ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں۔۔۔ چمپک حیرت اور اچنبھے سے ایک طرف کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔۔۔ انہوں نے کام لوک فتح کر لیا ہے اور برہم لوک میں داخل ہو چکی ہیں۔۔۔ کیا میں بھی کبھی کام لوک فتح کر

سکوں گی... اسے گوتم نیلمبر کی بات یاد آئی.. اسے بری شکر کا خیال آیا.. جو کہ برسوں سے اس کے دل میں رہتا تھا.. ان بھگونیوں نے کام لوک کس طرح تسخیر کیا.. وہ سوچتی رہی مگر اس کی ہمت نہ پڑی.. کہ ان کے قریب جا کر ان سے بات کرے.. وہ جو رتا رہنا رسی سا بھی اور سونے کے زیورات سے مزین تھی.. وہ جو جی بھر کر راگ اور رنگ کی دنیا سے محظوظ ہوتی تھی.. حیات کی کنیز جو جب سے اس لڑکے سے باتیں کر کے آئی تھی جی جی جی میں ایک نامعلوم سی خوشی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی وہ ایسی حقیر بندی... ان اونچی.. پوتر.. دیو بالاؤں سے کیا بات کر سکتی تھی...؟

بہن.... ادھر آؤ... وہاں کا ہے کوکھڑی ہو... ان میں سے ایک نے گویا اس کی کشمکش کو بھانپ لیا.. ادھر آؤ... ہمارے سنگ بیٹھو.. ایک بھگونی نے قریب آ کر بڑی شفقت سے اسے کہا..

میں..... دیوی سمن سے مل سکتی ہوں....؟

ہاں کیوں نہیں... بہن سمن تو تمہاری ہی راہ دیکھ رہی ہیں

ڈرتے ڈرتے چمپک اس نوجوان بھگونی کے ساتھ کئی میں داخل ہوئی

سامنے سمن بیٹھی تھی.. جوش عقیدت سے چمپک کا گلہ رندھ گیا.. اور اس کو اپنے جسم میں جھنناہٹ ایسی محسوس ہوئی.. سری کرشن کی پجاریں چمپک کسی خدا کو نہ ماننے والی راہبہ سمن کے آگے جھک گئی..

باہر اندھیرا چھا رہا تھا.. سمن ان سب سے الگ مرگ چھالے پر بیٹھی تان پورہ بجا بجا کر گار رہی تھی....

یہ گانا راہبہ چٹانے راج گیر کی چوٹیوں پر گایا تھا..

گو کہ میں کمزور اور دکھی ہوں اور میری جوانی ختم ہو چکی ہے
اور میں لاٹھی کے سہارے پیاز پر چڑھی ہوں۔ اور میری چادر میرے کندھے
سے لٹکی ہے۔

اور میرا کاسہ الٹا ہے۔

چٹان کے سہارے کھڑے ہو کر میں نے اپنی خودی کو سہارا دیا ہے۔
اور آزاوی کی ہوا میرے چاروں اور منڈا رہی ہے
بدھ کی خواہش پوری ہوئی

چمپک کٹی کی دہلیز میں بیٹھی رہی۔ بھگوانیاں گاہی تھیں۔۔۔ بھگوانیاں نے
طے کر لیا کہ وہ اپنی بناری سارھی سیہیں پھینک کر اور کیسری دھوتی لپیٹ کر ان سے
آن ملے گی ان لوگوں کے اور اس کے درمیان مغائرت کی جو دیورا کھڑی ہے اس
کو وہ اپنے اس لباس اور اس زندگی کے ساتھ کبھی بھی غبور نہیں کر سکتی۔
مجھے کچھ گوتھی کے بارے میں بتاؤ۔۔۔۔۔ کچھ شاکہ منی کے بارے میں۔۔۔ اس
نے ڈرتے ڈرتے سمن سے کہا

سمن خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے چمپک کو ڈر
ساگا۔ ان آنکھوں میں گزرے ہوئے وقت کی چھایا جھلما رہی تھی اور چمپک کو
معلوم تھا کہ سمن کتنی بوڑھی ہے۔ اور چمپک کو وقت سے ڈر لگتا تھا۔

مجھے کچھ اپنے سنگ کے بارے میں بتاؤ۔۔۔۔۔ اس نے ہڑبڑا کر دوبارہ کہا
سمن اٹھارہ برس کی عمر میں اپنا راج گھرانہ تاج کر سنگھ میں شامل ہوئی۔ وہ بیس
سال کی تھی جب شاکہ منی نے مہارپی نروان حاصل کیا۔ اس کو گئے اسی سال ہو

چکے تھے.. اٹھارہ برس کی عمر میں راج کماری سمن کے حسن کی شہرت دور دور تک پھیلی تھی.. اب ایک اٹھانوے سالہ بوڑھیا پھونس گھیر و لباس پہنے اس کے سامنے بیٹھی تھی.... دنیا تج کر بھی اسے کیا ملا تھا؟ چمپک کے دل میں کسی چور نے پوچھا.. اگر میں نے دنیا چھوڑ دی تو مجھے شانتی مل جائے گی؟ اور اگر یہاں بھی شانتی نہ ملی تو..؟ اس نے آنکھیں بند کر لیں.. پھر اس نے آہستہ سے سمن کی ساری کے کنارے کو چھوا.. سمن گزرتے ہوئے وقت کی گواہ.. شکوہ منیکے قدموں میں بیٹھ چکی تھی.. جیت وون و بیمار کی گندھ کٹی معطر کمرہ جس میں مہا تما بدھ رہتے تھے.. میں داخل ہو چکی تھی.. کنڈل کیشی سے مباحثے کر چکی تھی.. چمپک نے اس کی ساری کے کنارے کو چھوا اور اسے محسوس ہوا.. جیسے اس لمس کے ذریعے وہ شکوہ منی تک بھی پہنچ گئی ہے.. اور اس احساس سے اسے ایک لمحے کے لیے بڑا سکون ملا.....

روہنی ندی کے کنارے شکوہ منی کا وعظ سننے کے بعد ملک کے پانچ سوامراء نے دنیا تیاگ دی تھی.. ان کی بیبیاں شکوہ منی کی خالہ اور سوتیلی ماں پجپتی کے پاس آئیں.. جنہوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد رہبانیت اختیار کر لی تھی.. اور انہوں نے پجپتی سے کہا کہ ہم بھی ترک عالق کے خواہش مند ہیں.. شکوہ منی نے ان کا سگھ قائم کیا.. اور شہزادیاں اور گزہستیں اور ہر طبقے اور ہر عمر کی لڑکی بھگوانی بننے لگی.. ان کے نگوں سے جنگل اور وادیاں گونج اٹھیں.. وہ گرو کی چیلی بن کر بعد میں خود گرو بنیں.. دوسروں کو پڑھاتیں.. دھرم کا پرچار کرتی تھیں.. علمی مباحثوں میں حصہ لیتی تھیں.. پنا جو کہ پہلے چند رہاگ ندی کے کنارے پیدا ہوئی تھی.. اور جس نے اب کے سے شرواتی کے ایک امیر گھرانے میں جنم لیا تھا.. اور

جس نے جونی ہی میں ارہت کا درجہ حاصل کیا۔ اور دبیر اور بھدرا اور ابھی روپ
 نندا جسے اپنے حسن پر بڑا ناتھا۔ اور بنارس کی ویشیا اور دھاکاشی اور اتما جو کہ پہلے جنم
 میں داسی تھیں۔ اور دوسرے جنم میں شرواستی کے ایک سٹھھی کے یہاں پیدا ہوئی اور
 راجہ جہیم بسیرا کے پروہت کی لڑکی سوما جو کہ جیتون کے نیم تاریک کنج میں بیٹھی
 تھی۔ اور.... مارا.... [ابلیس] نے... ہوا میں نمودار ہو کر اسے مخاطب کیا۔ کہ او
 عورت جس کے پاس صرف دو انگلیوں کا احساس ہے۔ تو اس میدان کو خیر نہیں کر
 سکتی جس پر بڑے بڑے رشی منی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ [کیونکہ عورت جو کہ
 سات آٹھ سال کی عمر سے رسوئی میں چاول ابالنا شروع کرتی ہے اور سارے
 وقت یہ دیکھنے کے لیے کہ چاول گئے ہیں یا کہ نہیں انہیں ڈوئی سے نکال نکال کر
 اپنی دو انگلیوں کی مدد سے مسل مسل کران کی کنی دیکھتی ہے] پر سومانے مارا کو مار
 بھگایا۔ اور ارہت بن گئی اور ویشالی کی طوائف ملا اور ویشالی کے سپہ سالار کی لڑکی
 سہا جس نے گایا.... میں جسے چیزوں کا... کیا۔ کیوں بہت ستاتا تھا۔ اور گزرتے
 وقتوں کی یاد بہت تنگ کرتی تھی۔ میں نے خود کشی کی ٹھانی۔ تاکہ پھر سے اس
 دنیا میں ذلیل زندہ رہوں۔ مگر مجھے راستہ مل گیا اور بدھ کی خواہش پوری ہوئی۔ اور
 شرواستی کی برہمن زادی ملنا اور ویشالی کی رقاصہ مہاپالی اور ہنس وتی شہر کی سندری
 نندا اور راج گیر کی منہرے بالوں والی کنڈل کیشی جو کہ ایک ڈاکو کے عشق میں دل
 شکستہ ہو کر پہلے جین سنیا سن بنی اور جو کہ سید کی ٹہنی ہاتھ میں لے لے کہ گاؤں
 گاؤں لٹکارتی پھرتی تھی۔ کہ کوئی ہے کہ جو آن کر بحث میں مجھے ہرائے۔ اور چندا
 اور راج گیر کی ملکہ کھیم جو کہ اپنے حسن پر بڑی مغرور تھی۔ اور جس نے بانس کے

جھنڈ میں پہلی بار شکوہ منی کو دیکھا اور خوبصورت امیر زادی انوپم اور مہارانی کھیم
کی پہلی وجہ اور سہارا تھی... آم کے باغ میں ایک نوجوان نے ان پر ڈورے ڈالنے
چاہے تھے تو جنہوں نے اپنی آنکھیں نکال لی تھیں

یہ سب اب دوبارہ پیدا نہیں ہوگی کیونکہ انہوں نے ارہت کا درجہ حاصل کر لیا
تھا... یہ سبندی میں داخل ہو چکی تھیں.... باہر کوئی اسے آواز دے رہا تھا...

وہ کئی سے نکلی... خواہشیں اور ہرکارے اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آنے
پہنچے تھے کیونکہ جشن کے لیے خیموں میں اس کا انتظار کیا جا رہا تھا...

عورتوں کے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے... سو سال قبل یہیں شروعاتی میں
ایک اہم سوال کیا گیا تھا....

ان کی طرف دیکھنا بھی نہیں آئند.... جواب ملا تھا

لیکن فرض کیجیے وہ نظر ہی آجائیں

ان سے بات مت کرنا

لیکن اگر وہ خود سے بات کرنے لگیں تو....؟

برابر جاگتے رہنا....

کئی راتوں تک متواتر جاگتے رہنے کے بعد دفعتاً گوتم کو نیند کا زور دار جھونکا
آگیا لیکن کوشش کر کے اس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں

طالب علمی کے زمانے میں جب وہ آشرم میں یا کتب خانوں میں مختلف
کتابیں پڑھتا تو عجیب و غریب متضاد نظریے عورتوں کے متعلق اس کے مطالعے
میں آتے... مہابھارت کی بارہویں کتاب میں لکھا تھا کہ عورت کبھی غیر مقدس ہو

ہی نہیں سکتی... لیکن تیرہویں کتاب کا بیان تھا کہ عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے.. اس کی طبیعت میں اوچھا پن ہے.. اسور یہ کہ اچھے گھرانوں کی خواتین طوائفوں کے ملبوسات اور گہنے پاتوں کو رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں.. ساور چونکہ سارا شر پیدائش کی وجہ سے ہی ظہور میں آتا ہے.. اور عورت پیدا کرنے والی ہے لہذا عورت ہی دنیا کے سارے شر کی ذمہ دار ہے.... اور یہ عورت صرف محبت کی بھوک کی ہے.. اور سخت ناقابل اعتبار

لیکن اسی صحیفے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ان سب کمزوریوں کی باوجود عورت کی عزت کرنا چاہیے.. ساتھ ہی ساتھ عورت کو دیوی کا درجہ حاصل تھا.. اس کی وفاداری.. شرافت.. شرم و حیا کی رشی منی قسمیں کھاتے تھے.. لیکن شروعاتی کی ویشائیں اور ٹانگ میں اداکاری کرنے والی ٹانگائیں اور سیاسی خدمات انجام دینے والی جاسوس عورتیں اور روش کینڈائیں بھی تو عورتیں ہی تھیں

اور روشی نے اپنے چاہنے والوں سے کہا تھا کیوں اپنی اتن کے پیچھے ہاتھ دھوکو پڑے ہو... خود کو بھیڑیوں کے پنجوں سے بچاؤ...

عورتوں سے دوستی رکھنا ناممکن ہے کیونکہ ان کے دل بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں...

اور دوسری طرف گندھاری تھی... جس نے اپنے اندھے مغلتر کی خاطر خود بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی اور انو سیا اس قدر وفا شعار تھی کہ اپنے بچے کو خود اپنی سوتن کے گھر پہنچانے کے لیے گئی تھی اور کہیں پر یہ بھی لکھا تھا کہ بچی ورتا عورت کے لیے دوسرے آدمی سمائے کے سامان ہیں.. اور منو مہاراج نے کہا تھا کہ جس جگہ

عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتا خوشی سے رہتے ہیں

لیکن شکیمہ منی نے کہا تھا... عورت بیوقوف ہوتی ہے آنند... عورت حاسد ہوتی ہے آنند... عورت بد باطن ہوتی ہے آنند... عورت سے بچو... عورت سے بچو ماری... بڑتی ہے... مجسمہ شہر

ایک مرتبہ شکیمہ منی اپنے بارہ سو چیلوں سمیت اسی جیت ون میں موجود تھے جو کہ جھیل کے اس پار نظر آ رہا تھا... اور راجہ پر سین جیت نے ان کی دعوت کی تھی.... اور آنند جو کہ کہیں باہر گیا تھا... اس دعوت میں نہ پہنچ سکا تھا

خوبصورت آنند نے اپنا کٹھول اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح سوچ میں ڈوبا شہر میں بھیک مانگنے کے لیے نکل گیا... اس کے لیے کشتری اور چنڈال سب برابر تھے... اور اسے اپنی نیک نامی کا بڑا خیال تھا... اور بڑے وقار کے ساتھ اس نے شہر کی پناہ کی خندق عبور کی، اور شرواستی کے پھاٹک میں داخل ہوا... اور بھیک مانگتے مانگتے ایک مشہور رقصہ کے دروازے پر پہنچا... اور رقصہ کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی اور اس نے ایسا جادو ڈالا کہ بچارہ آنند دکھشنا لینا بھول کر سیدھے اس کے گھر میں داخل ہو گیا

اور شاہی محل کے ایوان ضیافت میں بیٹھے بیٹھے شکیمہ منی کو علم ہوا کہ آنند بڑی آفت میں مبتلا ہے اور انہوں نے دوسرے چیلے کو اس کی دنگیری کے لیے روانہ کیا اور شکیمہ منی نے آنند سے کہا... میں اپنے پری نروان کے بعد چاہتا ہوں کہ تم سب میرے خاص چیلے... بودھی ستو... مہاستو اور ارہت... مکمل نجات حاصل کرنے کی بجائے آخری کلیوں میں دوبارہ پیدا ہونا منظور کر لو... تم طالب علموں... عام

آدمیوں... بادشاہوں... وزیروں... امیروں... برہمچاریوں جملہ طوائفوں اور بیواؤں اور بد معاشوں... اور چوروں اور قصابوں اور بساطیوں کی صورت میں جنم لو... تاکہ تم ہر طبقے کے انسانوں میں گھل مل کر انہیں ملتی کا راستہ دکھلا سکو... صرف مرتے وقت اپنی اصلیت ظاہر کرنا ورنہ بدعتی تمہیں ورغلائیں گے...

اگر کوئی چیلا اپنے پہلے کلپ کی عادتوں کو ترک نہ کر سکا تو تم اس پر وہ اسرار منکشف کرنا جو کہ مجھ پر بودھی درکت کے نیچے کنول کے پھولوں کے درمیاں ظاہر ہوئے تھے

آنند ابھی جب اس لڑکی نے تم کو بہکایا یہ شخص اس جنم یا اس کلپ کا اتفاقی حادثہ نہ تھا... کئی کلیوں سے تم اس کی کشش میں مبتلا ہو... لیکن وہ پچھلے کلیوں کا بندھن اب ٹوٹ چکا ہے تم اور وہ اب آزاد ہو...

آزادی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کون آزاد ہے اور کون نہیں؟ گوتم نے اپنے آپ سے سوال کیا... ہری شنکر تم کو آزادی کی تلاش میں کیا ملا؟ آنند جو اسرار تم پر منکشف ہوئے وہ تمہارے سوا کون جانے گا؟ ہم سب اپنے اپنے اسرار میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتے

شامی خیمہ گاہ کی جانب سے جھانچھ اور شہنائی کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو چکی تھیں... کبھی کبھی گھنگھروں کی جھنکار سنائی دی جاتی تھی... چودھویں تاریخ کا چاند ڈولتا ڈولتا آشرم کے اوپر آگیا... اور اس کے اجالے میں پھلوں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے انتہائی پرسکون نظر آ رہے تھے... اکاد کا چراغ جل رہے تھے... باقی طالب علم سو چکے تھے... صرف اب تک وہی جاگ رہا تھا

جانے اس سے راجن کے پڑاؤ پر کیا ہو رہا ہوگا؟ روشنی.. موسیقی.. اور رقص
.. اس نے اپنے ذہن میں چمپک کے تصور کو انہی تین چیزوں سے وابستہ کر رکھا تھا
روشنی.. موسیقی.. اور رقص

وہ آہستہ سے اٹھا اور کاندھے پر چادر اچھی طرح لپیٹ کر بے پاؤں آشرم
سے باہر نکلا اور مہوا کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا.. اس سے وہ بڑی بھاری چوری کر
رہا تھا.. اور اس چوری پر شدت سے مسرور تھا.. اس کا سایہ زمین پر اس کے پیچھے
پچھے چلتا رہا.. اس کے پیروں کے نیچے خشک پتیاں زور زور سے کھڑکھڑاہی تھیں
.. ایک گلہری اس کی آہٹ پر چونک کر تیزی سے بھاگی.. ادھر ادھر دیکھتا ہوا کہ کوئی
اسے پہچان نہ لے.. وہ دھیرے دھیرے سے مہوے کے باغ میں داخل ہوا
.. جہاں مشعلوں کی روشنی تیز ہو رہی تھی.. وسط میں منڈپ ایسا بنا تھا جس کے ایک
جانب سنگیت کار لڑکیاں سر منڈل اور چھتارے اور جھانچھ لیے بیٹھی تھیں.. راج
گھرانے کے مرد اور عورتیں چاروں اور جمع ہنسنے بولنے میں منہمک تھے ایو دھیا کے
لوگ رقص اور موسیقی میں اپنی مہارت کی وجہ سے سارے دیس میں مشہور تھے
.. اس مجمعے میں ہر شخص کلاؤنٹ جان پڑتا تھا..

دفعتاً گوتم کی نظر اس بوڑھی خادمہ پر پڑی.. جس نے کل اسے ڈانٹا تھا.. وہ ذرا
گھبرا کر ایک خیمے کی آڑ میں ہو گیا.. اگر کوئی اسے اس سے دیکھ لے تو کیا ہو.. وہ گوتم
نیلیم آشرم کا سب سے سعادت مند اور قابل طالب علم.. مشہور لیکھک اور چتر کار..
برہمچاری.. اس سے چوروں اور آوارہ گردوں کی طرح ایک خیمے کے پیچھے چھپا
لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھ رہا تھا

ناچ.... ناچ.... ناچ

چھایا پتہ کھکشاں.. پر اپسرائیں ناچ رہی تھیں.. مرگ گھٹ میں کالی رقصاں
 ہے.. دل کے سنہرے ایوانوں میں شیونا چتا ہے.. اور گولہ میں نور گرد دھاری....
 کیلاش پر اومانا چتی ہے.. اور یہاں راپتی کے کنارے.. مہوا کے جھر مٹ میں...
 خزاں کے چاند تلے وہ ناچ رہی ہے.. جسے کوئی کماری چمپک کہتا ہے.. کوئی چمپارا
 نی.. کوئی چمپاوتی.. اس کے ہزاروں نام ہو سکتے ہیں کیونکہ اس کے ان گنت روپ
 ہیں... اس کی اداسی.. اس کی ہنسی... اس کی مسکراہٹ.. اس کا دکھ.. اس کا ویراگ..
 اس کی مسرت.. اس کی نفرت.. یہ ایسے بھاواور ایسے رس ہیں جنہیں بھرت منی بھی
 نہیں سمجھ سکتے... کسی شلپ شاستر میں اس ناچ کا ذکر نہیں.. جو کہ میں نے اپنے دل
 کی آنکھوں سے دیکھا.. کسی نند کشور.. کسی بھرت منی نے اپنی کتابوں میں اس کی
 مدراوں کا تذکرہ نہیں کیا.. اس ناچ کے قوانین نہیں بنائے.... یہ بڑی انوکھی راس
 لیا ہے.. یہ بڑا اتم شرنکاروں ہے.. لڑکیاں سازوں پر چھایا راگ الاپ رہی ہیں
 .. سبز طوطے پر سوار کام دیو اپنا پھولوں کا بان چلاتا ہے... اور پراکراتی مایا بن جاتی
 ہے.. شوکی تیسری آنکھ کے شعلے نے کا دیو کو جلا کر بھسم کر دیا تھا.. لیکن کام دیو تو انگ
 ہے.. انسانوں کے دلوں میں موجود ہے.... شیوا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا

اور وہ اس طرح ناچ رہی ہے مانو پاروتی نے وہی اوشا کی بجائے اسی کو بھرت
 ناٹیم کی تعلیم دی تھی.. رقصاں شہزادے ارجن نے آسام کی چتر نگدا اور دکھشن کی
 راجکماری اترا کی جگہ اس کو اپنا شاگرد بنایا تھا.. وہ جو سفید ساری پہنے کمدی التسو کا

[illegible]

..بیوی کی تھڈ لیس کرو جو کہ ماں ہے... ماں.... او ماں.... گوری... لکشمی..... جس کا دوسرا
 نام آشا ہے.. جس کا دوسرا نام کملا ہے.. جس کے تصور کی تشکیل کنول کے پھولوں
 نے کی.... وہ چپا کے پھول کی طرح معطر ہے.. وہ ماں ہے... جیسے کہ زمین ماں
 ہے.. جیسے ندی ماں ہے.. ماں الوہی ہے.. عورت الوہی ہے... کیونکہ ماں ہے
 ..چمپک الوہی ہے... اس کی حمد کرو... اس کی عبادت کرو.. اس کے آگے جھک جاو
 ... وہ اس خنک زر و گھاس.. اس ہری زمین کی وہی ہے... ابدی ماں.. اور ابدی
 رفیق.. میری بہت پرانی ساتھی ہے... کیا میں اسکو نہیں جانتا؟

رگ وید میں لکھا ہے کہ میاں بیوی وہ ہیں جو کہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے
 ستاھ بندھے ہوئے ہوں

کیا کبھی ایسا ہوگا کہ اسے دواہ [رتھ] میں بٹھا کر اپنی دلہن کی طرح اپنے گھر
 لے جاؤں گا...؟

.....۱۲.....

مجمع چونک اٹھا... ایک نو جوان خیمے کے پیچھے سے نکلا.. منڈپ میں آکر اس
 نے جھک کر گھنگھرو باندھے.. اور اپنی سفید چادر ایک طرف پھینک کر اندھا ٹڈو
 ناچتا سامنے آگیا...

مجمع مسحور ہو کر اس کا رقص دیکھتا رہا..... لگتا تھا کہ جیسے نٹ راج نے اپنا فن
 اسے خود سکھایا ہے وہ خود ہی نٹ راج ہے

چمپک ناچتے ناچتے رک گئی.. اس نے رقص کو اچنبھے سے دیکھا
 مردنگ زور زور سے بجتی رہی... سندھیا ٹاڈو ناچتا ہوا وہ منڈپ کے وسط میں

آگیا..

اس نے شو کی مانند رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہرے کیے.. اس نے
آٹھوں رس دکھلائے.. یہ وشنو کا سرنگا رس ہے.. یہ اندر کا دیر رس ہے.... یہ یم کا
کرونا ہے... یہ رورا کا رو رس ہے... یہ کال کا بھیا نک رس ہے... یہ گندھرو کا ابھت
رس ہے... یہ شانت رس ہے.... یہ شو کا رقص ہے... اس کی زراوں میں کائنات کا
سارا عمل ارتقاء مضمر ہے... اس کی زبان سارا اظہار ہے.. اس کا لباس چاند اور
ستارے ہیں.. شو جو کہ جسم تان ہے اور مجسم سنگیت.. جو کہ آفاقی لے کا مظہر ہے

مادر کائنات او ماہماتنی کو کیلاش کے سب سے اونچے تخت پر بٹھا کر نٹ راج
اس کی اس مئے ناچتا ہے.. بر سوئی وینا بجا رہی ہے.. اندر بانسری... برہما جھانجھ بجا
تا ہے... لکشمی گاتی ہے... اور وشنو مر دگم بجا رہا ہے.. سارے دیوتا اور گندھرو اور
سدھ اور ودیا دھر آس پاس کھڑے ہیں... یہ شام کا سہ ہے.. سندھیا کا رقص ہے

..

ہچمپک اپنی جگہ سے اٹھی اور ناچتے ہوئے اس کے برابر ہو گئی...

ان دونوں نے مل کر اوتا مانڈا شروع کر دیا.. وہ گوری تھی اور شکر کے ساتھ
رقصاں تھی..

چاندنی کھلے میدانوں پر نغمہ ریز تھی.. اور چاندی کے رنگ کے بال ندی پر تیر
رہے تھے اور چاندی کے رنگ کے سارس پروں میں چونچ چھپائے بالو پر سو رہے
تھے اور کا تک کا پورا چاند پھولوں کے اوپر سے جھانکتا تھا

مگر وہ رات بھی ختم ہوئی.. اور تہوار منانے والوں کا ہنگامہ کم ہوا.. اور ان کے

گیتوں اور گھنگھروں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ اور پوپھٹے سے تک شاہی خیمہ گاہ
پر خاموشی چھا گئی۔۔۔ اور منڈپ میں پھولوں کے چند کجرے اور کلیوں کے سے انبار
بکھرے پڑے رہ گئے

۱۳

صبح ہوئی۔۔ ہالیہ کی چوٹیوں پر دھند تیر رہی تھی۔ تالابوں میں سرخ کنول کھل
گئے تھے۔۔ گاؤں کی سڑک پر جاتی ہوئی گنوانوں کی رنگین گلریاں دھوپ میں جگمگا
رہی تھیں مہوا کے پیلے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی مدھو کر۔۔ شہد کی مکھی۔۔ اس کے کانوں
میں بھنبنھایا کی۔۔ اور جب سورج کی تیز کرنیں اس کے پونوں میں گھسیں تو وہ
آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اور اس نے اپنے آپ کو تالاب کی شکستہ سیڑھیوں پر لیٹا ہوا پایا
۔۔ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا۔۔ وہ کہاں تھا اور یہ سب کیا تھا؟۔۔ اس نے
دماغ پر بہت زور ڈالنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہیں تھا

چمپک۔۔۔۔۔ چمپک۔۔۔۔۔ چمپک

سارے وقت مدھو صرف یہی بھنبنھاتی رہی تھی۔۔ وہ اطمینان سے انگڑائی لے
کراٹھا اور دوسری انگڑائی لے کر پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔۔ دفعتاً اس کی نظر مہوا کے جھنڈ
پر پڑی۔۔ جو کہ سنسان پڑا تھا۔۔ یہ جگہ جہاں ساری دنیا کی رونقیں سمٹ آئی تھیں
۔۔ اس وقت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔۔ ایک ہرن درخت کے پیچھے سے بھاگا۔
چند گلہریاں بیل کے پھل کترتی رہیں۔۔ ہرے طوطوں کی ایک ڈار شاخ پر سے اڑ گئی
۔۔ جنگل خاموش پڑا رہا۔۔ وہ حیران و پریشان وہیں بیٹھا تھا۔ پھر اسے رفتہ رفتہ بہت
دھندلے خواب کی طرح یاد آیا اس جگہ رات بھر پہلے شاہی خیمہ گاہ تھی۔۔ اور اس میں

وہ منڈپ کے نیچے رات گئے تک ناچا تھا۔ وہ سب ناچے تھے اور جب ناچتے ناچتے وہ تھک گیا تھا تو راجن سے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اور اس نے راجن کے ساتھ خوب جی بھر کر مد رانی تھی اور بھنا ہوا ماس کھایا تھا۔ اور روزگار چھتر کے نیچے اٹلسی مسند پر بیٹھا تھا۔ اور اس محفل رنگ و بو میں اس کی نظریں برابر چمپک کی متلاشی تھیں۔ لیکن وہ رقص ختم ہونے کے ساتھ ہی شہزادیوں کے ساتھ زمان خانے کی طرف چلی گئی تھی۔ اور اس کے انتظار میں وہ پو پھٹے سے تک وہاں بیٹھا رہا۔ جب وہ منڈپ سے باہر نکل کر لڑکھڑاتا ہوا آئرم کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس وقت اسے نیند کا جھونکا آیا تھا۔ اور وہ تالاب کے کنارے پڑ کر سو گیا تھا۔ اور صبح کوچ کا نظارہ بجا تھا۔ اور خیمے اٹھا دیے گئے تھے۔ اور جب شاہی قافلہ کھیدا کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت چمپک نو ملا کے ساتھ تالاب کے کنارے سے گزری تھی۔ اور زمان خانے اس سے کہا تھا۔ کیسا انوکھا برہمن ہے۔ پرسوں تم سے چتر کاری کے متعلق بحث کر رہا تھا۔ رات کو نٹ راج کی طرح ناچا۔ اور اس وقت بچوں کی طرح پڑا سوتا ہے۔ جانے سے پہلے آوا سے جگا کر پر نام تو کر لیں۔

چمپک چند لمحوں کے لیے خاموش گمن سم کھڑی رہی تھی اور پھر اس نے جواب دیا تھا۔ نہیں۔ کیونکہ جو چاگتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے۔ اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو کہ مسلسل جاگتے رہتے ہیں اور اب مہوے کے باغ میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا۔ اس ایک رات میں وہ دفعتاً کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دل کی کائنات کی سیاہت کی تھی۔ اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا۔ اور وہ اس تجربے سے غیر مطمئن نہیں تھا۔

لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا جیسے شیوا کی بجائے زندگی کا سارا ہلا بل اس نے خود
پی لیا ہو۔۔ یہ کیسا انوکھا تجربہ تھا۔ اس کی شرط تو اس نے پہل سے نہیں لگانی تھی۔ اور
ہری شکر تو کہیں ہزاروں میل کے فاصلے پر کھڑا رہ گیا تھا

اس کا جی چاہا کہ دوڑتا ہوا جائے۔ اور شاہی قافلے سے جا ملے۔۔ راتین کا
ایک حقیر کھار بن کر ان لوگوں کے ساتھ چلے۔ اس لڑکی کے پیچھے پیچھے افق کے
دوسرے کنارے تک پہنچ جائے

لیکن وہ تو اس سے چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی۔ اس نے اسے قریب آ کر جگایا
تک نہیں

چنانچہ وہ مجھ سے ایک بات کہے بغیر ہی چلی گئی۔ اور ایک لمحے کے لیے اسے
بڑی ظلمانیست محسوس ہوئی۔ اس کا یہ احساس شدید ہو گیا کہ وہ اس سے الگ نہیں۔۔
اس کے وجود میں شامل ہے۔ اسے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو
مجھ سے ہر سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔۔ کہو اس میں تو اپنے آپ کو
دھوکہ دے رہا ہوں۔۔ میں مایا کے فریب میں اچھی طرح مبتلا ہو چکا ہوں۔۔ وہ مجھ
سے الگ ہے۔۔ بہت دور ہے۔۔ بھلا میں کہاں اور وہ کہاں۔۔؟ یہ سب جھوٹ ہے

بہت اچھا۔۔ اس نے تالاب کی سیڑھی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔۔ [یہیں اس روز
وہ بیٹھی تھی] تم اپنے کروفر کے ساتھ ہاتھیوں کے شکار کے لیے روانہ ہو چکی ہو۔ اور
زندگی۔۔ تمہارے بنا بھی گزر سکتی ہے

آشرم کے راستے پر چلتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اس کی تعلیم کا آخری سال ہے
۔۔ عنقریب اس کا باپ اسے گھر لے جانے کے لیے آئے گا۔ گروا سے رخصت کر

تے وقت اپنی نصیحت دہرائیں گے۔ یہی الفاظ دہرائیں گے جو کہ ہر فارغ
 التحصیل طالب علم کے سامنے صدیوں سے دہرائے جا رہے تھے۔ بیچ بول اور دھرم
 کر۔ (دھرم؟) آخرم کے سارے لڑکے اس کے عمر بھر کے ساتھی اسے گھاٹ تک
 پہنچانے جائیں گے۔ فضیلت کی پگڑی باندھ کر وہ آنکھوں میں پہلی بار انجن لگائے
 گا۔ کانوں میں منی کنڈل پہنے گا۔ کیسری لباس کے ساتھ کاندھوں پر اونی کمبل ڈال
 کر پیروں میں جوتی پہن کر بالوں میں سیبی کے کانٹوں سے بنی کنگھی اڑے۔
 چھتری لگائے وہ شان سے شروعاتی کی سرکوں پر نکلے گا۔ ایو دھیا اور پائلی پتر کے در
 باروں میں جائے گا۔ وہ پروہت کی مسندوں پر بیٹھے گا۔ حکومت کے منتری منڈل
 میں شامل ہوگا۔ جبکہ بچاری مورکھ لڑکی ملگدھ کے کسی اجاڑ وحشت خیز دیہار میں سر
 گھٹائے بیٹھی شاکہ منی کے ہٹلائے ہوئے نروان کے حصول میں جٹی ہوگی

اگر وہ اپنے ذہن پر اس قدر غرور کر سکتی ہے تو کیا میں اپنے رتبے پر نازاں
 نہیں ہوں۔ اور خالی مسوری اور سنگتراشی میں کیا رکھا ہے۔؟ میں ستر ادھر بنوں گا۔
 میں قوانین بناؤں گا۔ منوکیل اور جمنی میری گردنوں میں پہنچ سکتے۔ میں ذہن کی دنیا
 تہہ وبالا کر کے رکھ دوں گا۔ علم میرا ہے۔ گنیش کا قلم میرا ہے۔ اگر چمپک میری نہیں
 ہو سکتی۔ تو کیا اندھیرا ہو گیا۔ سرسوتی تو میری ہے وہ مجھے کبھی بھی اس طرح چھوڑ کر
 نہیں جائے گی

اور چمپک میں رکھا ہی کیا ہے۔ خوبصورت تو دنیا میں ہزاروں لڑکیاں ہیں۔
 نرملا کتنی خوبصورت تھی۔ چمپک اگر غور سے دیکھ جائے تو تم ایسی بھی حسین نہیں
 اس کی شکل کیسی تھی بھلا۔؟ اس نے غصے سے چلتے چلتے تین چار کنکروں کو ٹھوکر

لگائی۔ میں نے کم از کم یہ تو طے ہی کر لیا ہے۔ کہ تمہاری تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا۔ تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتا۔ میں تو اس کی شکل بھی بھولتا جا رہا ہوں۔ شکل محض ہیولے ہے۔ میرے دل کے اندر جو روپ محفوظ ہے۔ اسے صرف وشواکرمن پہچان سکتا ہے

وہ اپنی کٹی میں داخل ہوا۔ پھر باہر نکل آیا۔ اور ادھر ادھر گھوما پھرا۔ آئینہ کے لڑکوں نے اسے حیرت سے دیکھا کسی نے اس سے پوچھا۔ کل رات سے نظر نہیں آئے۔ کہاں تھے؟

تو اس نے رکھائی سے ان کی بات مال دی۔

اکلیش سے اس نے جھوٹ بولا تھا۔ کہندی کے کنارے تمپیا کر رہا تھا۔ عمر میں پہلی بار اس نے جھوٹ بولا تھا اور اب اسے سارے جھوٹ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے سندھیا نہیں کی نہ گرو کے درشن کے لیے گیا آئینہ کے کنجوں میں مارا مارا پھرتا رہا

میں اس کی تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا میں پرہتما کاریک ہوں۔ فن پارے کو زندگی کے سارے رشتوں سے بلند تر ہونا چاہیے۔ اس نے بار بار دل میں دہرایا۔ لیکن بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ کلا کار تھا۔ اور تخلیق کی لگن نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا

دوسرے روز صبح سویرے وہ اپنا تصویر کشی اور مجسمہ سازی کا سامان لے کر مہوے کے باغ کی سمت روانہ ہو گیا۔ تالاب کے کنارے بیٹھ کر اس نے گیرو پیسا اور سرخ رنگ تیار کر لیا۔ نیل کی پڑیا مٹی کے کٹورے میں گھول دی۔ ہلدی اور کیسر

سے زر اور زعفرانی رنگ تیار کیے۔ دوسرے رنگوں کے لیے جڑی بوٹیاں ابالیں۔
 اور سفید چمیں پٹہ سارے پھیلا کر تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ مگر روپ اور روپ کی کشش
 نے پھر اس کا مو قلم روک لیا۔ میں کیا بناؤں؟ پھر اس نے سوچا کہ معنی کا کوئی مقام
 نہیں ہوتا۔ ایک ہی معنی کو مختلف علامتوں کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور ان
 علامتوں کو مختلف مقامات سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کی وجہ سے معنی محدود نہیں ہو جاتے
 ۔۔۔ تصویر رنگ نہیں مصور کی روح ہے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں ہیں جنہوں نے اس
 کا اشارہ سمجھ لیا ہے۔ رنگے ماود دیتے چترم۔ آنکھ صرف رنگ دیکھتی ہے جو کہ سطح پر
 موجود ہیں۔ جس طرح شاعری محض بیان ہے جسے حس نے تحریک دی ہے۔ جس کا
 کوئی مقام نہیں۔ جس تجربہ حس میں موجود ہے۔۔۔

اسے یاد آیا۔ ویدانت والے کہتے ہیں۔ ذات مطلق امور ت ہے۔ جس کی کو
 نی شکل نہیں۔ جو کہ ادراک سے باہر ہے۔ وہ ذہنی تصور یا خیال بھی نہیں۔ اس لیے
 ویدانت والوں کے نزدیک فن کا تصور اپار برہما یا کمتر درجے کی عال مت سے
 آگے نہیں بڑھتا۔ برہما الہشور ایسی ذات ہے جسے شکل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے
 ۔۔ اور اس تصویر کا اصل خراج روشنی ہے۔ اس کی اصل ہیئت یا سروپ مختلف چیزوں
 کی ہیئت ہے۔ ویشواروپ

اصل مسئلہ یہ تھا کہ خیال محض علامت کے ذریعے ہی دیکھنے والوں تک پہنچایا
 جاسکتا تھا۔ سرائے چترکار اور نقاد کم از کم اس بات پر متفق تھے۔ اسی نظریے نے
 اصنام پرستی کی ترویج شروع کی تھی

مگر خیال سے علیحدہ گوتم نے سوچا۔ زندہ ہستی تو بذات خود زندگی ہے۔ علا

مت نہیں.. اس کی طرف کشش جزبات پر مبنی ہے.. پھر کلا کار خالص خیال کو کس طرح پیش کرے..؟ اس کا رویہ تو غیر جانبدار نہیں رہ پائے گا.. دھیان.. جو کہ کلا کار کا اصل فن ہے.. سالم نہیں رہ سکتا.. خالص ہیئت..... شے کا تصور جو کہ خود شے ہے.. اصل دھیان ہے.. شے کی شخصی کیفیت کو کس طرح نظر انداز کیا جائے؟

حقیقت زندگی سے آنکھیں نہیں چرائیہ جاسکتیں

اسی طرح تالاب کے کنارے بیٹھے بیٹھے اس نے بیت سی تصویریں بنائیں.. اور بگاڑ دیں.. سرخ مٹی سے بہت سی مورتیاں گھڑیں اور توڑ ڈالیں

آشرم کے لڑکوں میں کانا پھوسی شروع ہوئی.. یہ گوتم کچھ باولا ہوتا جا رہا ہے.. اسے کیا ہو گیا؟ اکلش نے غصے سے کہا.. نہیں گوتم باولا نہیں ہوا.. اس پر ایک استری کی دھن سوار ہے.. ایسی شرمناک بات آج تک اس آشرم میں کبھی ہوئی تھی..؟ کال کار بنتا ہے اور خیال کی بجائے روپ کے پیچھے بھاگ رہا ہے

شہر کی چتر شاالوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں.. گوتم نیلمبر کیا اب ناگرک [فیشن اہل پورٹریٹ پینٹنگ] مصوری کرے گا.. سنا ہے کہ اس نے ایو دھیان کی کماری جمپک کی تصویر بنائی ہے.. ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے.. چتر کاروں کی منڈلی کے پرکھ نے اظہار خیال کیا.. اب وہ پرہیتما کا ریک نہیں رہا..

گوتم تصویریں اور مجسمے بناتا رہا.. اس نے آشرم کی زرد دیواروں پر مٹی اور براہ اور چونا پھیر کر گہرے رنگوں کے خطوط بنائے.. اس نے سرخ مٹی کی مورتیاں ڈھالیں.. اب تک جو تختیاں سینکی جاتی تھیں.. ان پر زیادہ تر مابعد الطبیعات کی علامتوں کے نقوش ابھرے ہوئے ہوتے تھے.. برشول اور زندگی کا درخت اور زمین

کے کنول اور دنیا کے پیسے اور کنول کے سنگھاسن اور آگ کے ستون۔ گوتم بلیمر کی تختیوں پر گلوں کے مناظر تھے عورتیں۔ بیل۔ پتے۔ گائیں۔ پھولوں کے نمونے۔۔۔ کسان لڑکے۔۔ ان نقوش میں قوت تھی۔۔ اور زندگی کی سرخی اور تپش۔۔ ماورائے حیات کی بجائے یہ اصل حیات تھی۔۔۔۔۔ یہ زمین کی اپنی تخلیق تھی

پھر ایک دن اس نے سدرشن یکمشی کا مجسمہ مکمل کر لیا۔ سدرشن یکمشی جو کہ کدم کی ڈالی جھکائے درخت کے تنے سے لگی کھڑی تھی

شہر کے فنکاروں نے اسے دیکھ کر سراہا۔۔ چتر شالاؤں اور مندروں میں اسے نا پسند کیا گیا عوام جن میں فن کا ذوق عام تھا۔ اسے دیکھ کر خاموش رہے۔ نقادوں نے گہری نظروں سے اس کو جانچا۔ لیکن گوتم کی تعریف کسی نے نہیں کی۔ سب کو اچھا تھا

فنکاروں اور ذہن پرستوں کے حلقوں میں اس کے متعلق زوردار بحثیں چھڑ گئیں گوتم خاموشی سے سب کی سنتا رہا خود کچھ نہ بولا۔ وہ فلسفے کا راستہ چھوڑ چکا تھا اس لیے یہ نہ بتا سکا کہ خالص جمالیاتی تجربہ دراصل کیا شے ہے؟ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ کس طرح دوسروں تک پہنچایا جاسکتا ہے؟ روہ اور اروپ۔۔ بھاو اور ابھاو کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا کون تھا؟ وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ انسانوں کو ان کے اسرار کو پتھر میں مقید کر لے۔۔۔ انسان جیسے وہ ہیں۔۔ ویدانت کے پرستار کی حیثیت سے۔ اس نے سوچا کہ خالص جمالیاتی تجربہ غیر متعلق آئندہ ہے۔ بجلی کی طرح ہے اکھنڈ ہے اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا خود ظاہر ہوتا ہے یعنی سو پر آشکش ہے۔ جس طرح کے فنکار کا تصور و شوا کر من کے تصور میں شامل ہے اس طرح دیکھنے وا

اآتم یا خودی میں شامل ہے... جو ہمہ وقت دیکھتا ہے... اور جس کا سروپ ساری کا
 کنات کا مظہر ہے... وٹو اوروپ... روپم روپم پرپتی روپ... جمالیاتی لگن کا مکمل نمونہ
 وہ ہے جو کہ دنیا کی تصویر کو محض خودی سمجھتا ہے... جو کہ خودی کی سطح پر بنائی گئی ہے
 ... یہ وہی خالص وجود ہے خالص اوراک اور خالص حیات... دل کا نگار خانہ
 جہاں کہ ساری تصویریں موجود ہیں.. سارے تخلیل موجود ہیں.. جہاں پہنچ کر ساری
 شبہیں ایک ہو جاتی ہیں جہاں مختلف رنگین شیشوں میں سے ایک ہی روشنی گزرتی
 ہے اور ہر شے جو کہ ڈھنگ سے بنائی گئی ہے اور سچائی سے بنائی گئی ہے.. مکمل فن
 پارہ ہے.. اور فن کار اور دیکھنے والے دونوں کے لیے یہ ایک ہی مارگ ہے
 اور سمجھنے والے و دو ان پر بدھا اسے سمجھ سکتے ہیں

سدرن یکشی کی تخلیق کے ساتھ ہی سنگتراشی کا ایک نیا مدرسہ شروع ہوا
 .. سنگتراش کا فن خالص دنیاوی بنا... ان مجسموں میں شدید حقیقت پسندی تھی یہ کدم
 اور پاتلی کے درختوں کی پرپیاں.. اندر لوک کی دیو مالائیں دراصل ایودھیا اور
 شرواستی کی امیرزادیاں تھیں.. گاؤں کی کسان لڑکیاں تھیں.. جو کہ دراصل زندگی
 میں پگھٹ پر پانی بھرنے جاتی تھیں.. ساون گاتی تھیں... کھیتوں کی زرائی کرتی
 تھیں

سدرشن یکشی کمر پر سے بل کھائے ہوئے انداز میں کھڑی تھی.. اس کی باہیں
 گداز تھیں.. آنکھیں بہت بڑی بڑی.. اس کا جسم بہت مضبوط اور سڈول تھا.. یہ
 خطوط اور حجم کے توازن.. شانیت اور لوچ اور حرکت کے احساس کا مکمل امتزاج
 تھا.. اس انداز میں جان تھی اور حرکت اور قوت اور آزادی... اور زندگی اور اطمینان

کی شدید کیفیت ... یہاں قید نہیں تھی ... بندھن نہیں تھا ... کلا کار کو بکا خرقید سے
آزادی ملی تھی۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنائے گا؟

اب سنگتراش راہب نہیں رہا تھا۔ اس نے خوبصورت ... تندرست ... مسکراتی ہو
ئی عورتوں اور مردوں کے پیکر تراشے۔ عورتیں جودل آویز کاہلی اور آسائیش کے
احساس کے ساتھ کھڑی تھیں یا بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں پر افسردگی کہیں نہیں تھی
... چہرے جو کہ سوچ میں ڈوبے مسکرا رہے تھے ... یہ بہت حقیقی ... بہت اصل بہت
واقعاتی دنیا تھی ... دنیا جو کہ اس پاس چاروں اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور کلا
کار جس کی شکتی اسے سرسوتی کا چہیتا بناتی تھی۔ سکون سے زندہ رہنے کا خواہاں تھا
ایک روز گوتم اپنی چند نئی تصویریں لے کر کملیشور کے نگار خانے میں پہنچ گیا
وہاں حسب معمول اس کے سرے دوستوں اور مخالفوں کا مجمع موجود تھا اس گروہ
میں اسے چند لپی کار (رپورٹر) اور پتی ویدک بھی نظر آئے۔ اور اسے ذرا تعجب ہوا
... یہ سب ایک زمانے میں سیاست پر گفتگو کرنے کے لیے اس کی کتیا میں جمع ہوا کر
تے تھے سب لوگ چپ چاپ کسی گہری فکر اور سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔
انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہے۔ وہ چپ چاپ کھڑکی کے
پاس بیٹھ گیا اور نیچے بازار کی چہل پہل کو دیکھنے لگا

تم کو نہیں معلوم۔ کملیشور نے بکا خرابات شروع کی

کیا۔۔۔؟ گوتم نے پوچھا

تم نے کچھ بھی نہیں سنا؟ آخر کس دنیا میں رہتے ہو؟

کیا ہوا؟ بتاؤ تو

باہر کسی نے کنڈی کھڑکھڑائی... اور اٹکلیش داخل ہوا.. اس کی اسنس پھولی ہوئی
تھی اور اس کے پیر گرو آلود تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں دور سے بھاگتا ہو
آ رہا ہے

بھائیو.. اپنا اپنا سامان ہمیشہ اور فوراً یہاں سے بھاگ نکلو
کیوں کیا ہوا.. گوتم نے سوال کیا..

مگدھ میں لڑائی چھڑ چکی ہے.. بھائی گوتم.. چند رگبت کی فوجیں سارے دیس
پر قبضہ کرتی ہوئی اس طرف آرہی ہیں.. اب یہاں ہل چل جائیں گے.. میدانوں
میں بہرام نیہ جنگ کے دیوتاؤں نے اپنا قرض کرنا شروع کر دیا ہے.. اب تمہار
وقت ختم ہوا.. موت جنگ کا نثارہ بجاتی تمہارے تعاقب میں آرہی ہے.. موت جو
کہ روپ اور اروپ.. بھاؤ اور ابھاؤ کے جھگڑوں کو مٹا دیتی ہے.. اٹکلیش تھک کر
چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں.. جھوڑی دیر بعد اس نے کہا.. راجن
کھیدا سے واپس آرہے تھے.. جب وشنو گیتا کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا..
سب کے سب مارے گئے

سب کے سب.. گوتم نے لڑکھڑاتے ہوئے پوچھا..

ہاں... سنا ہے کہ شہزادیاں ندی تیر کر پنچالوں کے علاقے کی اور نکل گئیں مگر
سپاہی ناکے تعاقب میں ہیں..

کالے چمپک بھی ماری گئی ہوگی؟

وہ کون ہے؟ اٹکلیش نے آنکھ کھول کر بڑی بے رحم آواز میں کہا.. جنگ میں
انسان نہیں رہتے صرف نام رہ جاتے ہیں.. پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا

تم کہاں جاتے ہو بھائی کھلیش؟

میں لڑنے جاتا ہوں۔ مگر شاید تم نہیں لڑو گے۔ کیونکہ تم اہنسا کے قائل ہو چکے ہو۔
.. اس نے اپنی چپلوں سے گرد جھاڑی اور اسی سکون سے باہر نکل گیا

جنگ۔۔۔ امن۔۔۔ خونریزی۔۔۔ اہنسا

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مکملیشور کو مخاطب کیا: ”مجھے کوئی بتاؤ، تم سب
کلاکار اور عالم جو یہاں موجود ہو، بتاؤ کس وقت لڑا جائے۔ کس وقت نہیں۔ کوئی
بری شکر سے یہ پوچھنے جاؤ، جیو ہتیا کس سے جائز ہے کب ناجائز؟“ وہ کمرے میں
ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ ”بھائیو مجھے نند راجہ سے کوئی دلچسپی نہیں، میں وشنو گپتا کو نہیں
جانتا۔ چندر گپت سے میرا کوئی جھڑا نہیں۔ یہ سب مل کر مجھے اپنی لڑائی میں کیوں
گھسیٹتے ہیں، لیکن مجھے بھی دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ مجھے تو ان سب کی جانیں
پیاری ہیں۔ میں خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں، میں اب کیا کروں گا۔“ کھڑکی کے
پٹ سے سر لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس اثنا میں لوگ، جو نگار خانے میں موجود تھے اپنے اپنے جوتے پہن کر باہر
نکلنے لگے۔ ان کے جانے کی آہٹ پر گوتم نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ کمرہ
سنان پڑا ہے، وہ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے تک بھاگا اور زور زور سے چلانے
لگا: ”ارے اپنی اپنی مورتیاں چھوڑ کر کہاں جاتے ہو، یہ ٹوٹ جائیں گی۔ بھائیو۔
بھائیو۔“

لیکن دفعتاً نیچے بازار میں شور قیامت بلند ہوا۔ شہر پر جنگی رجموں اور ہاتھیوں کی
بیغار شروع ہو چکی تھی۔ پل کی پل میں سارا بازار رن میں تبدیل ہو گیا۔ دھول اور

ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی جھجکار اور عورتوں اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی صداؤں کے خوفناک بھنور میں اس کی اپنی آواز ڈوب کر رہ گئی، وہ سکتے کے عالم میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا سامنے کا منظر دیکھتا رہا۔ بازار کی اینٹ سے اینٹ بچ چکی تھی۔ اس کے چتر کار ساتھیوں کی لاشیں سڑک پر ادھرا دھرا بکھری پڑی تھیں۔ چانکیہ کے سپاہی بڑی صفائی سے لوگوں کی گردنیں اتارنے میں مشغول تھے۔ گوتم کی نظروں میں اندھیرا چھا گیا، آخر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نگار خانے کی سیڑھیوں سے اترا۔ اس نے مرے ہوئے کملیشور کے ہاتھ میں سے تلوار نکالی اور خواب کے عالم میں چلتا، تلوار گھماتا، کیونکہ خودنوں جنگ میں طاق تھا، سڑک پر اتر گیا۔

گوتم رات گئے تک لڑتا رہا اور آخر کار زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گلی میں گر پڑا جہاں چاروں طرف اہل شہر کی لاشوں کے انبار لگے تھے۔

افق کے نزدیک شہر سے کچھ فاصلے پر جیتون کی عمارت چپ چاپ درختوں میں چھپی کھڑی تھی۔ اس کا کلس اندھیرے میں مدھم مدھم یوں جھلک رہا تھا جیسے اس سارے نقشے پر خاموشی سے ہنستا ہو۔

وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ویس پر اب مور کے نشان والے شہنشاہ کا راج ہے، وہ جو ویس کی چترانت ریاست کا پہلا سمرات ہے۔ اتہاس پران میں ایک نئے باب

کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نسب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر رک گئے ہیں۔ یہ پر یہ درشن نری چندر، انسانوں کا چاند، جو پائلی پتر کے سنہاسن پر طلوع ہوا ہے۔

یہ شودر ماں کا بیٹا، جسے گڈریوں نے پالا، جسے چانکیہ نے تلکشا میں پروان چڑھایا اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے ننانوے کروڑا اثر فیوں کے خزانوں کے قصے خواب و خیال ہوئے۔

یہ عہد جدید ہے۔

چندر گپت بڑا زبردست بادشاہ ہے، اس کی سلطنت کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا ہے، اس کا پایہ تخت دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت سے دوسرے ممالک خوفزدہ ہیں۔ اس کے ہزار ستونوں والے چوہلی محل میں دور دور کی سلطنتوں کے سفیر موجود ہیں۔ اس کے دربار میں بیچھ دوسری زبان بولنے والے غیر ملکی لوگوں کا ہجوم ہے۔ دور پچھتم کے دیسوں کی سفید فام لڑکیاں محل میں ترکیوں اور داسیوں کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراستہ ہے۔ وسیع تماشا گاہ میں نیزہ بازی اور رتھوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ سڑک پر سے سمرات کی سواری گزرتی ہے۔ جلوس میں موسیقار شنگھ بجاتے بجاتے ساتھ ساتھ جارہے ہیں۔ چوراہوں پر رقص ہو رہا ہے۔ جھروکوں میں سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ عوام بے شبد بولتے ہیں۔ اب گرام بھوجک ان سے زبردستی لگان وصول نہیں کرتا، اب وہ چوری اور بد امنی کی آفتوں سے محفوظ ہیں۔

ان کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے۔

کیونکہ وشنو گپتا، جس کا دوسرا نام چاکھیہ ہے، جس کا دوسرا نام کوٹلیا ہے، جس نے مہاپدم مند کو اپنی سیاست سے شکست دی، وہی وشنو گپتا مشیر سلطنت ہے۔ (اور شکھیہ منی نے کہا تھا کہ فتحِ نفرت پیدا کرتی ہے کیونکہ مفتوح دکھ کی نیند سوتے ہیں لیکن فتح و شکست سے بلند شانت آدمی سکھ میں رہتا ہے۔)

لیکن ہر فتح یا شکست تاریخ کے راستے پر ایک موڑ ہے جس کی وجہ سے دنیا کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس فتح کے بعد سے عوام پہلی بار قومیت کے تصور سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کو ایک مبہم سا احساس ہوا ہے کہ وہ ایک قوم ہیں جو بہت سارے قبیلوں اور ذاتوں اور خاندانوں سے بلند تر ایک اور شے ہے، وہ ایک ایسی قوم ہیں جنہوں نے چندر گپت پر یہ درشن کی قیادت میں ایرانیوں اور یونانیوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کیا ہے۔

وشنو گپتا، مکشلا کا برہمن، اپنے سیاسی تصورات کو اب عملی جامہ پہنا رہا ہے، وہ جانتا ہے کہ نیکی کا سیاست میں بدلہ نہیں ملتا۔ سیاست میں جرائم کی بھی سزا نہیں دی جاتی۔ جزاء و سزا کے مسئلے کو اس نے دھرم شاستروالوں کے لیے چھوڑ دیا ہے، وہ کہتا ہے سیاست میں صرف غلطی سے احتراز کرنا چاہئے۔ ریاست کی بہتری شخصی فائدے سے برتر ہے۔

معدنیات، بازار، منڈیاں، نہریں، آبپاشی، شفا خانے، مالیات، تجارتی گودام، باغات، محصول، دیوانی، فوجداری، طلاق، شادی، وراثت کے قوانین، تعلقاتِ عامہ، امورِ خارجہ، دفاع، چراگاہوں اور قصاب خانوں کے اس نے الگ الگ محکمے قائم کیے ہیں۔ سارے میں جاسوسی کا جال پھیلا دیا گیا ہے۔ جو برہمن

اپنے علم کے ذریعے روزی نہیں کما سکتے اور نہ کام سوداگر، حجام، نجومی، نوکر چاکر،
 طوائفیں اور کسان، ہر شخص اپنی قابلیت کی بدولت جاسوسی کے محکمے میں شامل ہو
 سکتا ہے۔ سادھوؤں کے بھی میں ادھر ادھر گھوم کر جاسوس چند رگپت کے تحت و
 تاج کی حفاظت میں جے ہیں۔ بغاوت کا پتا چلاتے ہیں۔ ویشیاؤں کے گھروں
 اور قمار خانوں میں جا کر عوام کے خیالات سے باخبر رہتے ہیں۔ جرائم کی جھکنی
 کے لیے بھیدی کا کام کر رہے ہیں۔ سارے میں امن قائم ہے۔ منو نے کہا تھا
 جہاں سیاہ فام سرخ آنکھوں والی ڈنڈ بھروسوں کو ختم کرتی زمین پر گھومتی ہو وہاں کی
 پر جاتنگ نہیں ہوتی۔

یہاں بادشاہ ڈنڈ دھر ہے اور پر جا خوش ہے۔

پاٹلی پتر پر اتنی رونق اس سے پہلے کبھی نہیں آئی۔ نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔
 آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔
 مگدھ نام نرتی (پراکرت مگدھ کی عوامی بولی) میں بدلتی جا رہی ہے۔ ناک اور
 موسیقی کے فنون اپنے عروج پر ہیں۔ گلی کوچوں سے گیتوں کی تانیں بلند ہوتی
 ہیں۔ کاریگر نئے نئے زیور گھڑ رہے ہیں۔ دور دور کے ملکوں کا سامان بازاروں
 میں فروخت ہو رہا ہے۔ بیراگی اور پیپیرے گلیوں میں دو تارہ اور بین بجاتے پھر
 رہے ہیں۔ بہروپے منڈپوں کے نیچے سوانگ بھر رہے ہیں۔

این ناک منڈلی، جو کاشی سے آئی ہے، نئے نئے تماشے دکھا رہی ہے۔ ان
 ناکوں کا لیکھ پہلی بار پاٹلی پتر آیا ہے لیکن اس کی شہرت اس سے پہلے یہاں پہنچ
 چکی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے وہ

بہت بڑا گنی اور کلاؤنٹ ہے، ایک زمانے میں چتر کا رتھا اور مورتیاں بناتا تھا۔ نٹ (رقاص) ہے۔ بہت معرکے کا ناچتا ہے۔ ٹانگ (ایکٹر) ہے۔ غضب کی اداکاری کرتا ہے۔ بھرت منی کا سارا فن اس نے گھول کر پی رکھا ہے۔ برسوں برس اس نے ایوڈیا کے گنی جنوں اور گندھرپوں کی سنگت میں گزارے ہیں۔ سارے سر اس کے قابو میں ہیں، بڑے بڑے گائیک اس کا لوہا مانتے ہیں۔ پرتب بھی اسے چین نہیں پڑتا۔ سارے دیس میں گھوما گھوما پھرتا ہے۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ کسی ایک فن کو اپنی پوری توجہ کا مرکز نہیں بناتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے بادل کی چھایا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہو اور وہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔

اس ٹانگ کی بہت دھوم مچی ہے، سارا پاٹلی پتر ٹانگ گھر کی اور امنڈا چلا آ رہا ہے۔ خواتین کے رتھوں اور پالکیوں کا تانتا بندھا ہے۔ راج محل کی شہزادیاں، امیروں، وزیروں اور تاجروں کی بیٹیاں، انتظامی ملازمتوں کے افسروں کی بیبیاں، سبھی رنگ برنگی ساریاں، زرنکار پٹکے اور سنہری کر دھنیاں پہنے آ کر ٹانگ گھر کے ایوان میں بیٹھ رہی ہیں۔ بن بیاہی نوجوان لڑکیاں اس اداکار اور لیڈر کو دیکھنے کی بہت مشتاق نظر آتی ہیں۔ انہوں نے سن رکھا ہے کہ وہ بہت خوبصورت آدمی ہے اور خواتین کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ کلا کی اچھائی یا برائی کے مسئلے کو کلا کار کی شکل و صورت سے گڑبڑا دیتی ہیں۔

سفید پردہ ایک طرف کو سر کا یا گیا۔ منقش چوٹی رنگ بھومی کا عقبی پردہ کلسوں، پنکوں اور تصویروں سے سجا تھا۔ سازندوں کی روشن چوکی سامنے بیٹھی تھی۔ سنگیت کار لڑکیوں نے پہلو کے ستونوں سے برآمد ہو کر مہادیوی کی استوتی کی اور ان میں

سے ایک لڑکی ٹولی سے باہر آ کر کمر پر ہاتھ رکھے ایک طرف کوکھڑی ہو گئی۔ یہ لڑکی تمثیل کی نائیکہ تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں موتیا کا کجرا گندھا تھا اور اس کی طاقانی کر دہنی میں یا قوت جڑے ہوئے تھے۔

پھر پردیپ کی روشنی میں رنگ بھوم کے سفید روغنی تختوں پر وہ نمودار ہوا جس کا اتنی دیر سے سب کو انتظار تھا۔ اس نے کیسری رنگ کے ریشمین کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں کرن بھوشن جگمگا رہے تھے، وہ بڑی شان سے سر اٹھائے سامنے خلاء میں دیکھتا ہوا قارا انداز سے قدم رکھتا سامنے آیا اور چند لمحوں تک سب کی طرف نظر ڈال کر اس نے قاعدے کے مطابق نئی سے اس ٹانگ کے موضوع کے متعلق مکالمہ شروع کیا۔ مجمع اس کی خوبصورت آواز سے مسحور ہمہ تن گوش رہا۔ سب ٹانگی باندھے اپنی اپنی جگہ پر ساکت و صامت گردنیں آگے بڑھائے اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔

مکالمے کے دوران میں کسی بات پر زور ڈالنے کے لیے اس نے پہلے اپنا دایاں اور پھر بایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

تماشائی چونک اٹھے ان کے چہروں پر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خوبصورت اور انوکھے کلاکار کے دونوں ہاتھوں کی کئی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

گوتم نیلمبر کے سامنے ایک اور شہر تھا۔ تماشائیوں کا ایک اور ہجوم جو حسب معمول عقیدت اور محبت سے اسے دیکھ رہے تھے، وہ سب کو تماشے دکھاتا تھا لیکن اس کا تماشہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔ جس طرح رنگ بھومی کے پردے کے پیچھے ایک

اور رنگ بھومی ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

پانگی پتر کے یہ مہذب باوقار شہری، جوانیوں میں بیٹھے اس کے مکالمے پر عیش
عیش کر رہے تھے، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا وہ کیسی کیسی دنیاؤں کی سیاحت
پر اٹکا ہے۔ اس نے زندگی کے سارے تجربے کر دیکھے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں۔
جن چیزوں سے اس نے بچنا چاہا، جن باتوں کو اس نے نظر انداز کرنے کی کوشش
کی محض یہ سوچنا چاہا کہ زندگی محض خلاء ہے یا محض روشنی یا محض تاریکی مگر یہاں محض
کا وجود نہ تھا، وہ ماسوا کو اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ دنیا قدم قدم پر اپنے ہر
روپ میں اس کے سامنے موجود اس کا منہ چڑا رہی ہے، وہ جنگ کے خلاف تھا اور
اس نے اپنی تلوار سے شراوتی کے معرکے میں مخالف فوج کے پانچ سپاہیوں کو قتل
کیا۔ پانچ انسان۔۔۔ جو اس کی اپنی دنیا کے باسی تھے۔ اسی کی طرح بولتے تھے،
گیت گاتے، اسی کا ایسا دل و دماغ رکھتے تھے، وہ برہمچاری تھا لیکن برہمچاریہ کے
 سخت قوانین کو توڑ کر اس نے ایک لڑکی کو دیوانہ وار چاہا۔ اس کی سوچ کو منجمد کرنے
کے لیے، اس کے پیکر تراشنے کی خاطر اس نے کلا کی دنیا میں پناہ ڈھونڈی۔ یہ
بالآخر اس کی اپنی دنیا تھی۔ خالی الفاظ اور سوکھے فلسفے کے مسائل سے بلند تر۔
یہاں رنگوں اور پتھروں کی سنگت میں وہ زندہ رہا، لیکن جنگ میں لڑتے سے
”دشمن“ کی تلوار سے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قلم ہو گئیں۔

شراوتی کے بازار میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا
تھا اور پھر نیزے کے ایک وار کی تاب نہ لا کر گر پڑا تھا۔ جب اسے ہوش آیا اور اس
نے سر اٹھا کر دیکھا کہ رات کی سیاہی آسمان پر سے مدھم ہوتی جا رہی ہے، وہ

زخموں سے چور ہے اور اس کے ہاتھ بولہبان ہیں۔ اس نے لیٹے لیٹے بڑی مشکل سے اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا دیا جو خون میں لت پت تھیں۔

تب اسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ، انگلیاں، جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں، خون میں نہلا دی جاتی ہیں۔ کسی خاموش ویران میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کلاکار کی حیثیت سے انسان کا ہاتھ اس کے لیے بہت بڑی علامت تھی۔ انگلیاں، جو قاص کی مدراؤں کے ذریعے کائنات کے سارے اسرار، ساری زندگی کے معنی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ جو مکان بناتی ہیں۔ باغوں کو پہنچتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں۔ تھپک تھپک کر بچے کو سلواتی ہیں۔ آرتی کے لیے مارجی پھول چنتی ہیں اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ انگلیاں تیرگری کرتی ہیں۔ نیزے ڈھالتی ہیں۔ دوسرے انسانوں کا اپنی گرفت سے گلا گھونٹتی ہیں۔

تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہو گا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کرم کے فلسفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اگر یہ فلسفہ میرے پاس نہ ہوتا تو میں سوچ سوچ کر دیوانہ ہو جاتا۔

ذرا سی سکت آنے کے بعد وہ اٹھا اور لاشوں کو پھیلانگتا، گلیوں کی دیواروں کا سہارا لیتا اپنے مکان کی سمت گیا۔ جہاں اس کی ماں تھی جو اس کے زخم دھوئے گی، اس کو اپنی گود میں سلائے گی۔

لیکن اس کا مکان سنسان پڑا تھا۔ یہاں وہ بیس سال بعد اس وقت پہنچا تھا جب اس کے ماں اور باپ چند گھنٹے قبل لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔

لڑکھڑاتا ہوا وہ شہر سے باہر آشرم کی سمت روانہ ہوا جہاں ہو کا عالم تھا۔

جھونپڑے خاموش پڑے تھے۔ گرو کی کتیا خالی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ مہوے کے باغ میں داخل ہوا اور تالاب کی سیڑھیوں پر لیٹ گیا، اس کے زخموں کے خون نے تالاب کے شفاف پانی کو لرغوانی کر دیا۔ ایک نوجوان گوالن نے، جو ادھر سے گزر رہی تھی، اسے سسکتا ہوا دیکھا، وہ گھبرا کر دوڑی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس نے پانی سے اس کے گھاؤ صاف کیے، اسے گائے کا تازہ دودھ لاکر کھلایا۔

اور بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرتا اسے بڑے زور سے ہنسی آگئی۔ گوالن اسے اچنبھے سے دیکھنے لگی۔ کیسا انوکھا سپاہی ہے۔ میدان جنگ سے لڑتا مرنے ہوا آ رہا ہے اور ہنستا ہے۔

اس کو اتنی ہنسی آئی کہ اس کا جی چاہا کہ زور زور سے تھپتھپے لگائے۔ اس وجہ سے اس نے ازراہ مذاق بھی گوالن سے یہ نہ پوچھا کہ تمہارا نام سجاتا ہے یا نندبالا۔ کیونکہ اسے اس سے ہری شکر کے الفاظ یاد آ چکے تھے۔ ”بھائی گوتم! ہر زمانے میں ہوموڑ پر تمہیں کوئی نندبالا ملے گی کوئی سجاتا اور وہ نزدیک آ کر تمہاری خدمت تمہاری پرستش کرنا چاہے گی۔ اب بھی وقت ہے آنکھیں کھول لو۔“ یہ دوسرا تجربہ تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ عورت کی خدمت، اس کی پرستش کو ٹھکرانا خدا کا سب سے بڑا ناشکرا پن ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر کے بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ گوالن کے کنگنوں کو جھوٹا، پھر اس کے پلو پر سر رکھ کر سو گیا۔

گوالن اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی جہاں وہ کئی دن۔۔۔ جب تک اس کے زخم اچھے نہیں ہوئے۔ اس کا مہمان رہا۔ یہ اس کا ہمسایہ گاؤں تھا لیکن اب اجاڑ پڑا

تھا۔ گاؤں کے بہت سے باسی مہاراج چندر گپت کی فوج کے خوف سے بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ گوالن نے اسے روکنا چاہا لیکن ایک روز وہ چپکے سے اس گاؤں سے نکل گیا۔ نندبالا، کہ یہی اس گوالن لڑکی کا نام تھا، بہت روئی لیکن وہ ہندی پار کر کے بہت دور پہنچ چکا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک میں امن قائم ہوا۔ چندر گپت کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ گوتم حکومتا پھر تاشی جاکا، وہ عالم برہمن تھا۔ سوائے اپنے علم و فن کے اس کے پاس کوئی اور تجارت نہ تھی، لیکن اسے فکر نہیں تھی۔ دویار تھی برہمچاری کی حیثیت سے اسے ہمیشہ سے بھوکا رہنے اور سختی اٹھانے کی عادت تھی۔ اسے یہ ونجاریوں کی ایسی زندگی بری نہیں لگی، مگر اب وہ عالموں کی صحبت سے اور ان سے بحث کرنے سے بچتا تھا۔ کاشی میں ایک ٹاک گھر کی مایکا سے اس کی ملاقات ہوئی جو دیکھتے ہی اس پر زبجھ گئی۔ اس نے گوتم کو اپنی منڈلی میں شامل کر لیا۔

اپنی کئی ہونی انگلیوں سے اب وہ تصویریں نہیں بنا سکتا تھا۔ مورتیاں نہیں ڈھال سکتا تھا۔ مانج نہیں سکتا تھا، صرف اداکاری کے ذریعے اپنا اظہار کرنے کا راستہ اس کے سامنے تھا۔ طالب عالمی کے زمانے میں اس نے ٹاک لکھے تھے۔ فن اداکاری کا مطالعہ اس کی تعلیم کا ایک جزو رہ چکا تھا، وہ فلسفی، عالم، چتر کار اب ٹائیک بن گیا۔

نٹ شاستر میں لکھا تھا کہ اداکار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آنکھیں طویل ہوں۔ ہونٹ سرخ، دانت چمکیلے۔ اس میں وقار، تمکنت اور غرور ہونا چاہئے۔ اسے فن عروض، فن خطابت اور فنون لطیفہ پر دسترس حاصل ہونی چاہئے۔ گوتم میں

یہ سارے وصف موجود تھے۔ یہ علم بحر ذار تھا۔ اس کا رتبہ بلند تھا۔ اسے بھی قص اور موسیقی کی مانند الوہی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا تھا کہ برہما نے اندر کی خواہش پر پانچوں وید کی حیثیت سے نائک قائم کیا۔ شیو اس فن میں دیوتاؤں کے استاد بنے۔ پاروتی نے اپسراؤں کو اپنی شاگردی میں لیا۔ وشواکرمن نے رنگ بھوم تیار کی۔ پر ایک مرتبہ گندھرو اور اپسراؤں نے ایک تمثیل میں ایک رشی کا مذاق اڑایا جس کی بددعا کی وجہ سے ان اداکاروں کو دیولوک چھوڑ کر دنیا میں آنا پڑا، یہاں بھی ان کے درجے میں کمی نہیں آئی۔ اداکار رشی لو کہلاتے تھے کیونکہ رام کے دونوں بیٹے خانہ بدوش مہشیوں کے بھیس میں اپنے باپ کے دربار میں پہنچے تھے۔

سارا عالم بہروپ سے خوش ہوتا ہے۔ گوتم ان روایتوں کے متعلق سوچ کر خیال کرتا۔ بہروپ ایک اور حقیقت ہے۔

نائک کا فن بہت ترقی یافتہ اور ہمہ گیر تھا۔ بھرت منی نے اس کے قوانین کی تشکیل کی تھی۔ انہوں نے اڑتالیس قسم کے نائک اور پونے چار سو اقسام کی نائیکاؤں کی فہرست بنائی تھی۔ انہوں نے ہدایت کاری اور رنگ بھوم کی آرائش اور اداکاروں کے اوصاف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔ سکون اور ع توازن تمثیل کے لیے لازمی تھا، شدید ایسے اور قتل و دہشت کے مناظر سے گریز کیا جاتا تھا تا کہ تماشاویوں کے ذہنی سکون میں خلل نہ پڑے۔

فراق تمثیل کا خاص موضوع تھا۔ گوتم نیلمبر نے بھی اس روایت کو قائم رکھا، فراق کے علاوہ اور کون سے موضوع وہ اپنے لیے منتخب کر سکتا تھا؟

نامیہ، نرتیہ اور نرت کے سام گیت میں اس نے خود کو سمودیا۔ ایک روز نائک

گھر کی اس نایکا نے اس سے کہا: ”میں نے سنا ہے تم بہت اچھا ناپتے ہو، مجھے بھی سکھلا دو۔“

”تم کو سکھلا دوں۔۔؟ تم کو ابھی اور سیکھنے کی ضرورت ہے؟“ گوتم نے چڑ کر کہا، ”مجھے تو کچھ نہیں آتا جاتا۔“ اس روز اس پر شدید بد مزاجی اور چڑچڑاہٹ کا دورہ پڑا ہوا تھا، وہ سہم گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا: ”پتہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں انہوں نے تم کو خود ناپتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”کون لوگ۔“ وہ پھر گر جا۔

”جانے کون۔ ایودھیا کے کچھنٹ بتا رہے تھے ایک دفعہ انہوں نے جنگ سے پہلے کسی تہوار میں تمہیں ناپتے دیکھا تھا۔“

ایودھیا کے۔ گوتم کا دل ڈوب سا گیا، وہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ اسے اس لڑکی پر ترس آیا، وہ اس پر کتنی بری طرح فریفتہ تھی۔ بے چاری۔ ”وہ کون لوگ تھے۔“

اس نے پھر کہا۔ ”کیا معلوم۔ ٹانگ گھر میں دسیوں طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔“ لڑکی نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اچھا اب میں گھنگرو باندھتی ہوں۔“

وہ اوماناٹھ کو کرتی رہی، وہ اسے دیکھا کیا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

گھنگروؤں کی آواز اس کے کان میں پہنچا کی، وہ ایک اور حقیقت سے دوچار ہوا۔ سارے نظام کائنات میں لے لے ہے۔ آفاق میں لے لے ہے اور چہر مبرم، انسان کا دل، جو کائنات کا مرکز ہے، شو اس میں ناپتا ہے۔ شو کسی تخیلی خدا کا نام نہیں جو پہاڑوں پر رہتا ہو۔ وہ میرے اپنے دل میں موجود ہے، وہ جو تخلیق ہے اور تخریب

بھی۔ جو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ جو وجود اور عدم و وجود، موت و زیست کا مکمل قانون ہے۔

اور ہر شے میں تال لے اور سر پہاں ہے۔ تخلیق اور ارتقا اور بقا اور تخریب میں رقص ہے۔ روح کی تشکیل اور اس کی آزادی میں رقص ہے۔ برہما جس نے تخلیق کی ہے۔ وشنو جو بقا ہے رور جو خاتمہ ہے۔ مہیشور جس نے روحیں تشکیل کی ہیں۔ سدیشور جو انہیں ان کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔ یہ سب اس کے مختلف پہلو ہیں جو ذات مطلق ہے، جوازی اور ابدی رقص ہے۔

اس ناچ کے رس اور بھاؤ انسان کی ساری ذہنی، دلی اور روحانی کیفیتوں کے عکاس ہیں اور آفاقی تصورات سے انہیں نسبت دی گئی ہے۔ شرنکار رس وشنو کا ہے، اس میں ان کے اوتار نتو رگر دھاری ورندا بن میں اپنی گوپ لیا رچاتے ہیں۔ ویرس کڑکتے گرجتے بادلوں کے سنہرے خدا اندر سے منسوب ہے۔ کرونا ترحم کا جذبہ ہے۔ یم سے اس کا رشتہ جوڑا کوڑا گیا ہے۔ رور غیض کی کیفیت ہے۔ ہاسیا سفید رنگ میں ملبوس مزاح ہے۔ بھیا نک رس کا رنگ سیاہ ہے۔ کال سے منسوب بھاسیہ شیو کے مہاکال روپ کی نیلی علامت ہے۔ اوبھت رس میں حیرت ہے۔

ان کیفیتوں کے اظہار کے لیے مکمل قوانین ہیں۔ ان کے لیے کس طرح کی اداکاری کی جائے، کیسے رنگ ہوں، کیسے پس منظر، کون کون راگ۔

میگھ، سری، ہنڈول، توڑی، چھایا، لالت، شرنکار رس کے، محبت کے راگ

ہیں۔

گوری، سوم اور دیو کرتی ویرس کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ رام کلی اور آساوری کرونا کے راگ ہیں۔ شکر اہاسیہ کا نغمہ ہے۔

ادا کار رقص اپنے سر، اپنی آنکھوں، اپنی بھوؤں، اپنے بازوؤں، اپنے ہاتھوں، اپنی انگلیوں، اپنے پیروں، اپنے پورے جسم، سارے وجود کے ذریعے کائنات و زندگی کی کہانی سناتا ہے۔ آنکھوں اور انگلیوں اور بازوؤں میں آہنگ قائم کر کے ناچتا ہے۔ آنکھوں کے تین طرح کے اشاروں کی پینتالیس قسمیں ہیں۔ گردن کے نو مختلف اشارے ہیں۔ ہاتھوں کی مدراؤں کی چار قسمیں اور ہر قسم کی چوبیس علیحدہ علیحدہ شاخیں۔ ان گنت طرح کے لوج اور جھکاؤ ہیں۔ جسم کی حرکات ایک سو آٹھ انداز کی ہے۔ جس طرح گائیتری منتر ایک سو آٹھ دفعہ پڑھا جاتا ہے یا جیسے آرتی کے پردیپ میں ایک سو آٹھ چراغ روشن ہوتے ہیں اسی طرح نٹ راج کے ایک سو آٹھ مختلف ناچ ہیں۔

کاشی کی خوبصورت پاتر اس کے سامنے ناچا کی۔ اس نے پیروں کی مختلف چالوں کا مظاہرہ کیا: یہ مور کی چال ہے، یہ برن کی، یہ ہاتھی کی، گھوڑے، شیر اور مینڈک کی۔ کودنے کے پانچ، قدم رکھنے کے دس، چکر کاٹنے کے آٹھ انداز ہیں۔ ہاتھوں کی دوسو سینتالیس مدراؤں نے ساری کائنات کو سمیٹ لیا ہے۔ ساری کیفیات، احساسات، خیالات۔ درخت، پھل، پھول، پرند، عہد غنیمت کے شہنشاہ۔ انسانی رشتے دیوی دیوتا۔ وشنو کے اوتار، چترورن، تاریخی ہستیاں، ساتوں سمندر، مشہور ندیاں، ساتوں طبقات ارضی، ساتوں طبقات سماوی۔ ان سب کا مدراؤں کی زبان سے بیان کیا جاتا ہے۔ البیہ اور طربہ اداکاری کے

سارے اتار چڑھاؤ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تال، لے اور گیت کا مکمل آہنگ ہے۔

یہ بھرت ناٹیم ہے۔

شیو کا ناچ، بھرت منی نے جس کے قوانین دنیا کے سامنے پیش کیے۔

کاشی کی رقاصہ بھرت ناٹیم ناچ رہی ہے جس طرح ایک مرتبہ چمپک ناچی تھی، جس طرح جب تک تال اور لے اور سر قائم ہے بھرت ناٹیم ناچا جائے گا۔ مگر میں نٹ راج کا ایک حقیر بندہ کبھی نہیں ناچ سکوں گا کیونکہ میں اپنا بیج ہوں۔

اس نے لڑکی کو غصے سے دیکھا جو ناچے جا رہی تھی، وہ خود شکر نہیں تھا، وہ گوری بھی نہیں تھی۔ تخیل کا جادو ٹوٹ چکا تھا۔ تب اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواب زیادہ دیر تک قائم رہنے والی چیز نہیں۔

لڑکی ناچتے ناچتے اکتا کر اس کے قریب آ بیٹھی اور اداسی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ میں اس آدمی کو کبھی نہیں سمجھ پاؤں گی، مگر کیا آدمی کو سمجھنا ضروری بھی ہے۔۔۔؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کم از کم گزرتے ہوئے وقت کے اس حصے میں میرا ہے۔۔۔؟

تمثیل گھر کی اس حسین لڑکی کا نام امبیکا تھا، یہ بڑی مشہور اداکار تھی۔ بڑے بڑے امیر زادے اور بانکے اس کے نام کی مالا جپتے تھے مگر وہ کبھی بھی تو کس پر۔۔ ایک مفلس برہمن طالب علم جس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

تب گوتم ایک اور حقیقت سے آگاہ ہوا، تم جس کو چاہتے ہو تمہاری پروا نہیں

کرتا اور جو تم پر جان دیتا ہے اس میں تمہارے لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بھی زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا جو اس سے پہلے ہزاروں کرچکے تھے مگر اس کے لیے نیا تھا۔

امیریکا میں روپ وٹی ہونے کے علاوہ وہ ساری خوبیاں اور ہنرموجود تھے جو ایک رقاصہ اور اداکار کے لیے لازمی تصور کیے جاتے تھے، وہ سنگیت کا تھی۔ شاعری کرتی تھی۔ پھولوں کو سجانے کا فن جانتی تھی۔ ضلع جگت کی استاد تھی۔ فن باغبانی، تیراندازی اور منطق کی ماہر تھی۔ اس کی آنکھیں بادام کی ایسی تھیں۔ اس کا رنگ خزاں کے پتوں کی مانند پیلا تھا۔ کستوری کی پگھڑیوں کا غارہ چہرے پر مل کر، کم کم اور کاجل سے آراستہ ہو، نفیس مینا کاری کے گہنے پہن کے جب وہ تماشا گاہ میں نمودار ہوتی تھی چاروں اور تہلکہ مچ جاتا تھا۔

پرگوتم ان تمام اوصاف کے باوجود اس پر ملتفت نہ ہوا، وہ امیریکا کی منڈلی کے ساتھ سارے میں گھوما۔ مور یہ سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ نون لطیفہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اب گوتم بھی امیر زادوں کے سے ٹھاٹھ سے رہتا۔ شراہیں پیتا۔ نت نئی لڑکیوں پر ڈورے ڈالتا اور پھر فوراً ان سے اکتا جاتا۔ امیریکا، اس کی پجارن، اس کی ان ساری بری عادتوں کے باوجود اس کی پرستش کیے گئی، وہ اس کی محبت کے جواب میں اس سے انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کرتا اور اس کو دکھ پہنچا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس کی بدمزاجی، اس کے اکل کھرے پن، اس کے غرور اور اس کی عشرت پسندی کے قصے بھی مشہور ہو چکے تھے۔

یہ سب تھا مگر ایک خیال دل و دماغ پر برابر مسلط تھا، اس کی روح کی گہرائیوں میں تان پورے کے سروں کی طرح گونجتا رہتا تھا۔ چمپک۔۔۔۔۔

اس نے چمپک کی تلاش میں دور دراز کی یا تراکیں کیں، شاید وہ زندہ ہو۔ مارے جانے سے بچ گئی ہو۔ شاید کسی پرانے مٹھو بہار میں دکھائی دے جائے، وہ شکایہ منی کی بھکشوں کی ٹولیوں کو غور سے دیکھتا، وہ ہر پگھٹ، ہر بزاز کی دکان، ہر سنگیت منڈلی میں، ہر اس جگہ چمپک کو تلاش کرتا جہاں لڑکیاں جمع ہوتی تھیں مگر وہ کہیں نہ ملی۔

تب اس نے تھک کر اپنی کھونچ ختم کر دی اور امبیکا کی محبت کے آگے اپنی ہار مان لی۔ اب وہ صرف امبیکا کے ساتھ ہی رہتا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف توجہ بھی کم کر دی۔ امبیکا کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا سکون آ گیا تھا جو صرف ایک گرہست ہی کو میسر ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ امبیکا کو افسوس سے دیکھتا، یہ بے چاری میرے لیے کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب اس کے بال سفید ہو جائیں گے، اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑ جائیں گی۔ خوبصورت عورت کی اصل موت اس کا بڑھاپا ہے۔ بیوقوف امبیکا کیوں نہیں ان لوگوں کی طرف دیکھتی جو کچھ مچ اس کی قدر کرتے ہیں۔

مگر برس اسی طرح نکلتے گئے۔ گوتم نیلمبر اب اڑتیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے بھنور ایسے کالے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگے تھے، وہ اب بھی اسی طرح ہنستا تھا۔ مشرقی ونکا کی ملائم لمل اور قیمتی ریشم میں ملبوس اپنے منتشر رتھ میں

امبیکا کے ساتھ ہوا خوری کے لیے نکلتا تھا۔

آج وہ پاٹلی پتر میں موجود تھا اور حسب معمول تمثیل کے دوران میں امبیکا کے ساتھ مکالمہ ادا کر رہا تھا اور تماشاخی اسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ تماشاخی جو بہروپ کے عاشق ہیں، جو اصل گوتم نیلمبر کو کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔

۱۶

خواتین نے تاسف کی شدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خواب پرست لڑکیوں نے حیرت اور دکھ سے اپنے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ انہیں خواتین کی صفوں میں ایک طرف چمپک بیٹھی تھی۔ اس نے نفرتی پھولوں والی اوڑھے رنگ کی ریشمین ساری پہن رکھی تھی اور اپنی پہلی سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

جب اس نے نظریں اٹھائیں تو اسے گوتم نیلمبر نظر آیا، وہ لرز اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند تیرنے لگی اور اس دھندلکے میں گوتم کا چہرہ اس کے سامنے جھلملاتا رہا۔

گوتم نے گرج کر کچھ سناتے ہوئے دیکھا اور تماشاخیوں کے اس ہجوم میں اسے وہ دکھائی دی، وہ چند لمحوں تک اپنا مکالمہ فراموش کر کے وہ مبہوت اسے دیکھتا رہا۔

پھر یکلخت اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

کیونکہ چمپک جو اودی ساری اپنے اس کے سامنے بیٹھی تھی، جو اسے انتظار، اتنی تلاش کے بعد اسے یوں اچانک نظر آ گئی تھی۔ گوتم نے اسے اس وقت دیکھا جبکہ اس کی مانگ میں سینہ دور تھا اور پیروں میں سرخ مہندی اور پھوے اور اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے تماشا گاہ کے فرش پر سہیلیوں کے ساتھ آلتی پالتی مارے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

اور آن کی آن میں وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا کیونکہ پہلے وہ مقدس تھی اب مقدس تر ہو چکی تھی، وہ ماں تھی اور اب یک یک اس پر انکشاف ہوا کہ شکنتا، دہنتی، ساوتری اور سیتا کیسی رہی ہوں گی، کیسی لگتی ہوں گی۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتفاقات، حادثے، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں۔

وہ سنبھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہو گیا۔

وہ آپ ہی آپ چپکے چپکے آنسو پیتی رہی۔ ایک شخص نے دنیا تیاگی پھر بھی اس کی یاد دل سے نہ ہٹا سکا، وہ ہری شکر تھا۔ ایک شخص نے اس کی یاد سے بچنے کے لیے تیاگ کی بجائے دنیا میں پناہ ڈھونڈی اور پھر بھی ویراگی رہا گوناہر میں مکمل دنیا دار بنا، وہ گوتم نیلمبر تھا، وہ خود، وہ دکھیا ری نہ دنیا تیاگ پائی نہ دنیا میں زندگی کی مسرتوں ہی کو حاصل کر سکی۔ یہ سب مایا کے کھیل تھے۔

اسے وہی کرنا پڑا جو عورت کی حیثیت سے اس کے بھاگ میں لکھا تھا اور جو غالباً اس کا فرض تھا۔ راجن کے قتل کے بعد اسے دوسری شہزادیوں کے ساتھ پکڑ کر پائلی پتر لایا گیا۔ ایودھیا کے راج گھرانے کی ساری لڑکیوں سے فاتحین نے

شادیاں رچائیں۔ اس کا بیاہ بھی چانکیہ مہاراج کے ایک افسر سے کر دیا گیا جو پچاس سالہ، موٹا، گنجا اور نہایت چالاک برہمن تھا جو مالیات کے محکمے میں ملازم تھا اور ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔

چمپک کا دھرم تھا کہ اس کی پرستش اور اس کی خدمت کرے کیونکہ وہ اس کا شوہر تھا اور وہ اس کی خدمت کرتی تھی۔ جیسے پاٹلی پتر کی اور ہزاروں گرہ پتنیاں تھیں ان میں سے ایک وہ بھی تھی، اس میں کوئی خاص بات نہ تھی اور اس کی گود میں اس کا بچہ تھا اور وہ اپنی سہیلی سے ادھر ادھر کی عام باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفوں کے تذکرے کا وقت نکل چکا تھا۔

اس نے احتیاط سے اپنے آنسو پونچھے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پتی ورتا عورت ہونے کی حیثیت سے اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

کچھ دیر بعد جب تمثیل کا پہلا باب ختم ہوا اور پردہ گرا تو اس نے آہستہ سے اپنی داسی کے کان میں کچھ کہا۔ داسی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی سرعت سے باہر چلی گئی۔

۱۷

پہلے باب کے خاتمے پر گوتم بھی تنگ بھومی کے پیچھے سنگمار کمرے میں گیا جہاں دوسرے اداکار آ کر جمع ہو رہے تھے۔

”ایک داسی تم سے ملنا چاہتی ہے۔“ امبیکا نے آنے کے سامنے اپنی مالا لائیں اتارتے ہوئے مڑ کر اس سے کہا۔

”کون ہے؟“ گوتم نے پوچھا۔ اس کی آواز میں سے ساری درشتی، سارا
چڑچڑاپن غائب ہو چکا تھا۔ امبیکا اس کی اس اچانک تبدیلی پر ہکا بکارہ گئی، وہ کس
قدر شہانت معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔

”پتا نہیں۔“ امبیکا نے ذرا ہکلا کر جواب دیا، ”تم خود دیکھ لو۔“ اور پھر وہ
اپنے ملبوسات اٹھا کر دوسری رقا صاؤں کی طرف چلی گئی۔

گوتم سنگھار کمرے کی سیڑھیوں پر آیا جو باہر باغ میں اترتی تھیں۔

نیچے ایک سانولی سی خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر گوتم کے سامنے ہاتھ
جوڑ دیے اور اس نے کہا: ”میری رانی نے تم کو پرنام کیا ہے اور کہا ہے کہ کیا تم
جاتے وقت ان سے مل کر نہ جاؤ گے۔“

وہ ایک سیڑھی اتر کر نیچے آیا اور چند لمحوں تک گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے
جواب دیا: ”نہیں۔ اپنی رانی سے کہو، جو جاگتا ہے اسے ایک دن نیند آ جاتی ہے
اور جو سوتا ہے وہ ایک روز جاگ اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھو جو برابر
جاگتے رہتے ہیں۔ ان سے کہنا، اب میں بھی جاگ رہا ہوں اور اب کوئی شے
میرے راستے میں نہیں آ سکتی۔ اور ان سے یہ بھی کہنا کہ کیا وہ بھول گئیں کہ پتی
ورتا عورت کے لیے دوسرے مرد سائے کے سامان ہیں۔۔؟ اب تم جا سکتی ہو۔“

وہ جھانپنے بجائی تمثیل گاہ کے اندر گئی اور چند لمحوں بعد واپس آ گئی اور اسے
یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ وہ اب تک وہیں سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس نے
قریب آ کر کہا: ”میری رانی کہتی ہیں تمہارا خیال ٹھیک ہے، اگر اب جاگ گئے ہو
تو یہ بھی بہت اچھا ہے۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے، انہوں نے کہا ہے کہ تم پتی

ورتا کے معنی کیا جانو، لیکن ٹھیک ہے، کسی شے کو تمہارا راستہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے، اب تم بھی جاسکتے ہو۔۔۔“

اتنا کہنے کے بعد وہ جلدی سے منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر تماشا نیوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی جو دوسرا باب شروع ہونے کے لیے اندر جا رہے تھے۔

تمثیل ختم ہونے کے بعد گوتم تماشا نیوں پر نگاہ ڈالے بغیر رنگ بھوم سے باہر نکلا۔ سنگھار کمرے میں جا کر اس نے اپنے زینیں کپڑے اور گہنے اتارے۔ ایک سفید چادر کندھے پر ڈال کر ننگے پاؤں وہ ہجوم کی نظروں سے بچتا تماشا گاہ سے باہر آ گیا اور اس قدر تیز رفتاری سے شہر کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی مجرم قید خانے سے نکل بھاگا ہو اور ڈرتا ہو کہ پہرے دار اسے پھر سے نہ پکڑ لیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سراپوں میں تیز روشنی جل رہی تھی۔ طعام خانوں میں سے کھنکھتے تھقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شفا خانوں میں مریض لیے موت کا یا تندرستی کا انتظار کر رہے تھے۔ بازاروں میں چاندی اور تانبے کے سکے کھنک رہے تھے۔ سوتی ساریاں پہنے مزدور عورتوں کی ٹولیاں کپڑا بننے کے سرکاری کارخانوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہتھیار خانوں میں اسلحہ گھڑے جا رہے تھے۔ دریا کی بندرگاہ پر جہاز بن رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ ویشیاؤں کے علاقے میں سے گزرا جہاں ٹھکوں، جوار یوں، مدار یوں اور انٹی جادو گروں کے اڈوں پر جوا ہو رہا تھا۔ دور سے راج محل کے بلند کنگورے نظر آ رہے تھے۔

اس وقت سمرات اپنے دیوان خانے میں لیٹے چانکیہ مہراج کے ساتھ چتر

رنگ (شطرنج) کھیل رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر بھی وہ مسکرایا۔

ایک ویشیا اس کے قریب سے اسے بغور دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ غالباً یہ بھی دوسری قابل ویش ماریوں کی مانند جاسوسی کے محکمے میں ملازم تھی۔

سوال یہ ہے، چانکیہ مہراج سے کوئی پوچھے، اس نے دل میں کہا، کہ کون کس پر جاسوسی کرے گا؟ وہ پھر مسکرایا۔

اب اندھیرا چھا رہا تھا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے فسیل کے برجوں میں پہرے دار لگا رہے تھے، وہ ایک پھاٹک کے قریب پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اس شہر پناہ کے چونسٹھ پھاٹک ہیں۔ کونسا پھاٹک میری منزل کے راستے پر کھلتا ہے۔؟

پہرے دار نے اسے کوئی غریب باعزت برہمن سمجھ کر خاموشی سے باہر جانے دیا۔ وسیع خندق عبور کر کے وہ شاہراہ پر آ گیا جو پریاگ کی سمت جاتی تھی۔

سون ندی عبور کرنے کے بعد کئی دن تک وہ سرگرم سفر رہا۔ راستے میں اندھیرے جنگل پڑتے تھے اور ندیاں نالے۔ ندیوں کے کنارے سادھو تپسیا میں مصروف تھے۔ ون پرستھ، جو گرمیوں میں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھے، برسات میں بارش میں شرابور ہوتے، جاڑوں میں بھگے کپڑے پہنتے تاکہ جسم کی تکلیف زیادہ ہو۔ اسے یاد آیا وہ ابھی ایک بار بھول کے کانٹوں پر سویا تھا، پانی میں ایک مانگ سے رات بھر کھڑا رہا تھا۔

ون پرستھ کے بعد سنیا س کا دور آتا ہے جب تارک الدنیا انسان مستقل سفر میں رہتا ہے۔ غالباً میرا بھی یہی دور ہے، وہ زمانہ جس میں نہ موت کی تمننا رہتی

ہے نہ زندگی کی، وہ چلا کیا۔ راہ میں شہر تھے، سرکاری کھیت، آشرم، مور پالنے والوں کے گاؤں۔ اس کا ٹھکانہ کدھر ہے؟

لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی، وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی، وہ اس کا ساتھ دے گی۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرا نا شروع کیا: زمین (رگ وید کی ایک حمد) تیری پیڑیاں، برفانی پیڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں، میں مغلوب نہیں ہوا، مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں، مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

زمین تیرے اندر کیا کچھ ہے۔ تو جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے انسانوں کو اپنے اوپر لادے ہے، جس نے ہزاروں ندیوں کی صورت میں مجھے دولت عطا کی ہے۔ کون گاؤں، کون جنگل، کون سجاوٹیں زمین پر ہیں، جہاں ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔ زمین مجھے ٹھکانہ دے۔ مجھے کہیں ٹھکانہ دے۔

اسے چلتے چلتے کئی دن گزر گئے۔ طرح طرح کے پودوں اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک جھک آئیں پرندے اس کے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ چھیڑ رہی تھیں۔

کھیتوں پر بادل جھکے کھڑے تھے۔ لڑکیوں کی چڑیاں ہوائیں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے اس منظر کو دیکھا۔ بڑھتی جاؤ۔ بڑھتی جاؤ، اوجو کی بالیو۔ تاکہ ہمارے گھرے بھر جائیں۔ طوفانوں

سے محفوظ رہو۔ جو کی الوہی بالیو۔ سمندر کی طرح اٹھا رہو، وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ تمہارے کھلیان امٹ (رگ وید کی ایک حمد) رہیں۔ اس نے چپکے سے اپنی پلکوں کو خشک کیا۔ پھر آسمان کی اور دیکھا۔ بادلوں میں سے ایک قطرہ ٹپ سے اس کی پلکوں پر آن گرا۔ جس طرح پسلی میں بہار کی بوندیں ٹپک جاتی ہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پھر پگڈنڈی پر آ گیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے، وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس کے دل میں طوفانی دریا بہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار رگیت گارہے تھے۔ اس نے اندر کو اپنی معیت میں کھڑا پایا۔ رو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسرت میں ڈوب کر اس نے بادلوں پر نگاہ ڈالی۔ ایک درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بوندیں پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے بالوں کو بھگوتی رہیں۔ بارش کے قطرے اس کے خوبصورت اداس چہرے پر جھرنے کی طرح گرا کیے۔ اس نے آہستہ آہستہ روور کی تقلید کی:

رتھ بان (رگ وید کی حمد) کی طرح جو اپنے گھوڑوں کو کوڑے لگاتا ہے، وہ بارش کی آمد کی اطلاع دے رہا ہے۔ آسمان پر بادل امنڈ آئے ہیں اور دور سے شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ہوا تیز ہے اور بجلی چمکتی ہے۔ پودے تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور آسمان پر دھند چھائی ہے۔ زمین پر جگمگ رہے ہیں اور زرخیز بارش سب کے لیے بر سے گی۔ گرج اور دھاڑ۔ دھاڑ اور گرج۔ جگمگ۔ پانی کے زوردار چھینٹے اڑاتے رتھ میں اڑتا ہوا، برستا ہوا آ، تاکہ جل اور تھل

ایک ہو جائیں۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ پھر صبح ہوئی اور بارش تھمی اور روشنی پھیلی۔ کنجوں میں شکھ پھونکے جا رہے تھے۔ ندیوں کے کنارے برہمن اوشا کی حمد الپ رہے تھے۔

روشنی پھیل گئی۔ برہمنوں نے کہا۔

ان گنت آنے والی صحوں میں سب سے پہلی، گزری ہوئی صحوں کے راستے پر چلتی ہوئی اوشا زندہ انسانوں کو اٹھارہی ہے لیکن جو مرچکا ہے اسے وہ نیند سے نہیں جگائے گی۔

تو، جس کے رتھ میں اودے گھوڑے جتے ہیں، پروہت اور شاعر تیری تقدیس کرتا ہے۔۔۔ برہمنوں نے کہا۔

دولت مند لڑکی، آج کے دن ہم پر اپنا فضل کر۔

بہادر بیٹے اور گائیں اور گھوڑے عطا کرنے والی اوشا، شاعر اپنی حمد و ایو (ہوا) سے بلند تر آواز میں ختم کر رہا ہے۔

خداؤں کی ماں، جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔۔۔ اور ایسا ہو کہ مٹرا اور وردنا اور سندھو اور زمین اور آسمان ہماری حفاظت کریں۔ برہمنوں نے کہا۔

گو تم ہوا کے نرم جھونکوں کی زد میں چلتا آگے بڑھتا گیا۔

خداؤں کی ماں۔ جگمگائے جا اور ہمیں قوموں میں بلند ترین مرتبہ عطا کر۔

برہمنوں کی آواز اس کے پیچھے دریا پر پھیلتی گئی۔۔۔ وہ مندروں کی قطار کے

سامنے سے گزر کر پھر جنگل کے راستے پر آ گیا۔

سامنے ایودھیا تھا۔

تب وہ بھیگتی مٹی پر دو زانو بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان۔ تھکا ہوا شکست خوردہ۔ بے تاب۔ پر امید۔ انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے اور سامنے ایودھیا کا شہر اشر تھا، جو بارش کے دھندلکے میں یوں جگمگا رہا تھا مانوسارا کا سارا سونے کا بنا ہوا اور اس میں سے جگر جگر کرتی تیز کرنیں نکل رہی تھیں۔

پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں یقین تھا اور شان اور غرور۔ اس نے اپنے خدا کو لگا کر مخاطب کیا۔ اس نے کہا:

خداوند۔ تو جو آگ ہے، تو سورج ہے، ہوا، چاند، ستاروں والا آسمان، تو برہما ہے، پانی ہے، پر جاپتی ہے۔

تو عورت ہے، تو مرد ہے، تو نو جوان ہے، تو لڑکی ہے، تو وہ بوڑھا ہے جو اپنی لاٹھی ٹیکتا لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے، تو اپنے چہرے کا رخ برسمت کیے پیدا ہوتا ہے۔

تو گہری نیلی مکھی ہے، تو سرخ آنکھوں والا سبز طوطا ہے، تو طوفانی بادل ہے، تو سارے موسم ہے، تو سمندر ہے۔

۔۔ دو پرند، چہیتے دوست، ایک درخت پر بیٹھے ہیں۔ ایک پھل کھا رہا ہے دوسرا سے ٹکر کر دیکھتا ہے۔ اسی درخت پر انسان بیٹھا ہے۔ اس، اپنی کم طاقتی پر متحیر، لیکن وہ جو دوسرے کو مطمئن دیکھتا ہے اور اس کی عظمت پہچانتا ہے اس کا اپنا دکھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو رگ وید کی اس امٹ ہستی کو نہیں جانتا جس کے اندر خدا

رہتے ہیں رگ وید کا اسے کیا فائدہ ہوا۔؟ وہ جو اسے جانتے ہیں مطمئن بیٹھے ہیں۔

وہ جو اسے پہچان گیا، جو لطیف سے لطیف تر ہے، جس کے بہت سے روپ ہیں، جوشیو، یعنی سرور ہے۔

اور جب روشنی بلند ہوتی ہے تو نہ دن باقی رہتا ہے نہ رات، نہ وجود، نہ عدم وجود۔۔۔ صرف شیو باقی ہے، وہ ابدی روشنی ساوتری کی ہے، جس روشنی سے عقل پیدا ہوئی۔

اس کا حسن دیکھا نہیں جاتا۔ اس کے جلال اور عظمت کی شبیہ نہیں بن سکتی، وہ دل میں موجود ہے۔

تو جو پیدا نہیں ہوا، ان الفاظ کے ساتھ کوئی تھر تھر کانپتا تیرے نزدیک آتا ہے۔ اور رومی کی حفاظت کر۔

وہ دنیا میں تنہا پرندہ ہے، وہ آفتاب کی مانند ہے۔ جو سمندر میں ڈوب چکا ہے۔ انسان جو اسے جان جائے موت پر سے گزر جائے گا۔
کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سفر کا نہیں۔

پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا جسم مرتعش تھا، جس طرح تان پورے کے تار جھنجھکتے ہیں۔ اس کے قدموں کے نیچے پانی کے بہنے کی آواز آرہی تھی۔
اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سر جو بے نیازی سے رواں تھی۔

پھر اسے لگا جیسے اسے کوئی دور سے آواز دے رہا ہے بارش کی وجہ سے دریا کا پاٹ بجد وسیع ہو چکا تھا۔ اس نے غور سے سنا لیکن آواز اس کے کانوں تک صاف

نہیں آرہی تھی۔ اس نے بہت غور سے، ماتھے پر ہاتھ کا سایہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر نارنجی پوشاک میں ملبوس ایک بیولے سا ڈول رہا تھا۔

تب اس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی (اس لڑکی نے کیسری ساری پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے) سے پوچھا: ”کچھ جانتی ہو، ندی کے اس پار کون رہتا ہے؟“

”کچھ بھکشو لوگ ہیں۔“ لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ ”وہ ان میں سے ایک سامنے کھڑا تو ہے۔“

”تم اسے جانتی ہو؟“

”میں اسے جان کر کیا کروں گی۔۔؟“ لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

”اچھا ذرا میں اس سے مل آؤں۔“

”ایسی طوفانی ندی کو پار کرو گے؟۔۔ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔“

”کیا حرج ہے۔۔ ندیاں پار کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔“

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے، پیسے چلاتے تھے پھنورے گونج رہے تھے۔ بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں پر آن گرے۔ اس نے جھک کر انہیں اٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی میں کود گیا اور دوسرے کنارے کی طرف پیر نے لگا۔

دوسرے کنارے پر ایک ادھیڑ عمر کا بھکشو، نارنجی پوشاک میں ملبوس، دیر سے

اس کی راہ تک رہا تھا۔ گوتم کو اپنی اور آتے دیکھ کر اس کا چہرہ انبساط سے جگمگا اٹھا۔
وہ ندی آدھی سے زیادہ عبور کر چکا تھا تب اس نے بھکشو کی آواز سنی:
”بھائی گوتم۔“

”ہاں بھائی بری شکر۔۔۔ پہنچتا ہوں۔۔۔ ٹھہرے رہو۔۔۔“ اس نے زیادہ
تیزی سے پیرنا شروع کر دیا۔

اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریا آیا جس کے تھپڑے سے وہ کنارے کے
بہت قریب پہنچ گیا مگر اب پانی کی لہریں اونچی ہو چکی تھیں۔ اس نے پوری طاقت
سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی
کشکش میں اسے ایک چٹان ایسی نظر آئی جو پانی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چنڈی
کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا جو باہر کو جھک آیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی ایک
لکڑی کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس
نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریا پانی کو بہائے لیے جاتا تھا۔ چاروں
اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اسے ایک لمحے کے لیے اپنی
حفاظت کا احساس ہوا کیونکہ پتھر، جس کا ماضی سے تعلق ہے، آنے والے زمانوں
میں بھی ایسا ہی رہے گا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو
اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔

سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمصور مال
الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیاہ کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا

اور چاروں اور نظر ڈالی۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو یہ جگہ بڑی سہانی معلوم ہوئی۔
 سامنے ندی بہہ رہی تھی۔ دور جھونپڑے بنے تھے۔ شوالوں میں سے گھنٹوں کی
 آواز آ رہی تھی۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی پیر کا مزار تھا۔ گاؤں کی عورتیں
 گھونگھٹ کاڑھے آتیں اور مزار پر پھل پھول چڑھا کر آگے چلی جاتیں۔ اس
 نے جھک کر پانی میں انگلیاں ڈبوئیں اور پانی کی خنکی اسے بہت اچھی لگی۔ پتھروں
 کے نیچے، جہاں لہروں کا بھنورا یا بنا تھا، اس میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا اور ایک لحظے
 کے لیے وہ متعجب سا ہو گیا، وہ یہاں آ کر کیا کر رہا ہے؟

چمپا اب تک نہ آئی تھی۔ اس نے دوبارہ ندی کی طرف دیکھا۔ شاید کشتی میں
 آتی ہو، مگر کشتی میں چند دیہاتی بھیجن گاتے اپنی دھن میں لگن ایک سمت کو چلے جا
 رہے تھے۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک جھاڑی پر پھیلی ہوئی امر بیل کا ایک پتا
 توڑا۔ کدم کی ٹہنی پھولوں سے لدی تھی۔ چند پھول ٹپ ٹپ اس کے سر پر آ
 گرے۔ اس نے پگڑی اتار کر ان پھولوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی تلوار کے منتقش قبضے
 کو چھوا۔ پھولوں کے اس جھوم میں تلوار اسے بہت بے تکی معلوم ہوئی۔ اس نے
 آہستہ آہستہ تلوار کمر سے علیحدہ کر کے گھاس پر رکھ دی۔

تب پانی میں پیرتی ہوئی چمپا گھاٹ پر آ گئی۔

”ہم تو سمجھے تھے تم کہیں اور مارنے مارنے کے لیے چک دیے۔“ اس نے
 ہنستے ہوئے کہا۔

”ابھی تک تو نہیں۔ پر اب شاید چلا جاؤں۔ کچھ عرصے بعد۔“

”کہاں۔“ لڑکی نے گھبرا کر پوچھا۔

”بہار۔۔ اور اس سے بھی آگے، بنگال۔۔“

”وہاں جا کر کیا کرو گے۔ یہیں رہو۔“

”وہاں میرے بھائی بند ہیں۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تمہارے بھائی بند کہیں پہاڑوں میں لوٹ مار مچاتے

ہوں گے۔ گوڑ کے دربار میں ان کا کیا کام۔“

”تم میرے بھائی بندوں سے بہت نفرا ہو اور دوسری بات یہ کہ وہ لوٹ مار

نہیں مچاتے۔ یہ ترکوں اور انغانوں کا مشغلہ ہے۔ میں غرب ہوں۔ میرا کام فلسفہ

دانی ہے اور۔“ اس نے فرارک کر کہا، ”میری ماں ایرانی تھی اور ایران والے، او

بیوقوف لڑکی، شعر کے پرستار ہیں، خون نہیں بہاتے۔“

وہ اسی طرح ہنستی رہی۔ اب وہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے بال سکھا رہی

تھی۔

”ہنستی رہو۔ ایک روز زبردستی اڑا کر لے جاؤں گا۔ پھر بعد میں جو چاہنا

کہنا۔“

”ہے ہے۔ ایسا اندھیر نہ کرنا۔ شکر کرو یہ گاؤں ہے جہاں تم سے بات کر لیتے

ہیں تو کوئی برا نہیں مانتا۔ جو پور میں اگر اس طرح تم گھنٹوں ہم سے باتیں کرتے تو

دیکھتے اپنا حشر۔“

”جو پور میں تو میں تم کو قطعی بھگا لے جاتا۔ لے جا کر سیدھا اپنی حویلی میں بند

کر دیتا۔“

”رام رام۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ جو پور میں ہمارا ایسا مہا تما سمان بادشاہ

رہتا ہے، مجال ہے جو تم ایسی حرکت کرتے۔“

”اجی دیکھے ہیں تمہارے مہاتما سمان بادشاہ۔“

”کیوں۔ ایسے ایسے گیت بناتا ہے۔ جو انسان اتنا بڑا سنگیت کا رہو وہ دیوتا نہیں تو اور کیا ہوگا۔ ایک روز بھین نے مجھے ایک بڑا پیارا گیت حسینی کا سنا دیا تھا۔ بھین کہتے تھے کہ یہ سلطان کی سنگیت ہے۔ اسے خیال کہتے ہیں۔“

”اب تم موسیقی پر تقریر کرو۔ اور کل تم اپنے برآمدے میں بیٹھی کس کو حسینی کا سنا سنا رہی تھیں؟ تم کتنے آدمیوں سے ملتی ہو۔؟“

”تم کو اس سے مطلب۔ کمل جی تم اپنا رعب مجھ پر مت جھاڑو۔ صوبیدار ہو گے اپنی فوج کے ہو گے مجھ پر کا ہے کی دھونس ہے۔“

میں صوبیدار نہیں ہوں۔ الاحول والاقوة۔۔۔ ویسے سپاہی کا پیشہ ہی مرد کو بختا ہے۔“

”قاتل کا پیشہ۔۔“

”پھر تم نے کمینی باتیں شروع کیں۔“

”اچھا اب نہیں کہنے کے، مگر ہو تم قاتل ضرور۔۔۔ جانے کتنی ماؤں کے بیٹوں کو اس تلوار سے مارا ہوگا۔ ہائے ہائے۔“

”پھر وہی مرنے کی ایک مانگ، کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں فوجی نہیں ہوں۔“

سلطان کے کتب خانے کا نگران ہوں۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“

”اس میں کتابیں لکھی جاتی ہیں، سکتیس، جنہیں سمجھ دار لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ

جو ٹیڑھی میڑھی لکیریں تمہارا بھائی صبح سے شام تک چوکی پر بیٹھا بائیں سے دائیں طرف کھینچا کرتا ہے ان کی کتابیں بنتی ہیں۔ سمجھیں۔“

”جانتی ہوں، مگر پھر یہ تلوار کیوں باندھتے ہو۔۔۔ یہ بڑی خوفناک چیز ہے۔“

”چمپارانی اسے مردوں کا زیور کہتے ہیں۔ اس کے اور پگڑی کے بغیر لباس مکمل نہیں ہوتا۔ تم اودھ والوں نے افسوس کہ چتوڑ اور قنوج اور مالوے اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت نہیں دیکھے۔ دیکھے ہیں کبھی! ایک مرایار ہے اودھے سنگھ راٹھور۔ قنوج کا راجپوت ہے۔ کیا بانکا آدمی ہے۔ آج کل جانے کہاں ہوگا۔ سنا تھا گوالیر کے کرت سنگھ کی فوج میں ہے۔ پتا نہیں شاید مالوے میں کہیں لڑ بھڑ رہا ہوگا۔“ مال الدین چند لمحوں کے لیے اپنے میدان جنگ کے ساتھیوں کی یاد میں ڈوب گیا۔ ”تم پورب والوں کا اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں کہ بس گائیں بچائیں گے، پوجا پاٹ میں لگے رہیں گے۔ ارے لڑکی زندگی کا اصل لطف تو میدان جنگ میں آتا ہے۔“

”ابھی تو تم کہتے تھے کہ مارنا مرنا خالی افغانوں کا کام ہے، تم کو بتا لکھتے ہو۔“

وہ جھنجھلا گیا: ”تم عورتوں سے بحث کون کرے۔“ اس نے امرتیل کا ایک پتا

اور توڑا۔

”دیکھو، لڑکی گھاٹ پر سے اٹھی اور اپنے سیاہ لمبے بالوں میں سے پانی جھٹک کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے بولی، ”جنگ کی باتیں مت کیا کرو۔ میں جب تم کو دیکھتی ہوں اور یہ تلوار دیکھتی ہوں تو مجھے بڑا وہم آتا ہے۔“

وہم۔۔۔ وہ کیا چیز ہے؟“

”تم کو سمجھانا بیکار ہے۔“ وہ پھر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

کمال الدین نے درختوں کے سائے کی اور دیکھا جو ڈھلتے جا رہے تھے۔

”اچھا چپاوتی تم کو خدا کے حوالے کیا۔“ وہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

”ایو دھیا سے تم ابھی چلے جاؤ گے؟“

قریب سے درویشوں کی ایک ٹولی گزری، ان میں سے ایک نوجوان نے چپا

اور مال کو دیکھا اور پھر نظریں نیچی کر لیں اور سر جھکائے آگے چلا گیا۔

”یہ بھی کیا مسخرے لوگ ہیں۔“ کمال نے اظہار خیال کیا۔

”مسخرے نہیں ہیں۔ بڑے پیارے لوگ ہیں۔ ان کا مذاق مت اڑانا۔“ چپا

نے یکلفت غصے سے کہا۔ ”ایک روز یہی تمہارا ساتھ دیں گے۔“

”تمہارے بھائی نے تمہیں اچھی خاصی پنڈتاکن بنا رکھا ہے۔ میں کسی روز

اس سے مناظرہ کروں گا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“

”اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔۔“ کمال الدین نے جاتے جاتے مڑ کر رکاب میں

سے پیر نکال کر اسے سمجھانا شروع کیا، ”کہ جیسے دو مذہب ہیں نا۔۔ ایک تمہارا۔۔

ایک میرا۔۔“

”میرا اور تمہارا کوئی الگ الگ مذہب ہے۔۔؟ میں تو ایک ہی سمجھتی ہوں۔“

”پھر تم نے خرقہ پوشوں والی باتیں شروع کر دیں۔۔ تو مطلب یہ۔۔“ اس

نے پھر سمجھانا شروع کیا۔۔ ”کہ دو فریق اپنے اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے

کی کوشش کریں، اسے مناظرہ کہتے ہیں۔“

”سچائی ثابت کرنے والے ہم اور تم کون۔۔۔ وہ تو سنیہ پیر ہے جو سب جھوٹ
 سچ کا فیصلہ کرتا ہے۔ کہے کبیراک رام چپوری۔ ہندو ترک نہ کوئی۔“
 ”پھر تم نے تقریر شروع کی۔ تم کاشی جا کر اپنے کبیر کی چیلی کیوں نہیں بن
 جاتیں۔ مجھ سے ٹیٹھی ٹیٹھی باتیں کرنے میں اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہو۔“
 ”کاشی تم کو بھی ساتھ لے جائیں گے مگر اس سے پہلے تم کو اپنی تلوار اتارنا
 پڑے گی۔“

”یہی شرط ہے؟“

”بالکل یہی شرط ہے!“

”تم کو تو جو پور کا قاضی ہونا چاہیے تھا۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔۔۔“

وہ دریا کی طرف بڑھا۔ ”اس پار وہ ٹوٹے پتھروں کا اونچا ڈھیر ایسا کیا ہے؟“
 ”وہ۔۔۔ ارے وہ تو بہت پرانے مندر کے کھنڈر ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں برس
 پرانے۔۔۔“

”اور اس کے اوپر وہ جھونپڑیاں ایسی ہیں، ان میں کون رہتا ہے۔“

”ان میں بھی صوفی لوگ رہتے ہیں۔۔۔ بھگت۔۔۔“

”تب تو تمہارا وقت بہت اچھا کٹا ہوگا۔۔۔ صوفیوں کی سنگت۔۔۔ مسئلے مسائل

، ذکر افکار۔۔۔ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے لیے کس قدر دلچسپ مشغلے ہیں۔“

”اور کیا کریں۔۔۔ تمہارے جو پور کی شہزادیوں کی طرح محل سرا میں بیٹھ کر

شطرنج کھیلا کریں۔“

”بالکل۔۔۔ لیکن میری محل سرا میں شطرنج کے علاوہ کتابیں بھی ہیں۔

سینکڑوں۔۔ اور تم اس قدر عالم فاضل پہلے ہی سے ہو۔ میں تم کو عربی فارسی بھی پڑھا دوں گا۔“ وہ دفعتاً جھینپ کر سرخ ہو گئی۔ مال نے اسے تبسم کے ساتھ غور سے دیکھا۔ ”مگر تم عربی بولتی عجیب مسخری لگو گی۔۔ نہیں بھائی۔ تم چپاوتی ہی رہو۔ تمہارے روپ میں میں نے عورت کا حسین ترین روپ دیکھا ہے۔۔ اچھا خدا حافظ۔۔“ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا۔

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے: ”تمہارا پڑاؤ یہاں ختم ہوا۔ اب کہاں جاتے ہو؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”بہرائج۔۔ وہاں جانے کتنے دن لگ جائیں۔“

”بارشیں شروع ہونے والی ہیں، اپنا خیال رکھنا۔“

”ہاں۔ میں اپنا خیال رکھوں گا۔ خدا حافظ و ناصر بیوقوف لڑکی!“

وہ اسے بیوقوف لڑکی کہا کرتا تھا اور اس خطاب میں کتنا اتھاہ پیار چھپا تھا۔ وہ آنسو پی کر مسکرائی۔ مال الدین نے گھوڑے کی باگیں موڑیں اور سڑک پر پہنچ کر غبار میں غائب ہو گیا۔

لڑکی گھاٹ پر اسے اٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی جس کی کچھریل پر نیلے پھولوں کی بنیلیں چڑھی تھیں اور جس کے سبز رنگ کے کواڑوں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگ برنگی تصویریں منقش تھیں۔ برآمدے میں اس کا بڑا بھائی چٹائی پر بیٹھا کبیر کی نئی بانی کاغذ پر نقل کر رہا تھا۔ اس کے قریب دو تین دوست اور بیٹھے تھے۔ دروازے طاق پر بھوانی کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی جس کے سامنے رکھی ہوئی دھوپ کی پتلی سی لکیر لہرائی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ چپا نے دروازے کے

قریب کھڑے ہو کر اس پرسکون منظر کو دیکھا اور اپنے آنسوؤں کو خشک کرتی ہوئی
اندر چلی گئی۔

۱۸

بہرائی کی چھوٹی سی آبادی میں پہلے رنگ کے کچے مکان ادھر ادھر بکھرے
تھے۔ خاک آلود راستوں پر سے بیل گاڑیاں گزر رہی تھیں اور اسی کی بے رنگ،
بے نام کیفیت سارے میں طاری تھی۔ سنا تھا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بے
حد عظیم الشان شہر آباد تھا جسے شراوتی کہتے تھے۔ اس کے سوم ونشی بادشاہ بڑے جاہ
وجہ والے تھے اور نجومیوں نے شراوتی کے سوبل دیو سے کہا تھا کہ ایک وقت
آنے والا ہے جب اتر سے دیو زاد بلند و بالا ترک آ کر تمہارا خاتمہ کر دیں گے اور
غزنی کے محمود کا ایک سپہ سالار ادھر آیا جس کا نام مسعود غازی تھا اور اس مسعود
غازی نے سوبل دیو کا خاتمہ کر دیا اور دلی میں قطب الدین ایبک آیا اور اس کے
سپہ سالار احمد بختیار نے کوشل دیس اور مگدھ اور بنگال کے سارے بت پرست
بادشاہوں کا خاتمہ کر دیا۔

اور شراوتی اور نالندہ اور وکرم شالا کے سارے برہمچاری اور بھکشو اپنے اپنے
پوتھی پترے وہیں چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے یا مر کھپ گئے یا نیپال اور تبت کی
اور نکل گئے۔

لیکن جس طرح شاکیہ منی پچھلے دو ہزار سال میں وشنو کے اوتار بنا دیے گئے

تھے اور مہایان بدھ مت کے مندروں میں ہزاروں دیوی دیوتا آباد ہو چکے تھے اور
 سارا بنگالہ اور سارا بھارتا نترک منتروں اور وہی تارا کے بھجوں کی سریلی آوازوں
 سے گونج رہا تھا اسی طرح بت شکن سالار مسعود غازی گچھلی دوسدیوں میں بالے
 میاں کے روپ میں کوشل دیس کے سنواسیوں کے لیے ایک اور دیوتا بن چکے
 تھے۔ ان کے مزار پر گھٹی کے چراغ جلائے جاتے۔ ان کے جھنڈے اٹھائے
 جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی بارات نکلتی۔
 یہ کیسی عجیب باتیں تھیں۔

ابو المنصور مال الدین، جو پہلی دفعہ بہرائچ آیا تھا، سالار مسعود کی زیارت گاہ
 کی دیوار سے لگ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور اچنبھے سے عورتوں کی ایک
 ٹولی کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں سنبھالے سامنے مزار پر چڑھاوا
 چڑھانے کے لیے آ رہی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں تھیں۔

اور گونا گوندہ اور وکرم شیا اور اجین اور امر اوتی کے عظیم الشان بین الاقوامی
 والا علوم اب اجڑ چکے تھے اور شراوتی کے پرانے آشرم سنسان پڑے تھے اور ان
 پوتھی پتروں کو سمجھنے والا اب کوئی نہ تھا جو عجیب و غریب زبانوں میں لکھے گئے تھے
 اور عجیب و غریب باتیں ان میں لکھی تھیں، ناقابل فہم فلسفے اور عقل سے بالاتر
 الہیات۔

مگر کچھ لوگوں کو پیدائشی سنک ہوتی ہے اور کشمیر کے زین العبدین اور گوڑ کے
 علاؤ الدین حسین شاہ کی طرح جو پور کا حسین شرقی بھی انہی سبکی لوگوں میں سے
 تھا۔ ان بادشاہوں نے مزید بت شکنی کے بجائے ان پوتھی پتروں میں دلچسپی لینا

شروع کر دی۔

حسین شرقی کو جب بھی دلی کے سلطان بہلول اور سلطان سکندر سے جنگ کرنے سے فرصت ملتی وہ اپنا طنہورہ لے کر بیٹھ جاتا۔ راگوں کی دنیا کی نئی نئی سیاحتیں کرتا یا قدیم نسخوں کی ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ پچھلے دنوں اسے ایودھیا کے چند پنڈتوں سے معلوم ہوا تھا کہ بہراج کے کسی مٹھ میں ڈیڑھ پونے دو ہزار سال پرانے سنسکرت کے کچھ تانب پتر موجود ہیں۔ اس نے اپنے کتب خانے کے جواں سال نگران ابوالمنصور مال الدین کو ان پنڈتوں سے ملنے کے لیے ایودھیا بھیجا۔

مال الدین ایودھیا چند دنوں کے لیے گیا تھا لیکن اس کا وہاں اتنا جی لگ گیا کہ اسے تقریباً یاودی نہ رہا تھا کہ اسے وہاں سے آگے ترائی کی طرف بھی سفر کرنا ہے کیونکہ ایودھیا میں اسے انہی پنڈتوں میں سے ایک کی بہن نظر آئی جو چمپاوتی کہلاتی تھی۔

اپنے وقیانوسی فلسفوں کو چھوڑ کر سلطان کے حکم کے مطابق، جن کی تلاش میں مال ان کے پاس گیا تھا، سرجو کے کنارے رہنے والے یہ پنڈت لوگ ایک نئے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اس چکر کا نام انہوں نے بھگتی رکھ چھوڑا تھا، وہ لوگ دن رات نرگن رام، نرگن رام جپورے بھائی کی رٹ لگایا کرتے۔ ان ہی کے یہاں مال الدین شکر اچاریہ اور ولہ اور رامانند کے ناموں سے آشنا ہوا اور اب وہ سب کے سب کاشی کے بھگت کبیر کے پیچھے دیوانے ہوئے جا رہے تھے لیکن مال کو بھگت کبیر یا کسی اور بھگت یا سنت یا اچاریہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ

اپنے آپ کو فلسفی نہیں سمجھتا تھا، وہ مورخ بننا چاہتا تھا۔ اسے دنیا کی قوموں کی تاریخ بڑی عجیب لگتی۔ سلطان نے اسے مختلف مبہم قسم کی تاریخیں لکھنے پر مامور کر رکھا تھا اور اس کا وقت بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ لیکن اب سلطان کا حکم تھا کہ پنڈتوں کی مدد سے سنسکرت اور پالی اور پراکرت اور اردھ مگدھی میں لکھی ہوئی ان بے تکلی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ یہ کام بھی زیادہ غیر دلچسپ نہ تھا گو وہ جلد از جلد جو پورو آپس پہنچنا چاہتا تھا جہاں شاہی محل میں سلطان کی بھانجی رہتی تھی جس کے لیے اس نے بہت سی نظمیں لکھی تھیں اور جس کے تصور میں اسے نے بہت سی چاندنی راتیں کتب خانے کی برجیوں میں بیٹھ کر جاتے ہوئے گزار دی تھیں۔

لیکن ایودھیا میں اسے ایک برہمن زاوی ملی جو اس سے ہر وقت کبیر کی باتیں کیا کرتی، اس سے اپنی سیدھی بحثیں کرتی اور کچھ عرصے کے لیے وہ جو پورو کی شہزادی کو بھول گیا۔

اب وہ چمپاوتی ہی کے خیال میں کھویا رہتا کیونکہ وہ بڑی انوکھی، بڑی نجی سی چیز تھی۔ ناجیہ اور ام رباب اور شہزادی سلیمہ بانو بیگم سے بالکل مختلف۔ مرد ہمیشہ تنوع پسند کرتا ہے۔

پرانی کتابوں کی جستجو میں وہ سارے مٹھوں میں گیا جو پانچ چھ سو سال قبل یہاں شکر اچاریہ کے چیلوں نے قائم کیے تھے۔ شراوتی کے کھنڈروں میں گھوما جو بہرائچ کی بہتی بہت مہت کے علاقے میں پڑے سائیں سائیں کر رہے تھے اور جہاں دن میں الو بولتے تھے اور رات میں چمگاڈریں اپنے پر پھیلاتی ہیں۔ ایک روز اسے انہی کھنڈروں میں پتھروں اور شہتروں کا ایک بہت بڑا انبار نظر آیا جس

کے چاروں طرف گلیاں تھیں۔ یہاں کبھی شاندار بازار رہا ہوگا اور اونچی اونچی
 حویلیاں بنی ہوں گی، وہ حیرت اور اشتیاق کے ساتھ اس عمارت کے اندر گیا۔ اس
 کے سارے کمروں میں گھوما۔ گودام، نشست کے ایوان، جن کی دیواروں میں
 آتش دان تھے، کوٹھڑیاں، غسل خانے، آبلگوں میں بنے ہوئے کنویں اور
 تالاب۔ مکان کے شمالی مشرقی حصے میں چھوٹا سا مندر تھا۔ جنوبی مشرقی کونے میں
 باورچی خانہ تھا۔ پندرہ سولہ کمرے سارے میں پھیلے تھے۔ چاروں طرف
 برآمدے تھے۔ اوپر کی منزل میں جھروکے تھے۔ وسط میں آنگن کے گرد گرد جو
 برآمدی تھا اس کے ستون ٹوٹے پھوٹے بکھرے پڑے تھے۔ ان ستونوں کے
 اختتام پر ہاتھی کے سر ترشے ہوئے تھے۔ یہ جانے کس کا مکان رہا ہوگا، مال نے
 سوچا۔ پھر اس نے ایک دیہاتی کو آواز دی جو گھاس کا گٹھاسر پر اٹھائے سامنے کی
 شکستہ گلی میں سے گزر رہا تھا۔ دیہاتی رک گیا اور اسے پراسرار، سوالیہ نظروں سے
 دیکھنے لگا۔ مال کو ایک پھریری سی آئی۔ اس نے ہمت کر کے حلق صاف کیا اور
 بولا: ”اے بھائی۔۔۔ جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟ یہاں کے راجا کا تو نہیں۔۔۔“
 ”راجا کا۔۔۔“ دیہاتی کھلکھلا کر ہنسا گویا بہت بڑا لطیفہ اس نے سنا ہے۔
 ”ارے راجا کا مکنا اتنا چھوٹا۔۔۔؟ راجا کے محل پر تو بل چل گئیں۔ ای تو ہجارن
 برس پرانی حویلی ہوئے۔ پرکھن سے سنے ہن ای ما کوؤ باہمن پروہت رہت
 رہے۔ ان کا لڑکوا ہو بڑا اور وان رہا۔“

”اس لڑکے کا نام جانتے ہو۔۔۔؟“

”ہم کا جانی۔۔۔ ہم نیچ نام ناہیں یاد رکھت ہن۔ نام مٹ جات ہیں۔ کھالی

کھدائے کا نام امر ہو۔۔“ اتنا کہہ کر وہ اپنا گٹھا سنبھال کر آگے بڑھ گیا۔

کمال کو بڑی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ سلطان کا فرمان ہے اس ملک کی تاریخ لکھو۔ ایسے ابدیت پرست لوگوں کی تاریخ کس طرح لکھی جاسکتی ہے جو اپنے نام یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے!

پھر اس نے مٹھ میں جا کر ایک پنڈت سے پوچھا: ”کھنڈروں میں سے جو سب سے بڑا کھنڈر ہے وہ کس کا ہے۔“

اس نے بھی کمال کو بڑی پر اسرار نظروں سے دیکھا گویا یہ غیر ملکی عالم کیما فضول سوال کر رہا ہے۔ ”یہاں ان گنت چکرورتی راجہ ہو کر گزر گئے ہیں۔ چندر گپت موریہ، اشوک پر یہ درشن، سمر گپت۔ چندر گپت موریہ سے قبل یہاں بڑے بڑے چتر کار رہتے تھے اور سنگتراش اور لیکھک لیکن ان کے نام ہم کو معلوم نہیں۔ نام مٹ جاتے ہیں انسان زندہ رہتا ہے۔“

”لاحول والاقوة۔“ کمال نے دل میں کہا۔ تاریخ لکھنا ناممکن ہے، ان تائب پتروں کے مصنفوں کا نام بھی موجود نہیں تھا جن کا ترجمہ کروانے کے لیے وہ یہاں آیا تھا، وہ گھوم پھر کر اسی کھنڈر میں واپس آ گیا اور ایک ٹوٹے ہوئے ستون پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

لیکھت اسے بغداد اور نیشاپور کی یاد نے بے طرح ستانا شروع کر دیا۔

کمال اس ملک میں تازہ وارد تھا، اسے جو پور میں رہتے صرف چند سال گزرے تھے۔ بائیس سال کی عمر تک اس نے بغداد کے مدرسے میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بہت سے نظریوں پر غور و فکر کیا تھا، وہ بخارا کے ابن سینا، الفارابی اور ایران کے فخر الدین رازی اور اندلس کے ابن رشد اور ابن العربی کا مفصل مطالعہ کر چکا تھا۔ ابن خلدون کو وہ اپنا گرو سمجھتا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ عرب اقوام کی تاریخ لکھنا شروع کرے۔ ابن خلدون کے مکتب سے تعلق رکھنے والے چند مفکروں سے ملنے کی غرض سے وہ مغرب کی طرف روانہ ہونے والا تھا جب قاہرہ میں اسے اطلاع ملی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ واپس لوٹا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔ نیشاپور میں اس نے اپنے ایک دوست سے سنا کہ اہل سیف کے ساتھ ساتھ اہل علم بھی اب ایک نئے ملک کا رخ کر رہے ہیں جس کا نام ہند ہے۔ کمال نے اپنی محبوب کتابیں اپنے ساتھ لیں اور وسط ایشیا، کشمیر اور لاہور سے ہوتا ہوا تعلق آباد پہنچا۔

دنیا عجیب ہنگاموں کے دور سے گزر رہی تھی بلکہ کمال کو تو یاد تھا کہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب بے چارے انسان پہ کوئی نہ کوئی قیامت نہ گزری ہو۔ پچھلی صدیوں میں تاتاریوں کی یلغار نے ملکوں کو تہ و بالا کر دیا۔ عیسائی سطور یوں اور ایران کے آتش پرستوں اور اندلس کے یہودیوں اور عرب کے مسلمانوں نے مل جل کر علم کا جو دھوم دھام سے چراغاں منایا تھا وہ صحرائے گوبی سے اٹھنے والی زرد آندھیوں نے سارا کا سارا بجھا کر رکھ دیا۔ بنو امیہ کا ذائقہ، بنو عباس کا بغداد، عبدالرحمن کا اشبیلیہ۔ آنکھوں کے سامنے کیسی کیسی تصویریں کھینچتی تھیں۔ اس

قیامت کے بعد بچا کھچا علم جو باقی رہا تھا وہ مسلمان اقوام کی آپس کی تفرقہ اندازیوں اور تنازعوں کی نذر ہوا۔ خیالات کا اتھنٹر، جسے دوبارہ آباد کیا گیا تھا، بغداد کے ساتھ ساتھ اجڑا۔ اسکندریہ کی خانقاہیں سنسان ہوئیں، صرف ایک خیال باقی رہا۔ دنیا ناپاکدار ہے، دنیا فانی ہے، دنیا قابل نفرت ہے۔ فلسفہ اب محض شیعوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا اور شیعہ ہمیشہ بڑی گڑ بڑ پھیلاتے تھے، ہر قسم کی نظریاتی اور سیاسی فتنہ پردازی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔

اب سلجوقی ترکوں کا دور دورہ تھا۔ ان جہانباہوں کو نئے نئے ملک تسخیر کرنے سے ہی کہاں فرصت تھی کہ وہ فلسفے کی ریشہ دوانیوں میں اپنا سر کھیلتے اور ہر حال وہ بھی راسخ العقیدہ کٹر سنی مسلمان تھے، عجمی شیعوں کی طرح بدعتی تھوڑا ہی تھے۔

عربوں کا ذہن، ایرانیوں کے فنون لطیفہ، تاتاریوں کے حملے سے سب کا خاتمہ بالآخر ہو چکا تھا مگر اس کے ایک سو سال بعد سمرقند اور ہرات میں پھر روشنی ہوئی۔ مصوری میں چین اور ایران کے نقوش ہم آہنگ ہوئے۔ یہ تخریب پسند تاتاری مغرب میں مسلمان ہوئے مشرق میں انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ سبکتگین کے دور میں کابل کے ہندو تر کی شاہیہ بادشاہ مسلمان ترکوں میں تبدیل ہوئے۔

گو انسان کو اب بھی چین نصیب نہیں تھا۔ محمود کے متعلق البیرونی نے کہا کہ ہندو اس حملے سے ریت کے ذروں کی طرح بکھر گئے۔ ان کی کہانی داستان پارینہ میں شامل ہو چکی ہے، جو باقی ہیں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

جس طرح بغداد اور اسکندریہ تباہ ہوا تھا اسی طرح متھرا اجڑا اور مالندہ، قنوج

اور اجین۔ یہ سب انسانوں کی بستیاں تھیں جن میں عام مرد اور عورتیں رہتے تھے اور جنہوں نے ان کو ختم کیا وہ بھی عام انسان تھے۔

مگر اس افراتفری، اس قتل و غارت، ان جنگوں اور معرکوں کے گرد و غبار کے پیچھے علم کے چراغ ٹٹماتے رہے، کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت کا چراغ کبھی نہ بجھ سکا!

اور اسی خوریز دور میں جنوب کے پرسکون ساحلوں پر خوبصورت کلیسا تعمیر کیے جا رہے تھے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی شاداب بستیوں میں پھولوں کے تہوار منائے جاتے تھے اور عرب تاجروں کی آبادیوں میں رات کے وقت قانون، عود، نے اور نفیر کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور مہابلی پورم کے مندروں میں رقص ہوتا تھا۔

یہ لوگ بھی عام انسان تھے مگر امن سے رہنا جانتے تھے۔

انتشار اور بد امنی کے اس دور میں صوفیوں کی خانقاہوں میں علم محفوظ رہا اور خرقہ پوش قلندر اب ایک ایک کر کے اس نئے ملک کی طرف آ چکے تھے اور آ رہے تھے جسے محمود نے تسخیر کیا تھا۔ ان قلندروں نے بنگال، بہار، اودھ، راجستھان، دکن اور گجرات، سندھ اور پنجاب میں نئے ویاہار آباد کیے۔

محمود یہ نہ جانتا تھا کہ خیالات کے صنم خانے ہمیشہ آباد رہیں گے۔ دنیا کا نقشہ بدل چکا تھا۔ قریطہ کی مسجد میں عیسیٰ ابن مریم کے مجسمے سجا دیے گئے تھے۔ قسطنطنیہ کے کلیسائے صوفیہ کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ تموجن کا پوتا، ترچھی آنکھوں اور پیلی رنگت والا چغتائی ترک، دلی کو تھس تھس کر کے سمرقند واپس

جا چکا تھا۔

شرقیہ سلطنت ہند میں تہذیب کا عظیم الشان مرکز بنی ہوئی تھی۔ جوہنپور شیراز ہند کہا رہا تھا۔ اس سلطنت کو قائم ہوئے ابھی فقط ستر سال گزرے تھے۔ صاحبزادوں کے حملے کے بعد کی گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر ملک الشرق خواجہ جہاں نے اس کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے سلاطین اپنے آپ کو غیر ملکی نہیں گردانتے تھے۔ دکن کی بادشاہتوں کی مانند ان کی حکومت بھی خالص ہندی حکومت تھی، انہوں نے خوبصورت عمارتیں بنائی تھیں، گلاب کے باغ لگائے تھے۔ دور دور سے اہل علم آ کر جوہنپور میں جمع ہو رہے تھے۔

ابوالمصور مال الدین نے بھی دلی میں چند روز ٹھہرنے کے بعد جوہنپور آ کر دم لیا۔

اس کے سامنے ایک بالکل نئی عجیب و غریب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ جوہنپور، کاشی، ایودھیا اور بہرائچ اور ان سب جگہوں کے مسلمان ان سے بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ جوہت پرستوں کے طریقے سے رہتے تھے۔ شمشین پوشوں اور جوگیوں کے ساتھ درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر گیت گاتے اور جھومتے تھے۔ ان کی عورتیں عبا میں پہننے کے بجائے عجیب طویل سی سفید یا رنگین چادر جسم سے لپیٹ لیتی تھیں اور ان کی آنکھوں میں بڑی دیا تھی۔

پچھلے چند سال سے اس کی زندگی سلطان حسین شاہ کے ساتھ یا میدان جنگ میں لڑتی تھی یا محفل چنگ و رباب میں۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں لیکن حال و قال سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے امام غزالی اور ابن رشد دونوں کو اپنے

اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور مسلسل خانہ جنگیوں، بغاوتوں، سیاسی شورشوں اور بد امنیوں کے باوجود کہ یہ ہنگامے زندگی کا لازمی جزو تھے، وہ ناامید نہیں تھا، وہ ہر شے کو استعجاب سے دیکھتا۔ وہ بہت سے ملک گھوم چکا تھا۔ ہند میں آ کر بھی اس نے اپنے سیاہ گھوڑے پر بڑی دور دور تک سیاحت کی تھی۔ ناموں میں، جگہوں میں، انسانوں میں جو اسرار تھا اس نے اس کو بہت مسحور رکھا۔ شیراز اور بدخشاں کے الالمہ زار، کاشغر، یارقند اور بخارا کی گلیاں جن کی دیواروں پر چینی گلابوں کی بلیں جھکی ہوئی تھیں اور جہاں ترچھی آنکھوں اور لمبی لمبی چوٹیوں والی لڑکیاں رقص کرتی تھیں اور دریائے جیحون کا ساحل اور سنہرے بالوں والے ترکمانوں کی خیمہ گاہیں۔ شمال مغرب کے کوہستان جہاں یونانیوں، سیتانیوں، ترکوں، چینیوں اور ایرانیوں نے مل جل کر سلطنتی کی ایک نئی دنیا آباد کی تھی اور پھر ہند کے جنوب میں مہاندی کے سرسبز کنارے اور آندھرا دیس، اور کیرالا، ٹامل ناڈو اور کورومندل کی ہری گھاٹیاں اور سلطنت و جے نگر کے خوبصورت باغات اور لرزہ خیز مندر جن کے آنگنوں میں تاڑ کے درختوں کے نیچے باوامی آنکھوں والی دیوداسیاں ہیرے کی لٹکیں پہنے بھرت ناٹیم ناچتی تھیں۔

خداوند! کیسے کیسے لوگ تھے، کیسی کیسی قومیں! دنیا کتنی عجیب، کتنی دلکش، کتنی خوفناک، کتنی قابل قدر چیز تھی۔

ہند کتنا حسین ملک تھا۔

لیکن یہ بہر حال اس کا وطن نہیں تھا۔

اور گو اس کے بہت سے حصوں پر مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں لیکن بہر حال

یہ مجموعی طور پر دارالحرب تھا کیونکہ کافروں کی یہ بڑی زیر دست آماجگاہ تھی۔

اور اگر یہ دارالحرب نہ بھی ہوتا تب بھی اس کا وطن نہیں تھا۔ یہ سامنے لہریں مارتی ہوئی سر جو بھلا دجلے کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آم کے سائے میں وہ سکون میسر نہیں جو کسی نخلستان میں چشمے کے کنارے کھجور کے تلے بیٹھ کر الفارابی کے نظریات پڑھنے میں حاصل ہوتا تھا۔

گو آم بھی اپنی جگہ پر خوب درخت ہے۔

غریب الوطنی کے احساس نے اسے بہت رنجیدہ کیا، اس نے کھنڈر کے ستون سے سرفیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں یہاں سے آخر واپس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس نے طے کیا کہ وہ جو نیپور واپس جا کر سلطان سے معذرت چاہے گا اور دُشَق لوٹ جائے گا۔ دُشَق؟ اسے یکلخت یہ نام بھی بے حد اجنبی سا لگا، وہ دُشَق جا کر کیا کرے گا؟ نیشاپور میں اس کا کیا رکھا ہے؟ بغداد کو اس سے اب کیا واسطہ؟ یہ سوچ کر بھی اسے بڑا دکھ ہوا۔

اور اس قدر بے تکلے لوگوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر اس کسان کو دیکھا جو انگو چھاسر پر لپیٹے زور زور سے بارہ ماسالا پتلاستی کی اور لپکا جا رہا تھا۔

وہ جس کے پس منظر میں سارا عبرانی تمدن تھا اور کھلدانیوں اور قبطیوں اور اسوریہ والوں کی روایات اور یونان تھا اور روم، اور مقدس سلطنت روم کی مشرقی مملکت جسے ورثے میں ملی تھی، اور عجم کے گلستان، اور نیل کے ساحل اور مغرب کے الامحدود پہاڑی سلسلے، وہ ایک بالکل مختلف کائنات تھی اور اس کائنات سے اس

کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں سنا تھا کہ جوگی ہوا میں اڑتے تھے اور جہاں کا مروپ کی ساحرائیں آدمیوں کو بکرا بنا دیتی تھیں اور جہاں بنگال اور بہار کے تانترک معبدوں میں لرزہ خیز جادو ٹوٹے ہوتے تھے اور جہاں گورکھ ناتھ کے چیلوں کے گورکھ دھندے عقیل کو چکرا دیتے تھے۔

لیکن ابو ریحان البیرونی نے اس ملک کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ کمال نے پڑھ رکھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ غزنی اور ہرات میں یہاں کی دولت کے متعلق کیسی کیسی حکایات مشہور تھیں اور کتنی عجیب بات تھی کہ فلک کی گردش نے اسے واقعی اس بے تکے ملک میں لا ڈالا تھا جہاں یہ سارے روایتی ہیرے جواہرات وہ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اس نے بیجا پور اور گولکنڈہ کے درباروں کی جگہ گاہٹ کا نظارہ کیا تھا۔ اس نے اس دیس کی حسینہ جبین عورتوں کو دیکھا تھا جو چلتی تھیں تو ان کے پاؤں کے زیور چھن چھن بولتے تھے۔ اس نے یہاں کی عجیب مدہوش کن موسیقی سنی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں نے یہاں سے لوٹ کر بغداد میں اس سے تذکرہ کیا تھا کہ یہاں کے مرد شراب نہیں پیتے اور عورتیں وفادار ہوتی ہیں۔

عورتوں کی وفاداری سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس دنیا سے نکل کر وہ آیا تھا، جس دنیا میں وہ رہتا تھا، اس میں عورت اسی وقت داخل ہو سکتی تھی جب خود اسے عورت کی رفاقت کی ضرورت محسوس ہو۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی رفاقت کا مطالبہ کر سکے۔ عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

کمال نے عورت کو ہر روپ میں دیکھا تھا۔ سمرقند اور قاہرہ کے بازاروں میں

بکنے والی کنیریں، مال غنیمت کے طور پر حاصل کی ہوئی لڑکیاں، سلاطین کی حرم سراؤں میں مقیدہ جبینیں۔ عورت جو ہمیشہ ہر حالت میں مرد کی جاسید اوتھی، اس کے رحم و کرم پر زندگی تھی۔ اس کی خوشنودی کے لیے جس کی تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہ تھی، کوئی تمنائیں، کوئی زندگی۔

مگر بہر حال خداوند تعالیٰ کی یہ مخلوق بہت دلچسپ چیز تھی۔ ایک حد تک زندگی میں اس کی اہمیت بھی تھی، مگر اس کے آگے اور بہت سی دنیا میں تھیں جن میں پہنچ کر عورتوں کا ساتھ چھوٹ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ذہن کی دنیا، روح کی دنیا۔ گو جذبات کی دنیا میں ایک حد تک کمال سے شریک کرنے کے لیے تیار تھا مگر کسی گہرے جذباتی تجربے میں کسی عورت نے اب تک اس کی رفاقت نہیں کی تھی کیونکہ دراصل یہ شخص اس کا حق تھا کہ وہ مختلف عورتوں کو پسند کرے، وقتاً فوقتاً ان سے محبت کرتا رہے۔ اس کی محبوبہ کو یہ حق کہاں سے پہنچتا تھا کہ وہ بھی اس سے وفا کا مطالبہ کرے۔ اس کا تو صرف یہی کام تھا کہ گڑیا کی طرح بچی بنی بیٹھی رہے۔ کمال جس زبان میں شاعری کرتا تھا اس کی روایت تھی کہ شجاع سورما اپنی محبوبہ کے لیے جان پر کھیل جاتے تھے۔ یہ بڑا دل آویز تصور تھا۔ غزالی آنکھوں والی شہزادی سرخ گلاب کا پھول ہاتھ میں لیے الکبیر کے کنارے محل کے جھروکے میں بیٹھی ہے۔ جھروکے کے نیچے سورما شاعر رباب بجا بجا کر اسے اپنے خطرناک عشق کے نغمے سنارہا ہے۔۔۔ یہ نغمے جو چاندنی راتوں میں واویلوں اور پیٹری راستوں پر گونجتے تھے اور جن کی گونج فرانس اور الپس کے اس پار تک پھیل چکی تھی۔۔۔ سورما شاعر محبوبہ کو اونچے سے ستون پر بٹھا کر اس کی پرستش کرتا تھا اور جب چاہتا تھا

اسے اس ستون پر سے اتار دیتا تھا۔

اس اجنبی بے تکلف ملک میں آن کر اس نے خدا کی خوبصورت بے زبان مخلوق کو ایک نئے روپ میں دیکھا: وہ تو خود ہاتھ میں رباب ایسے محبت کے نغمے الپ رہی تھی، رادھا بن کر کرشن کی پرستش کرتی تھی، لیکن یہ پرستش اتنی عظیم چیز تھی کہ اس کے قابل بننے کے لیے کرشن کو خدا کا درجہ حاصل کرنا پڑا تھا، وہ ہنستے ہنستے آگ کے شعلوں میں بھی کود جاتی تھی۔۔ اس کی وفا شعاری کی قسمیں بڑے بڑے ولی اللہ کھاتے تھے۔

سال چپ چاپ کھنڈر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سامنے کی اور دیکھتا رہا، اسے وہ سارے نغمے یاد آئے جو چند روز پہلے ایودھیا میں چمپا نے اسے سنائے تھے۔ یہ نغمے بھجن کہاتے تھے اور کرشن اور رام کی بھگتی کا ان میں تذکرہ تھا اور ان سے زیادہ سرشاری کی کیفیت اس نے پہلے کبھی کسی زبان کی شاعری میں نہیں دیکھی تھی۔ پچھلے تین سال میں اس نے جو پور کے شاہی کتب خانے میں رہ کر اس ملک کی مختلف بولیاں سیکھی تھیں۔ اسے اپنے صفت زبان ہونے پر بڑا ناز تھا مگر وہ ان لوگوں کے دل کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ بڑے انوکھے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے فلسفہ کائنات کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ اجنبی، اس پرائے دیس میں، سرد غیر مانوس پتھروں پر بیٹھا رات کے سائوں کو دیکھا کیا۔

مدھم سی روشنی سارے میں پھیل گئی۔

پورنیا کا چاند کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی چھت میں سے نیچے جھانک رہا تھا اور اس کی
کرنوں نے سنگ سرخ کے شکستہ فرش پر عجیب عجیب زاویے بنا دیے تھے۔ فرش پر
طرح طرح کے مبہم نقش و نگار بنے تھے جن کو سینکڑوں برساتوں نے مٹا کر بے حد
مدھم کر دیا تھا۔۔۔ یہ ترشول، اور زندگی کا درخت، اور زمین کا کنول اور کائنات کا
پہیہ اور کنول کا سنگھاسن، اور آگ کا ستون۔ جانے ان انوکھی علامتوں کا کیا
مطلب ان لوگوں کے ذہن میں رہا ہوگا۔ معنی کیا ہوتے ہیں؟ کمال حیرت سے
ان نقوش کو دیکھ کر سوچتا رہا۔۔۔ باہر مہوے کے باغ پر ہولناک، ہلاکت خیز سناٹا
منڈلا رہا تھا۔

اور پھر اس سناٹے میں عجیب و غریب آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ایسا لگا
جیسے تاریک ویران گلی میں سے بھاری بھاری رتھ گزر رہے ہیں اور ان رتھوں پر
زرتار چھتروں کے نیچے، کانوں میں سونے کے کنڈل اور دو شالے اوڑھے اجنبی
انسان بیٹھے اسے جھانک رہے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں فاسفورس کی
طرح چمک رہی تھیں اور وہ بڑے خوفناک طریقے سے ہنستے تھے۔ اس کا منہ
چڑاتے ہوئے گویا کہتے ہوں، دیکھو جس طرح ہم ختم ہوئے ہیں تم بھی نیست و
نابود کر دینے جاؤ گے۔ اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے دروازے میں چند رگپت نری
چندر کھڑا تھا۔ انسانوں کا چاند، ہند کا سمرات، مگر وہ یہاں کہاں سے آیا؟ کمال

نے لا حول پڑھی، وہ تو عیسیٰ کے پیدا ہونے سے تین سو سال پہلے ہی جہنم واصل ہوا تھا۔ کم بخت نے آخر دنوں میں جین سنیا سی بن کر اپنے آپ کو فالتے دے دے کر مار ڈالا، مگر وہ تو وہاں موجود کھڑا مسکرا رہا تھا، پھر اس کے پیچھے سے ایک اور آدمی نے اپنا سر نکالا اور بندر کی طرح کود کر اس کے سامنے آ گیا اور مخاطب کیا۔۔۔ دیکھو میرا نام اشوک ہے۔ اشوک پر یہ درشن۔ میں سارے بھارت ورش کا شہنشاہ تھا اور جب میں مرا تو صرف ڈیڑھ آنو لے کا مالک تھا، اس نے مٹھی کھول کر آدھا آنو لہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔

اس کے بعد ان پلید روحوں کی یاغار شروع ہو گئی، وہ رتھوں سے اتر اتر کر سارے میں پھیل گئے۔ بندروں کی طرح شہتیروں سے لٹک گئے، ستونوں پر جا چڑھے، آنگن کے خشک حوض میں قلابازیاں کھانے لگے۔ ان سب نے مل کر باریک آواز میں کووں کی طرح کانیں کانیں شروع کر دی، وہ سب سال کے چاروں طرف ناچ ناچ کر ایک ساتھ چلا رہے تھے:

میں بھرت منی ہوں۔ میں نے رقص اور تمثیل کے قوانین بنائے تھے۔

میں نکشلا کاوشنو گپتا ہوں، میں نے ارتھ شاستر لکھی تھی۔

میں راجہ بھوج ہوں۔

میں مخض گنگوا تیلی ہوں۔

اندھیرے آسمان پر بادل گرج رہے ہیں، میں کالی داس ہوں۔

میں قنوج کاراج شیکھر ہوں۔

مجھے بھبھوتی کہتے ہیں۔ میں کانیا کچ میں رہتا تھا۔ میں نے ”ماتنی مادھو“ لکھا

تھا۔

میں بھرتری ہری ہوں، میں نے کہا تھا نا کہ دنیا میں شخص ایک رنگ بھومی ہے
اور ہم سب اداکار ہیں۔ تم نٹ ہو، میں نٹ ہوں، ہم سب نٹ ہیں۔
مٹی کی گاڑی ہانکتا ہوا شد رک (ڈرامہ ”مٹی کی گاڑی“ کا مصنف) صحن سے
باہر چلا گیا۔

پھر چھن چھن کرتی بہت سی پتھل پائیاں ایک قطار میں آن کھڑی ہو گئیں اور
اٹھانے لگیں۔

ہم کشمیر، اڑیسہ اور آندھرا پردیش کی رانیاں ہیں جو بڑی شان سے خود حکومت
کرتے تھے۔

میں شہزادی راجیشری ہوں، میں نے اپنی بکثوں سے چین کے عالموں کا
ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

میں مارویوی ہوں۔

میرا نام پر بھاوتی تھا۔ ہائے تم مجھ کو بھی نہیں جانتے؟

میرا نام ہرش نے رتناولی رکھا تھا۔ بے چارہ ہرش۔۔۔

اپنا ذکر سن کر ہرش وردھن نے، جو کان میں قلم اڑ سے اب تک مراقبے میں محو
تھا، زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ہم سری پرچھوی ولجھ کھاتے تھے۔ اس نے
مقرر کی طرح ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔

ہم جو گویا دھن اور دھرتی کی دیویوں کے چہیتے تھے اور ہم سب کو پلچھ ترکوں
نے آ کر ٹھکانے لگا دیا۔۔۔ ٹھکانے لگا دیا۔۔۔ ٹھکانے لگا دیا۔

اب بڑے زور سے تلواروں کی جھنکار گونجی اور ان کی چمک سے نیم تاریکی میں اجالا سا ہو گیا اور سرکٹ کٹ کر چاروں طرف گرنے لگے۔ ہم چند یلے راجپوت ہیں، ہم بھگیلے ہیں، ہم پر مار سوراہیں، ہم راٹھور ہیں، ہم چوہان ہیں، ہم آہا ہیں، ہم اوول ہیں۔

سب نے ایک ٹانگ پر کود کود کر ناچنا شروع کر دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر آہا اوول گارہے تھے، اس قدر غل مچا کہ ابوالمصور مال الدین کا دماغ چکرا گیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ افق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور باہر مہوے کے باغ میں چند کسان آہا اوول گاتے بل کندھوں پر اٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا اور اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بہرائچ تھا اور وہ بت پرستوں کے زمانے کے ایک کھنڈر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا شام کرن گھوڑا باہر ایک ستون سے بندھا ہنہنار ہا تھا اور بارش جھکی کھڑی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔

اس نے دوبارہ لا حول پڑھی اور انگرائی لے کر اٹھا اور فجر کی نماز پڑھنے کے ارادے سے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ندی کی اور چل دیا۔

دن بھر پنڈتوں کے ساتھ تانب پتروں پر سر کھپانے کے بعد مال مٹھ کے باہر

گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل صبح سویرے وہ ایودھیا کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔ معاً بارش کا قطرہ اس کے چہرے پر آن گرا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ افق پر گھنگھور گھٹائیں امنڈ کر اٹھی تھیں۔ بہت جلد ندیاں نالے چڑھ جائیں گے۔ مینڈک ٹرائیں گے، جل تھل ایک ہوگا۔ مال نے ایک چھپر کے نیچے جا کر پکا کھوا اور کچے فرش پر لیٹ گیا، پھر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ مدتوں بعد یہ پہاڑ موقعہ تھا جب مال کو لگاتار تین چار مہینے بعد اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ شرقی سلاطین کی دلی کے بادشاہوں سے مستقل جنگیں چھڑی رہتی تھیں۔ مال کو کوئی دن ایسا یاد نہ تھا جب کسی نہ کسی نئے معرکے کی وجہ سے اس کے کتب خانے کے کام میں خلل نہ پڑتا ہو۔ پہلے سلطان محمد شاہ اور اس کے بھائی شاہزادہ حسین میں جنگ ہوئی، پھر شاہزادہ حسین نے جو پور کا سلطان بن کر خود دلی پر چڑھائی کر دی۔ ان معرکوں میں مال سلطان کے ساتھ کالپی اور اناوے اور سنبھل میں مارا مارا پھرتا۔ مہینوں اس نے بدایوں، کوئل، مارہرہ، ٹمس آباد اور برن کی خاک چھانی۔

برکھا شروع ہو چکی تھی، ندیوں اور جھیلوں پر بارش کی بوندوں کی ہلکی ہلکی دھند چھا رہی تھی۔ بہرائچ ک پورب میں راپتی بہتی تھی۔ پتھم میں سر جو رواں تھی۔ یہ دونوں ندیاں بڑی دور نیپال دیس سے نکل آئی تھیں اور کس بے پروائی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھیں۔ یہ سامنے والی سر جو، جو بت پرستوں کی نظروں میں بڑی مقدس تھی، (یہ دریاؤں کا مقدس ہونا مال کی سمجھ میں نہ آیا!) اسی طرح گاتی گنگنامتی کچھ آگے جا کر گھاگھرا سے مل جاتی تھی اور گھاگھرا کے کنارے ایودھیا

آبا د تھا جہاں چپاوتی رہتی تھی اور بارش ہو رہی تھی اور اس وقت وہ اسی سر جوندی کے کنارے کہیں کسی درخت میں جھولا جھولتی اور ساون گاتی ہوگی کیونکہ مال کو اچانک خیال آیا کہ لوساون کا مہینہ آن پہنچا۔ یہ موسموں کا سحر۔ ہر مہینے کے نام کے ساتھ اس کی اپنی کیفیت تھی۔ اس مناظر، اپنے رنگ، اپنے راگ۔ چند ماہ قبل دیریا کھ تھی۔ سارے میں بسنت رت چھائی تھی، پھر جیٹھ اور اساڑھ کا مہینہ آیا جب مہوا کے باغ میں لوئیں چلتی تھیں اور بیل درختوں سے ٹپ ٹپ گرتے تھے، پھر بھاؤں آئے گا، پھر کوار اور کاتک جب اداس چاندنی خنک زرد رنگ سارے میں گھول دے گی۔

یہ اس کا وطن نہیں مگر وہ کم از کم موسموں کے سحر سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اس نے پگڑی سر کے نیچے رکھ کر کروٹ بدلی اور معاً چٹا بچنے کی آواز اس کے کان میں آئی، اس نے کائی سے آنکھ کھول کر دیکھا ایک سادھو بارش سے بچنے کی خاطر چھپر میں آن بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے دھونی رمانے میں مشغول تھا۔ سال کی موجودگی کی اس نے کوئی پروا نہیں کی اور اپنی کھڑ پٹر میں لگا رہا۔ سال اٹھ بیٹھا اور روچھپی سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ موسم کا اثر تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ ساری دنیا کو، ان عجیب سادھوؤں کو، ان موروں کو گلہریوں کو، ان چرواہوں کو، جو جلدی جلدی قدم اٹھاتے جنگل میں سے گزر رہے تھے، ان سب کو گلے سے لگالے۔ خوب چلا چلا کر ساون گائے۔ دنیا کتنی پرسکون، کتنی آرام دہ تھی، وہ طوطے، یہ سادھو، وہ کسان جو مینہ سے پناہ لینے کے لیے بھاگے بھاگے چھپر کی اور آ رہے تھے۔ یہ سب اس کے دوست تھے، اس

کے لیے تھے، وہ ان سے علیحدہ کب تھا؟ ”جے رام جی کی۔۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اپنی آواز سن کر، اپنی زبان سے یہ الفاظ نکلتے پا کر خود بڑا تعجب ہوا۔ سادھو نے مسکرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ”جے رام جی کی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کہو سپا ہی۔۔ کہاں سے آتا ہوا۔۔“

”میں۔۔ سپا ہی نہیں ہوں۔“

”سلاطین کے آدمی تو ہو۔۔“

”ہاں۔۔ مگر میں کتابیں لکھتا ہوں۔“

”اچھا۔۔“ سادھو نے اسی اطمینان سے جواب دیا اور پھر چمٹا اٹھا کر رام نام کا ورد شروع کر دیا۔ گویا مال کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بالکل ضمنی تھا۔ ”بابا۔۔ تم یہیں رہتے ہو۔۔“ مال نے پھر بات شروع کی۔ ”نہیں۔ ہم جوئی پور کے رہنے والے ہیں۔“

”ارے!“ مال نے بے اختیار ہو کر خوشی سے کہا، ”تب تو تم میرے ہم وطن ہو۔۔“

دوسرے لمحے اسے اپنے اس انجانے جذبہ مسرت پر بڑا تعجب ہوا۔ ہم وطن؟ مگر جوئی پور اس کا وطن کہاں تھا؟ وہ تو بغداد کا باشندہ تھا۔۔ اسے سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔

”زرگن رام۔۔ زرگن رام جوئی پورے بھائی۔“ سادھو آنکھ بند کیے یکسانیت کے ساتھ ٹرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے مال کو خود ہی مخاطب کیا: ”آج کچھ قلندر بالے میاں کے مزار کے لیے جھنڈے لے کر اپڑے ادھر آئے ہیں۔“

”اچھا۔۔“

”وہ کہتے تھے کہ ہمارے سلطان اور ولی والے میں پھر ٹھن گئی۔۔۔ اب کی دفعے ہمارا سلطان بچتا نظر نہیں آتا۔۔۔ مقابلہ بڑا کٹھن ہے۔۔۔ زرگن رام۔۔۔ زرگن رام۔“ اس نے پھر ٹرانا شروع کر دیا۔

کمال چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور سادھو کے قریب گیا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔ بابا پھر سے بتانا۔“

چھپر میں سات آٹھ کسان جمع ہو چکے تھے اور ان سب نے مل کر سادھو کے ساتھ رام نام کی رٹ لگانا شروع کر دی تھی۔ کمال کے سوال کا کسی نے جواب نہ دیا۔

وہ جلدی سے پٹکا کمر سے باندھ کر برتنی بارش میں باہر نکلا اور سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرائے کے برآمدے میں اودے سنگھ راٹھور اس کا منتظر تھا۔

”تم۔۔۔ تم یہاں کہاں۔۔۔“ کمال نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔ ”تم تو گوالیر میں تھے۔“

”میں گوالیر ہی سے آ رہا ہوں، میرے ساتھ چلو۔۔۔ عالم پناہ نے تمہاری کھوج میں مجھے بھیجا ہے۔“

”مجھے کھوجنے اتنی دور آئے ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔“

”عالم پناہ بھی یہیں بہرائچ میں موجود ہیں اس وقت۔۔۔“ اودے سنگھ نے کہا، تم یہاں گیان دھیان میں لگے ہو، ادھر دنیا بدل چکی ہے۔۔۔ سلطان بہلول

نے تمہارے مالک پر راہڑی میں حملہ کر دیا۔ آؤ، یہاں بیٹھ جائیں تو میں تم کو سارا ماجرا سناتا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ ”جب اس پر حملہ ہوا تب وہ جمناجی پار کر کے ہمارے راجا سے مدد لینے کے لیے گوالیر آیا، ہمارے راجا نے اسے کمک پہنچائی۔ میں اس کی فوجوں کو لے کر کالپی کی اور بڑھا۔ گھمسان کا رن پڑا۔“ اودے سنگھ نے خالص فوجیوں والی تفصیل سے سنا سنا شروع کیا، پھر وہ جھک کر تنکے سے برآمدے کے کچے فرش پر نقشہ بنا کر مال کو سمجھانے میں منہمک ہو گیا۔ ”یہ دیکھو۔۔۔ ادھر بہلول کی فوجیں ہیں ادھر ہم ہیں۔ بیچ میں جمنامیا ہیں۔ اب نہ ہم ندی پار کر سکتے ہیں نہ وہ۔۔۔۔۔ سے بیتا جاتا ہے۔ تب ایک دن کیا ہوتا ہے کہ ترلوک چند سلطان بہلول کو ندی پار کروا دیتا ہے۔۔۔“ پھر وہ ٹھٹھک گیا۔

”ترلوک چند کو جانتے ہو؟“

”نہیں۔“

”بکسر کا حاکم ہے۔۔۔۔۔ بکسر گئے ہو؟“

”نہیں۔“ مال جھا گیا۔ ”اصل واقعہ بیان کرو۔“

”ہوتا کیا۔۔۔ دلی کی فوجیں برابر ہمارا پیچھا کرتی رہیں، ہم جو پور کی طرف لوٹے، وہاں بھی دلی والوں نے ہمارا مقابلہ کیا۔ ہم جو پور کو خدا حافظ کہہ کر بہرائچ آ گئے۔ تمہارا جو پور اب سنسان پڑا ہے۔ اس میں دن کے وقت الو بولتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”عالم پناہ نے کہا تھا تم کئی مہینے سے یہاں ہو۔۔۔ صبح سے تم کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مٹھ کے پنڈتوں سے تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوا۔“

کمال نے تلوار کمر سے باندھی اور او دھے سنگھ کے ہمراہ لشکر کی سمت روانہ ہو گیا جو راپتی کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا۔
اوسر جدھر جیت وں تھا۔

۲۲

بہرائچ سے وہ لوگ قنوج گئے جو کالندی اور گنگا کے سنگم پر آباد تھا، وہاں بھی انہیں بہلول لوہی سے شکست کھانا پڑی اور بالآخر سلطان حسین تھکا ہارا بہار میں پناہ گزین ہوا۔

بہار۔۔ یہ ایک نیا علاقہ تھا۔ ہر ابھرا، خوبصورت، جہاں سون ندی بہتی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں نالندہ کے دارالعلوم کے کھنڈر دل میں عجیب و ہشت پیدا کرتے تھے۔ یہاں ابوالمنصور مال الدین سلطان حسین کے دوسرے وفادار امراء اور افسروں کے ساتھ بیٹھ کر منصوبے بناتا تھا کہ جو پور کی سلطنت دوبارہ کس طرح حاصل کی جائے۔

جو پور میں اب دلی کا ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا تھا۔ سلطنت شرقیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ شیراز، ہنداجڑ چکا تھا۔

ابوالمنصور مال الدین، قاضی شہاب الدین جو پوری کا جانشین، مورخ، محقق، اب سیاسی سازشوں کا بھی ماہر ہو گیا۔ دن رات وہ سلطان کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا ترکیبیں سوچا کرتا۔۔ دلی کے سلطان کو کس طرح زیر کیا جائے؟

اب سلطان بہلول مرچکا تھا اور اس کا خوبصورت اور شاندار بیٹا سکندر ہند کا بادشاہ تھا جس کی ماں کا نام ہماوتی تھا، جو شرع محمدی کا بڑا پابند تھا، جو اپنے باپ سے بھی زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔

بہار کے ان پناہ گزینوں نے سردھڑ کی بازی لگا کر بساط جنگ پر ایک بار پھر پانسہ پھینکا۔

کیونکہ لڑنا مرنا، ہار جیت ہی مردوں کے مشاغل ہیں۔

سلطان حسین اپنی جوڑ توڑ کے ذریعے کئی بار جو پور میں باربک شاہ کے خلاف بغاوت کروا چکا تھا، اب کی مرتبہ اس نے جوکا سے مل کر ایک بڑی بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ مال اس کا سفیر خاص تھا، دن رات وہ اپنے شیا م کرن گھوڑے پر سوار ادھر سے ادھر سازشیں کرواتا تھا۔

ایک رات منزلیں مارتا وہ جوکا کے گاؤں پہنچا۔ گڑھی پر جا کر اس نے آواز دی۔ جوکا اس وقت اندر پو جائیں مصروف تھا۔ اس کا جوان بیٹا چراغ ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے شک سے پوچھا۔ باربک شاہ خود کمزور تھا لیکن جب سے اس کا بڑا بھائی سلطان سکندر دلی کے تخت پر بیٹھا تھا پر جا اپنی جان کی خیر منافی تھی۔

”میں سلطان کے پاس سے آیا ہوں۔“

”کون سے سلطان کے پاس سے۔“

”تمہارا سلطان! حسین شاہ۔“

”آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ بھائی۔“ نو جوان کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ چراغ کی روشنی میں مال نے اسے دیکھا، وہ اسی کا ہم عمر رہا ہوگا، وہ بیڑھیاں اتر کر تہ خانے میں اسے لے جاتے ہوئے کہہ رہا تھا: ”میرا نام ہری شنکر ہے۔ میں جوکا کا بیٹا ہوں۔ میں سلطان کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا۔“ وہ ایک زمین دوز کمرے میں داخل ہوئے جہاں بھوانی کی مورقی کے آگے مدھم سا دیا جل رہا تھا اور دیواروں پر ڈھالیں اور تلواریں آراستہ تھیں۔

بھوانی کی مورقی اسے بڑی ڈراؤنی معلوم ہوئی لیکن اسے اس وقت یہ احساس تھا کہ وہ بھی اب اس دیس، اس ماحول کے اسرار میں مکمل طور پر شامل ہو چکا ہے۔ ”اچھا سنو۔“ اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا، ”تمہارے پاس کتنے ہاتھی ہیں؟ کدھر سے حملہ کرو گے۔“

دوسرے لمحے وہ دونوں نہایت تندہی سے جنگ کا نقشہ سوچنے میں منہمک ہو گئے، ان میں سے ایک ہندو تھا دوسرا عرب اور یہ دونوں افغانوں سے لڑنے جا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدر مشترک صرف ایک شے تھی۔۔۔ دودھاری خون آ شام تلوار اور ایک دوسرے فریق کو ختم کر دینا ان کا واحد مقصد حیات تھا۔

چند روز بعد انہوں نے بغاوت کا علم بلند کیا اور سلطان سکندر ان کی سرزنش کے لیے جوہور پہنچا اور حسین شرقی کو دوبارہ شکست ہوئی اور سنگیت کا ربادشاہ، جس کی آدھی عمر راگ تخلیق کرنے کے بجائے میدان کارزار میں لڑتے بھڑتے کٹی، ایک مرتبہ پھر بہار کی طرف واپس لوٹا۔

اب مال کا جی اچاٹ ہو گیا۔

اس نے اس قدر خونریزی دیکھی تھی، اس نے اتنے انسانوں کو قتل کیا تھا، اس نے اتنی بے بس عورتوں کو دیکھا تھا۔ اس نے سلطان حسین کے دربار کے امراء کو اس حالت میں سلطان سکندر کے سامنے جاتے دیکھا تھا کہ عمائے ان کی گردنوں میں رسیوں کی طرح بندھے تھے اور وہ پائیادہ قیدیوں کی مانند فاتح کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ لوگ، جو عالم، شاعر اور اہل قلم تھے، اور ان کا فاتح بھی علم دوست اور شاعر تھا، لیکن کتابیں بے کار تھیں، علم فضول تھا، فلسفے بے معنی تھے کیونکہ انسان کا خون ان سب چیزوں کے باوجود بہتا تھا۔ خداوند!۔۔۔

دکھی انسانیت کس طرح ساری کی ساری خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاریخ سے اس کو جس قدر دلچسپی تھی اب اتنی ہی نفرت ہو گئی۔ اس نے سلاطین کے نسب ناموں اور ان کے ادوار اور ان کی سلطنتوں کے واقعات کو بھول جانا چاہا۔

اس نے یہ بھی فراموش کرنا چاہا کہ سلطان کی بھانجی جنگلی قیدی کی حیثیت سے اب دلی میں تھی اور سلطان سکندر کے حرم میں داخل کی جا چکی ہوگی۔ اس کے دوست اودے سنگھ راٹھور نے اسے غیرت دلائی۔!

”کیسے بے شرم ہو، تمہاری شہزادی دلی میں ہے اور تم بہار میں چین سے بیٹھے ہو۔ اسے چھڑا کر لاؤ، جا کر سلطان سکندر کو قتل کرو یا مجھے اجازت دو میں اس کا کام تمام کر دوں۔ شہزادی کو واپس لے آؤں۔“ کمال یہ باتیں سنتا اور خاموش رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کون سا راستہ اختیار کرے۔

بہار سے غریب الوطن سلطان حسین نے بنگال کا رخ کیا۔ کمال اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ گوڑ کے سلطان حسین شاہ نے جوینپور کے شکست خوردہ بادشاہ کو

اپنے یہاں پناہ دی جس کے سارے پرانے ساتھی پچھڑ چکے تھے، جس کا کتب خانہ تباہ ہو گیا تھا۔ خالی ظہورہ اب جس کا رفیق تھا۔ ظہورہ اس سے کبھی دغا نہیں کرے گا۔

اب میری روح کو کا ہے کی تلاش ہے؟ گوڑ کے شاہی بانگات میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتے ہوئے مال خود سے سوال کرتا۔ بنگالے کی لڑکیاں بے حد دلکش تھیں، یہاں کے مناظر بہت خوبصورت تھے۔ یہاں کی موسیقی بہت دلنواز تھی۔ اسے جو پور کی شاہزادی یاد نہیں آئی، اسے چپاوتی کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اسے خدا کی تلاش نہیں تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے عورت کی تلاش بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا وجود اس دہشت ناک خلاء میں ڈول رہا تھا جہاں محض عمیق سناٹا ہوتا ہے۔

اس سناٹے میں صرف ایک سوچ بار بار گونجا کرتی۔۔۔ میں جب تک اس چکر میں رہوں گا، مجھے دوسروں کو مارنا پڑے گا۔ دوسرے مجھے مارنے کے درپے رہیں گے۔ انسان دراصل انسان نہیں ہیں خونخوار بھیڑیے ہیں۔ انسان مجھے کہاں ملے گا۔؟

طرح طرح کی آوازوں نے اس سناٹے میں بہت سے بھنور پیدا کر دیے۔ میں اس سامنے والے انسان کو مار ڈالوں کیونکہ اس نے سر پر چوٹی رکھی ہے اور گائے کو پوجتا ہے اور اگر میں نے اس کو قتل کرنے میں سبقت نہیں کی تو وہ میرا کام کر دے گا کیونکہ میرے سر پر چوٹی نہیں ہے۔؟

خوبصورت شوپوری کی اس لیے مجھے اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہئے کیونکہ وہاں لاکھوں کروڑوں مورتیاں مندروں میں بچی ہیں، لیکن وہ مورتیاں میرا کیا

بگاڑتی ہیں؟

اگر ان عورتوں کو میں گوارا کرتا ہوں تو کیا میں مسلمان نہیں رہا۔؟

اسلام کیا ہے۔۔؟

ان سوالات نے اسے دیوانہ کر دیا۔

ان سے بچنے کے لیے اس نے شراب میں پناہ لی، اس نے ملک کے سارے
خطوں کی عورتیں دیکھی تھیں۔۔ خوبصورت مضبوط جسموں والی مراٹھنیں۔ کجرات
اور کاٹھیاوار کی نازک اندام لڑکیاں جن کے چہروں کی رنگت کندنی تھی۔ بجاپور کی
خوش آواز طوائفیں۔ بنگالے کی جادوگریاں جن کی آنکھوں میں جادو تھا اور
باتوں میں ٹونا، جن کے لیے مشہور تھا کہ راتوں رات درختوں پر بیٹھ کر آسام کی
سمت اڑ جاتی تھیں! اور بندرا بن کی شوخ و شنگ کجریاں، متھرا کی ابیر نہیں، پورب
کی سانولی سلونی کہارنیں۔ قنوج کے باغوں کی وہ مالینی، جس نے اسے ایک بار
بیلے کے گجرے بنا کر دیے تھے۔

موسم بدلتے رہے، وہ دل کی ویرانی سے گھبرا کر راگ رنگ کی محفلوں میں
شریک ہوا لیکن سارنگی کی تانت میں اسے موت کی ہچکیاں سنائی دیں۔ اس نے
لکھنؤ کی پاتروں کو مانپتے دیکھا مگر حسین رقاصاؤں کے بجائے اسے مردہ
عورتیں دانت نکوتی نظر آئیں۔

طرح طرح کی آوازیں، عجیب و غریب گیتوں کے بول، مردہ زبانوں کے
جملے اس کے دماغ میں ہر وقت شور مچاتے، وہ اس اندرونی شورش سے عاجز آ
گیا۔ سناتا اس قدر پر شور ہو سکتا ہے، یہ اسے معلوم نہ تھا، وہ، جو ہفت زبان تھا، اس

نے کوشش کی کہ ساری بولیاں، سارے الفاظ کسی طرح بھول جائے۔ حافظہ کس قدر اذیت دہ شے تھی!

ایک روز کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہا: ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے۔ ہیرا جنم امول تھا، ہیرا جنم امول تھا، وہ جھنجھلا کر کسی دوسری رقاصہ کے یہاں جا پہنچتا۔ اس سے کہتا: گن کری چھیرو۔ مدھو ما دھوی سناؤ۔۔۔ لالتا راگ الاپو، وہ طنزورہ اٹھاتی، وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلتا۔ مغنیہ کے گیتوں کے بجائے کوئی دوسرے الفاظ اس کا تعاقب کرتے۔ سانس نقارہ کوچ کا، سانس نقارہ کوچ کا۔ باجست ہے دن رین۔ دن رین۔ دن رین۔ آخر اس نے نلکھنوتی، گوڑ اور سنار گاؤں کی چہل پہل چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا جہاں صرف گہرے رنگوں کی راجدھانی تھی اور تالاپوں میں کنول کے سرخ پھول جگمگاتے تھے اور جہاں بڑیل اور مولری کی چھاؤں میں ویشنو پجاری اور پجاری میں رادھا اور کرشن کی محبت کے گیت گاتے تھے۔ ویرانوں میں اسے اگلے وقتوں کے ونکا پتی اور گوڑیشور۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے پال بادشاہ۔ بادشاہوں کے سنان محل نظر آئے جن میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان کی دیواروں پر اس نے رقاصاؤں کے مجسمے دیکھے۔ ترچھی آنکھوں والی لڑکیاں جو یہاں سے مور پٹکھی جہازوں پر بیٹھ کر جاوا کے شلیند رو رہا رہیں رامائن کا سنگیت نائک دکھانے کے لیے جاتی تھیں۔ اس وقت ان کے خوبصورت بازوؤں اور طویل آنکھوں پر چھپکلیاں چل رہی تھیں۔ پال اور سمین بادشاہوں کے محلات کے کھنڈروں کے سائے میں کوئی قدیم قبرستان تھا جس کی شکستہ دیوار کے نیچے ایک بوڑھا ہانپتا کانپتا بیٹھا کھانس رہا تھا، برابر کے

کھیت میں ہل چلایا جا رہا تھا۔ سامنے مہاندا اور یا بل کھاتا بہہ رہا تھا۔ تب اچانک اس کے دماغ کا شور چھوڑا سا مدھم ہوا۔ اس بانی کا مطلب اس کی سمجھ میں تارے کی طرح روشن ہونا شروع ہوا جو مدتیں گزریں ایودھیا میں اسے کسی نے سنائی تھی۔ اس سے کسی نے کہا تھا: آج کال کے سچ میں جنگل ہو گا باس۔ اورے اورے ہل چلیں گے، ڈھور چریں گے گھاس۔۔ ڈھور چریں گے گھاس۔ ڈھور چریں گے۔۔۔

آخر جب دل کی وحشت نے زیادہ زور باندھا تو اس نے بنگال سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا۔ حسین شرقی کو گوڑ میں اس طرح تنہا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اسے اپنے آپ سے بڑی شرم آئی۔

مگر جذبے سب اضافی ہوتے ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور ایک روز خاموشی سے شاہی محلات سے نکل کھڑا ہوا۔ گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر وہ ایک جہاز پر بیٹھ گیا، اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے۔

دریا پر روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ لنگر اٹھایا گیا۔ ملاح بٹاش آوازوں میں گارے تھے۔ مال ایک کونے میں بیٹھا رہا، وہ جہاز پر یاگ جا رہا تھا۔ پر یاگ جو کاشی سے آگے تھا۔ عظیم گنگا بہت دور سے بہتی ہوئی آرہی تھی، اس کے ایک سرے پر اتھاہ سمندر تھا۔ مال نے آنکھیں بند کر لیں، دن گزرتے گئے۔ کشتی گنگا کی سطح پر آگے بڑھتی رہی۔ مسافروں سے بھری ہوئی کشتی میں بڑی چہل پہل تھی۔ بھاگل پور کے قریب ایک گاؤں سے براتی دہن کا سرخ ڈولالے کر کشتی میں سوا ہوئے۔ دو لہا نے زرد جوڑا پہن رکھا تھا۔ دہن لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے تھی۔ اس کے پیروں

میں چاندی کے بچھوے تھے اور اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں میں چوڑیاں اور ہاتھی دانت کے کڑے کھن کھن بولتے تھے اور وہ چمکو چمکو رو رہی تھی۔ براتی بلڑ مچا رہے تھے۔

کمال کشتی کی دیوار کے سہارے بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے یہ سب دیکھتا رہا۔

”سنو چپاوتی مجھ سے بیاہ کرلو۔“

”ہوں۔“

”ہوں کیا۔ میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ، عاقبت سدھر جائے گی اور اس زندگی میں مجھ ایسا دلچسپ آدمی ملے گا۔“

”رام رام۔۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان۔ مجھے تو تمہارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔ جو نیور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لو گے۔۔۔!“

اب بھی وقت ہے چپا رانی، دیکھنا کسی دن کسی سر گھٹے پنڈے کے پلے باندھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹہل کر وائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی۔ کبھی اپنے اس خوفناک مستقبل پر غور کیا ہے۔؟“

”میں تو تمہارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مر کے تو دیکھو!“

”سنو چپا، سچ مچ، مجھ سے بیاہ کرلو۔“

”کا ہے اپنی ذات بگاڑتے ہو، تم سید زادے ٹھہرے۔“

”تم بھی براہمن ہو اور ویسے تمہاری ذات اور اونچی ہو جائے گی، سیدانی کہاؤ

گی! مجھ سے بیاہ کر لو نا بھئی۔“

”مگر ہم تو تم کو یونہی اپنا پتی مانتے ہیں۔“

وہ سن کر چکرا گیا۔ ”وہ کیسے۔۔۔۔۔“ میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے۔ یعنی کہ

۔۔۔ میں۔۔۔ تم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔۔۔“ وہ ہنستی رہی۔ ”ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے

ہیں، یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے!“ وہ اسی طرح بے فکری سے ہنسا کی۔ ہم تو صرف

ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو، ہمارا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ۔“

”جنم جنم کا ساتھ، کیا خرافات ہے۔“ مال نے بھنا کر کہا۔ ”پھر تم نے جادو

گری کی باتیں شروع کیں۔“

”اس میں جادو کیا ہے؟“ چمپا نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا کوئی لڑکی کسی

آدمی کو خود سے پسند نہیں کر سکتی، ہم نے تمہیں چنا ہے اور ہم تمہارے آگے جھکتے

ہیں۔“

”کیا کفر بتی ہو، میں نعوذ باللہ کوئی خدا ہوں۔“

”ہو تو سہی، دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے۔“ وہ پھر زور سے ہنسی۔

اور پھر اس نے کہا تھا: ”اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہونا۔“

”کرتا کیوں نہیں ہوں۔“

”تو پھر اتنی گھبراہٹ کا ہے کی۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہ۔۔۔۔۔“

کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔۔۔ کبیر یہ گھر ہے پریم کا۔“ اور وہ زور سے تہقہہ لگا کر غائب

ہو گئی۔

یہ ایو دھیا کا کنج نہیں تھا، گنگا کی سطح تھی۔ اس کا جہاز سکون سے لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا اور براتی دھماری گارہے تھے اور لڑکیاں ہنس رہی تھیں اور دلہن رو رہی تھی، دلہن، جو گوری رنگت کی دلی پتلی بہاری لڑکی تھی، جانے کس دیس کو جاتی تھی، کس زندگی کی طرف، کس موت کی طرف اس کا رخ تھا۔ جہاز مونگیر پہنچا۔ براتی اس کا ڈولا لے کر کنارے اتر گئے۔ گھاٹ کے جھوم میں سرخ رنگ کا ڈولا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جہاز نے دوبارہ لنگر اٹھایا۔ گنگا کے دونوں طرف سرسبز کھیت تھے اور گاؤں اور بارونق شہر اور دنیا اپنے حال میں مگن تھی۔

پٹنے کے گھاٹ پر بہت سے مسافر اترے، بہت سے سوار ہوئے۔ نئے مسافروں میں چند امیر زادے تھے، ایک جو گیوں کا گروہ تھا۔ ایک مارنجی لباس والا بھکشو تھا جو سب سے الگ تھلک رہتا۔

پٹنے کے امیر زادے دن بھر چوسر کھیلنے میں مصروف رہتے۔ کاٹھیا واڑ کے دو تاجر، جو اپنا سامان لے کر دلی جا رہے تھے، اپنے بھی کھاتے میں لگے تھے۔ جوگی رام دھن میں منہمک تھے۔ مال کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ بھکشو نے اس کا امیرانہ لباس دیکھا اور چپ چاپ جا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ان جو گیوں میں سے ایک مال کے قریب سے گزرا، وہ وضع قطع سے ہندو نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے سر پر چوٹی نہیں تھی۔

”بھائی، تم مسلمان ہو۔“ مال نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

”انسان ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میں۔ میں بھی انسان ہوں۔“ کمال نے لڑکھڑاتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرایا۔

”کیا چاہتے ہو۔“

”یہ پتا نہیں۔“

”اگر اپنے دل کا بھید خود نہیں جانتے تو ہمارے پاس تمہارا کیا کام۔۔۔ ادھر جا کر بیٹھو۔“

اس نے امیر زادوں کی طرف اشارہ کیا، ایسا لگتا تھا جیسے جوگی اسے پہچان گیا تھا۔

”تم کہاں جاتے ہو۔“

”کاشی۔“

”وہاں کیا ہے؟“

”وہاں کیا نہیں ہے؟ وہ شیو پوری ہے، وہاں مسرت ملتی ہے، وہاں میرا مرشد رہتا ہے۔ میرا شیخ، وہ جو گرو ہے میرا، لیکن افسوس کہ تم نے اتنی عمر گنوا دی اور اس کو نہ جانا۔“ وہ ٹھٹھک گیا۔ ”تم جو نیپور کے مال الدین ہو نا۔۔۔“

مال مہوت ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

میں سلطان سکندر کا سپہ سالار تھا۔ میں چنار کے معرکے میں تم سے لڑا تھا بلکہ تم نے اپنی تلوار سے مجھے زخمی بھی کیا تھا، یہ دیکھو۔۔۔“ اس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا جس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اپنا چکارہ، جسے وہ بانٹیں ہاتھ سے بجا رہا تھا، فرش پر رکھ کر وہ مال کے پاس بیٹھ گیا۔ ”تم کو اور بتاؤں، جب تم گوڈ کے

دوبار میں رنگ رلیاں منار ہے تھے وہ جنگلوں میں تمہارے انتظار میں روتی پھرتی تھی لیکن کوئی راج ہنس اس کا پیغام تم تک نہ پہنچا سکا۔“

کمال کا دل دھڑکنے لگا، یہ جوگی کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا یہ غیب کا علم جانتا تھا؟
”میں اپنی فوج لے کر ایودھیا سے گزرا تھا۔ راہڑی میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں اس کا بھائی مارا گیا، وہی جو چتر ویدی پنڈت تھا اور وہ جنگلوں میں روتی پھرتی تھی۔ ہر سپاہی کو دیکھ کر وہ سمجھتی تھی کہ شاید تم ہی آ گئے۔ کیونکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے پاس ضرور واپس لوٹ کر آؤ گے۔ مجھے سپاہی دیکھ کر تمہارا پتا پوچھتی وہ میرے پاس آئی تھی۔ میں تو اسے تمہارے متعلق کچھ نہیں بتا سکا، پھر معلوم نہیں وہ کہاں گئی۔“

کمال کا دل دھڑکنے لگا رہا۔ سنانا اتنے زور سے گر جا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دنیا بہت بڑی ہے“ جوگی کہہ رہا تھا۔ تم اس کو ڈھونڈ نہیں سکتے، وہ تم کو تلاش نہیں کر پائے گی۔ زندگی میں دو انسان صرف ایک مرتبہ ملتے ہیں، اگر کچھڑ جائیں تو ان کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے۔ ملنے اور کچھڑنے کا مطلب جانتے ہو؟ اتنا کہہ کر جوگی نے پھر اپنا چکارہ اٹھالیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

گنگا بہتی رہی۔ چاندی کی وسیع چادر پر مسافروں سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کیں۔ شاہی بحرے، تجارتی جہاز، مچھیروں کی ڈونگیاں، ان کے بادبان شام کو ڈوبتے سورج کے مقابل میں ہوا سے پھول کر یوں پھڑپھڑاتے گویا بے شمار راج ہنس ماسر دور کی سمت اڑنے کے لیے پر توالتے ہوں۔ کشتیوں میں سے گانے کی

آوازیں بلند ہوئیں۔ جوگیوں کے سمرن فقیروں کے ذکر، ویشنو پجاریوں کے بھجن، تاجروں کے جہاز ملک کی منڈیوں کی طرف جا رہے تھے۔ کجرات اور بنگال کے سوتی کپڑے، بنارس کا ریشم، دکن کے ہیرے دور دراز کے ملکوں کے انسان ان کشتیوں میں سوار تھے۔ چین کے عالم، تبت اور کشمیر کے بھکشو، عرب سیاح، ایران کے نقاش، جاوا کے رقص، ملک میں امن قائم تھا۔ دلی میں سلطان سکندر حکومت کرتا تھا زندگی میں بڑی گہما گہمی تھی۔

”خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دل کا چین نصیب ہے، بھائی مجھے شافی چاہیے۔“ مال نے آہستہ سے کہا۔

بھکشو نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر کامل سکون تھا اور لازوال مسرت، آج ویسا کھ پور نہایتھی، آج کی رات دو ہزار سال ادھر، اسی گنگا کے اس پار، ترانی کی ایک بستی میں شاکیہ منی پیدا ہوئے تھے۔ آج ہی ویسا کھ پور نیما کے روز انہیں گیان حاصل ہوا تھا۔ چودھویں کا چاند دریا کی لہروں پر ادھر ادھر تیرا کیا۔ اس کی تیز اور ٹھنڈی کرنیں مال کے اور بھکشو کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ دریا پر مکمل سناٹا طاری تھا۔

”مجھے میرے خیالوں سے نجات دلاؤ۔“ مال نے کہا۔

بھکشو اپنی پراسرار آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ”خیال۔۔۔ خیال خود کو نہیں جان سکتا، خیال اپنے آپ سے باہر نہیں جاسکتا۔ کائنات سے باہر کوئی خدا نہیں ہے اور خدا سے باہر کوئی کائنات نہیں ہے۔ حق و باطل میں کوئی فرق نہیں، لیکن ان سب سے بالاتر ذات مطلق ہے جو سناٹا ہے۔“ اس نے گہری آواز میں کہا۔

”مجھے اس سناٹے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔“ مال نے کہا۔

”شوینا۔۔ سناٹا۔۔ شوینٹا۔۔ جو ذات مطلق ہے۔ جو صفر کا تصور ہے۔“

”مجھے اس تصور سے وحشت ہوتی ہے۔“ مال نے کہا۔ ”۔۔ اس سناٹے

میں میں اکیلا کدھر جاؤں گا۔ تم بھی میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔“ اس نے مہایان مذہب کے بھکشو کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا۔

جہاز ایک گاؤں کے کنارے ٹھہرا۔ ساحل پر چاندنی رات میں وسنت کے دیوتا کا تہوار منایا جا رہا تھا۔ مال گھاٹ پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھتا رہا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر کا رخ کرے۔ دفعتاً اسے ویشنو پجاریوں کی ایک ٹولی نظر آئی جو اس کے جہاز سے اتری تھی، وہ ان کے پیچھے ہولیا، کسی نے اس پر نظر نہ ڈالی۔

بہت دن تک وہ اسی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ گاؤں گاؤں گھومتا وہ ایک ہرے جنگل میں پہنچا، اسے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ قریب جولاہوں کی بستی تھی۔۔۔ معطر ہوائیں درختوں میں امنڈ رہی تھیں۔ سبزے کی شدت سے آسمان کا رنگ ہر نظر آ رہا تھا۔ ساون کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ بھنوروں کی ایسی کالی جامنیں بری گھاس پر پٹ پٹ گرتی تھیں۔ کسم رنگ کی ساریاں اور لہنگے پہنے لڑکیوں نے آم کی ڈال میں جھولے ڈالے تھے۔ چاروں اور گھن بیلے اور روپ منجری اور سدرشن اور ماتی کھلی تھی۔

گلے میں تلسی مالائیں پہنے ویشنو جوگنیں کھل کے درخت کے نیچے بیٹھی کھڑتال بجاتی تھیں۔ گلابی آنکھوں والے طوطے شاخوں پر بیٹھے تھے۔ ترتی

بجاتے، کندل ہاتھ میں لئے جوگی اپنی یا تراؤں پر جا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں جنگلی تیتربول رہے تھے۔

تالاب کے کنارے رس بلی مہک رہی تھی۔ مہوا کے جھنڈ میں سے گیتوں کے خوبصورت سر بلند ہو رہے تھے۔ کمال ایک کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر جنگل اور ساون کی ان صداؤں کو سنتا رہا۔

تب اس کو معلوم ہوا وہ سنائے میں تھا، یہ سنائے کے مختلف پرتو تھے، وہ عالم حیرت میں تھا۔ یہ سنائے ذات مطلق تھا۔ بھاشو کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

پھر اس نے غور سے سنا۔ مہوا کے جھنڈ میں ویشنو پجاریں جو گیت گارہی تھیں اس کے الفاظ اب اسے صاف سنائی دے رہے تھے۔ یہ تو بردوان کے بے دیو گوسوامی کی آواز تھی۔

اس نے ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ دھیان سے سنا۔ پجاریں گارہی تھیں۔ صندل کے گرم جنگلوں پر سے بہتی ہوئی ہوا اپنے ساتھ مہک لا رہی ہے۔ جہاں لالچ کی جھاڑیوں سے چرائی ہوئی خوشبو پھیلی ہے، جہاں شہد کی مکھیاں جھنجھناتی ہیں۔

ان کنجوں سے یہ پروائی آرہی ہے جہاں وہ ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اسی مہینے میں تنہائی بہت کھلتی ہے۔

کیتیکی کی کلیاں اور زرد پھول کام دیو کے بان کی مانند جگمگاتے ہیں پاتل کے شگوفوں پر بھنورے سوتے ہیں۔ مادھوی ہوا میں جھوم رہی ہے اور ریشمی موگرے اور اس سے وہ کنجوں میں ناچتا ہے۔ یہ بہار کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں

تنہائی بڑی کھلتی ہے۔

جیسے گرم ہونٹ بند آنکھوں کو چھولیں اسی طرح سورج کی کرنیں آم کی
کیر یوں پر پڑ رہی ہیں اور وہ پرسکون جہنا کے کنارے رقصاں ہے۔ موسم گل میں
وہ تنہا نہیں ہے۔

وہ گوپیوں کے ساتھ ناچ ناچ کر یونہی اپنا سنے گنوا دے گا جب کہ رادھا اس کی
منظر ہے؟ پجاریوں نے گیت کا دوسرا انترہ اٹھایا۔

جیسے دور جانے والے مسافر کو کوئل کی آواز سن کر اپنے دیس کی ندی کنارے
آموں پر گنگنا تے بھنوروں کی یاد آ جائے اس طرح یک یک اسے رادھا کا خیال
آیا۔

اور رادھا نے دیکھا زریں لباس پہنے، بالوں کو خود رو پھولوں سے سجائے،
اپنے سرخ ہونٹوں کے رنگ کے یاقوت سے مزین، وہ گوپیوں کے ساتھ رقصاں
ہے،

کمال کھنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ سنتا رہا۔

پجاریوں نے گایا۔

کوئل کی آواز سے راہی کو تکلیف پہنچتی ہے۔

ان مسرتوں کا رنج جو حاصل نہ ہوئیں۔

ان سیاحتوں کا رنج جو کی نہ جاسکیں۔

ان محنتوں کا رنج جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اور مسرتوں کے باوجود

مسرت میں کرب چھپا ہے کیونکہ کرب پیہم ہے۔

کمال اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کی آواز، بے دیو کے الفاظ رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔

اور بے دیو نے کہا تھا: میں منتظر ہوں، محبت تو وہ بھی کرتا ہے جس نے محبت دیر میں شروع کی۔

مہری اور گوریا چڑیوں کی سنگت میں وہ جنگل کے سایہ دار راستوں پر ادھر ادھر بھٹکتا پھرا، اور تب دفعتاً درختوں کے جھرمٹ میں اسے گنگا کا پانی جھلملاتا نظر آ گیا۔

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ اس طرح گھومتا پھرتا بنارس پہنچ چکا ہے۔ سامنے دوسرے کنارے پر شوپوری تھی جس کے شوالوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے اور سینکڑوں ہزاروں گھنٹے ایک ساتھ بیٹھ رہے تھے اور ہوا میں عود کی مہک تھی اور گلیوں میں عبادت کے پھول بکھرے پڑے تھے اور گھاٹ کی لاتعداد سیڑھیوں پر لوگ نہا رہے تھے۔ کاشی۔۔۔ ازلی اور ابدی شہر۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں دن بھر بے مقصد پھرتا رہا، اب اس کے پیروں میں سکت باقی نہیں تھی اور وہ بے طرح تھک چکا تھا۔ جنگل کے اختتام پر جولاہوں کی بستی تھی، وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کی چوپال کی طرف بڑھا۔

ایک ابیر نے اسے سر جھکائے جاتا دیکھ کر اس سے کہا: ”بھیا، لگت ہے تم بہت دور سے آئے رہے ہو۔ ترے پیرن ماما کتنی لاگی ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔“

”آؤ بیٹھو۔ سٹو کھاؤ۔“ ابیر نے کہا اور اسے ایک سانبان میں لے گیا۔
”کیڑوں سے تو بڑے دھنواں دکھائی پڑت ہو۔ اس اچرچ میں کاہے پھرے
ہو۔ سلطان کے منشی ہو؟“

”میں کسی سلطان کا منشی نہیں ہوں۔“

”لو آرام سے بیٹھو، یہاں چھاؤں ہے۔“ وہ جوتے اتار کر سانبان میں بیٹھ
گیا اور چاروں اور دیکھنے لگا۔ سامنے آم اور جامنوں کا گھنا باغ تھا جس میں وہ دن
بھر گھومتا رہا تھا۔ مہوے کے جھنڈ میں سے اب بھی ویشنو مغنیوں کے گانے کی مدھم
آوازیں آرہی تھیں۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف دو پہری کھلتی تھی۔

لو بھئی چمپاوتی، اس نے دل میں کہا، تمہاری شرط پوری ہوئی۔ تم نے کہا تھا کہ
میں اپنی تلوار اتار پھینکوں تو تم مجھے اپنے ساتھ کاشی لے چلو گی، میں نے اپنی تلوار
دریا کی لہروں کے سپرد کر دی ہے اور میں کاشی پہنچ گیا ہوں۔
لیکن تم کہاں ہو۔

سامنے سے قلندروں کی ایک ٹولی گزری۔ بہت سے سنیا سی کنڈل پہنے،
ترسول ہاتھ میں لئے گھاٹ کی سمت جا رہے تھے۔ جواہوں، ابیروں اور مفلسوں
کا ایک جوم کھڑتالیں سنبھالے بھجن گاتا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
چمپا نے کہا تھا: ان کا مذاق مذاڑانا، یہ بہت پیارے لوگ ہیں۔ ایک روز یہی
تمہارے کام آئیں گے۔

وہ آہستہ سے سانبان سے نکلا اور اس جوم کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

وہ لوگ اپنے مرشد کے پاس جا رہے تھے، وہ جواہر تارا تالاب میں سے نکلا

تھا۔ وہ اسی جگہ پر رہتا تھا جہاں مولری کے پیڑ تھے اور جہاں رس بیلی مہکتی تھی۔

۲۳

میاں کبیر صبح کے وقت کر گئے پر بیٹھ کر کپڑے بنتے، کپڑوں کا کٹھڑ بنا کر پیٹھ پر لادتے، بنارس کی گلیوں میں جا کر پھیری لگاتے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے مولری کے جھنڈ میں مجمع لگتا۔ چکارے سنبھالے جاتے، کھڑتالیں بجتیں۔ بھجن گائے جاتے، یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس دنیا میں جنگیں ہوتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں آتما بھوت دانت نکو سے دلوں کے تعاقب میں ہیں۔

سارے میں میاں کبیر کی شہرت پھیلی تھی۔ ان کی بانیاں کسانوں اور جاہلوں کی زبان پر تھیں۔ دور دراز کے خطوں سے لوگ ان کی اور کھنچے آتے تھے۔

کاشی کے پانڈوں کو اور دلی کے مولاناؤں کو اور سلطان سکندر کو، جو بڑا کٹر مسلمان تھا، یہ خرافات پسند نہ تھیں لیکن وہ سب کیا کر سکتے تھے؟ سارا دلیس ایک نئے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ پچھلے تین سو سال سے اس صوفی بھگتی مارگ پر ایک بڑا خوبصورت قافلہ رواں تھا۔ اس قافلے میں کیسے کیسے لوگ شامل تھے۔ امیر کے معین الدین اور ایٹھے کے امیر خسرو اور دلی کے نظام الدین اور کجرات کے زسلگ مہتا اور بنگال کے ہیر بھوم کا چنڈی داس اور بہار کی مٹھلا پوری کے ودیا پتی اور مہاراشٹر کا درزی نام ویو، پریاگ کے رامانند اور جنوب کے مادھو اور ولہھ اور

بادشاہوں اور چھترپتی راجاؤں کے درباروں اور امراء، وزراء اور سپہ سالاروں کی
 دنیا سے نکل کر مال نے دیکھا کہ اس دوسری دنیا میں مزدور اور نائی، اور موچی اور
 کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر
 ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔ کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام
 کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی۔ اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس
 میں پھیلا رہے تھے، یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے
 اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے۔ اونچی ذاتوں کے
 برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔ اس میں ہندو مسلمان کا سوال
 نہیں تھا۔ یہاں محبت کا راج تھا اور مال، جو انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، اس
 نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بستے ہیں۔ یہ ابیر، جس نے
 چوپال میں بٹھا کر ستو حاضر کیا تھا، اس کی جان لینا نہیں چاہتا کیونکہ اسے کسی
 سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔ اسے تو دونوں وقت باجرے کی روٹی مل جاتی
 ہے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب؟ یہ کسان،
 جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بچی کو پیر کھلا رہا ہے، اسے
 کیا پرواہ کہ دلی میں آئندہ کون حکومت کرے گا؟ سلطان حسین حاکم ہو تب بھی وہ
 اسی طرح ہل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہو تب بھی۔
 ان ”ترکوں“ سے پہلے جب پر تھوی راج بادشاہ تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی
 جیٹھ کی دھوپ میں ہکان ہوتے تھے۔ ساون میں گاتے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو
 خاموشی سے مر جاتے تھے۔

تب کمال نے سوچا۔۔ کہ گو مذہب کی حیثیت زندگی میں اہم سمجھی جاتی ہے
لیکن محبت ظاہری مذہب سے برتر شے ہے۔
محبت اصل شے ہے۔

دور دور سے لوگ کاشی آ کر کبیر کے قدموں میں بیٹھ رہے تھے۔ کمال ان
سب کی باتیں شوق سے سنتا، ان کی سیوا کرتا۔

کاشی میں ایک روز کو پچیس کا ایک اندھا برہمن وارد ہوا، وہ کبیر کا نام سن کر
سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس کا ایک بازو ٹرائی
میں کٹ چکا تھا لیکن وہ ایک ہی ہاتھ سے رام دھن پر کھڑتاں بجاتا تھا۔ اسے دیکھ
کر کمال کو احساس ہوا کہ وہ جنگلوں اور تباہ کاریوں سے پناہ لینے کے لئے یہاں
بھاگ آیا ہے مگر باہر کی دنیا میں لڑائیاں اسی طرح جاری تھیں۔

”بھائی تمہاری جان کس نے لیتی چاہی تھی؟“ کمال نے اس سے پوچھا۔
”فرنگیوں نے۔“

”فرنگی۔؟“

”ہاں۔ عیسائی۔۔ بہت دور پہنچتم سے آئے ہیں۔۔“ اس نے مختصر جواب
دیا۔

اتنی مدت ہند میں رہ کر وہ نصاریٰ کے وجود کو بالکل بھول چکا تھا جو مسلمانوں
کے جانی دشمن تھے اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے کئے مرتے تھے۔ تاریخ
میں اس کی دلچسپی پھر عود کر آئی، وہ کھسک کر مالابار کے برہمن کے پاس بیٹھ گیا۔
”یہ عیسائی کدھر سے آئے ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔ صلیبی جنگلوں کے

سارے واقعات اسے ازبر تھے۔

”پرنگال۔۔ کوئی دیس ہے۔“

اس نام سے تو وہ واقف تھا۔ دوسرے عربوں کی طرح علم جغرافیہ کا وہ بھی ماہر رہ چکا تھا۔ پرنگال اندلس کے پاس تھا۔ اندلس۔۔ اس کے دل پر ایک برجھی سی لگی، وہ لوگ وہاں مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے بعد اب یہاں بھی آن پہنچے۔ کمال کو یہ معلوم نہ تھا کہ پرنگالیوں کو ان کے بادشاہ نے اور پاپائے روم نے حکم دیا تھا کہ جس طرح مسلمان ہسپانیہ سے نکالے گئے اسی طرح ساری دنیا میں جہاں جہاں ملیں چن چن کر ان کا قلع قمع کرو، ایک بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

”انہوں نے گوا کی ساری مسجدیں ڈھا دیں، مندروں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔“ اندھا برہمن کہتا رہا، ”گوا کے ایک ایک مسلمان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ میں ہندو تھا اس لئے بچ گیا۔“

نوجوان برہمن۔۔۔ جو اپنی نور سے عاری آنکھوں سے اسے تنکے ہوئے دو تارے پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ یہ کالی کٹ کے رلجہ کی بحریہ کا افسر تھا اور رلجہ کے امیر البحر قاسم اور میر حسن کے ساتھ جی توڑ کر پرنگالیوں سے لڑا تھا اور اپنی آنکھیں ان کی بارود کی نذر کر کے اور ایک بازو کٹا کر یہاں پہنچا تھا۔ مال کو سلطان سکندر کا وہ سپہ سالار یاد آیا جو اسی طرح جوگی کاروپ دھارے اسے جہاز پر ملا تھا۔

”ہماری ہار ہوئی یا جیت۔“ مال نے آہستہ سے سوال کیا۔

”ہم نے ترکی کے رلجہ سے مدد مانگی تھی۔ ترکی کا جنگی بیڑا مصر دیس سے ہماری سہائتا کے لئے آیا مگر پرنگالی بڑے زبردست ہیں۔“ اس نے اپنی بے نور

آنکھیں بند کر لیں اور دو تارہ بجانے میں مصروف ہو گیا۔ اب شام ہو رہی تھی اور لوگ کیرتن کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ مال اٹھا اور کوچمین کے اس اندھے کا ہاتھ تھام کر اسے راستہ بتلاتا ہوا لوگوں کے گروہ میں مل گیا۔

بغداد اور جوہپور کا ابوالمنصور مال الدین، مورخ، محقق، سیاست دان، سپاہی، جسے تصوف اور معرفت سے کبھی کوئی سروکار نہ تھا، بالآخر کاشی کے بیچ گنگا گھاٹ پر پہنچ چکا تھا۔

۲۴

لیکن بہت سے بنیادی سوال، سوچنے والے ذہن کے لئے، ابھی باقی تھے۔ کبیر نے اس سے کہا: سنو بھائی سادھو، ہری سے پریم کرو، تمہارے دکھ آپ سے آپ مٹ جائیں گے۔ دکھ سنیہ۔۔۔ دکھ کی حقیقت اس کو جہاز پر اس تاثرک سدھ نے بھی سمجھانا چاہی تھی، لیکن ہری کون تھا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اس سوال پر ایتھنز میں اور اسکندریہ میں اور بغداد میں بڑی لمبی بحثیں کی جا چکی تھیں۔ ہزاروں برس قبل اسی گنگا کے کنارے کپل نے اور جیمینی نے اور شہزادہ سدھارتھ نے اس پر سوچ بچار کیا تھا اور سات سو سال گزرے مہاندی کے اس پار کیرالا میں ایک بہت بڑا عالم پیدا ہوا تھا، اس کا نام شنکرا چاریہ تھا۔ مال نے عہد شفیق کے کپل کا مطالعہ شروع کیا اور کتاب بند کر کے سوچا: نو فلاطونیوں کی عقل فاعل پرش ہے جو عقل حیوانی، پراکرتی، پراثر انداز ہوتی ہے؟ انسان کا خدا سے اتصال نروان ہے۔۔۔

طریقہ اور مارگ دونوں رحیم تک پہنچتے ہیں جو رام ہے؟

گوتم سدھارتھ کے سنہرے راستے پر صدیوں تلک مسافروں کے قافلے گزرا
کیے جنہوں نے دنیا میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں بنارس اور سانبھی، اور
امراوتی اور اجتا اور باغ کے نگارستان سجا ڈالے مگر زمانے نے ایک بار پھر پلٹا
کھایا اور مالوہ اور قنوج اور مگدھ اور گوڑ میں پھر بری کی بھگتی کا چرچا ہوا۔ کیدار
نارتھ سے لے کر دوارکا تک شیو کے عظیم الشان مندر تعمیر ہوتے چلے گئے۔ شاکیہ
منی کا راستہ مہایان مذہب اور تانترک اسرار میں تبدیل ہو گیا اور شاکیہ منی و شنو
کے اوتار بن کر انہی مندروں میں براجنے لگے۔ مانجی لباس والے وہ بھکشو جو
موروں کے نشان والے بادشاہ چندر گپت نری چندر کے وقت سے بھی پہلے جنگلوں
میں نمودار ہوئے تھے ایک ہزار سال کی الٹ پھیر کے بعد سدھ کھاتے تھے اور
بنگال اور بہار کے معبدوں میں جادو ٹونے کرتے تھے۔ مہایان مذہب کا مہاسکھ کا
تصور خرافات میں تبدیل ہو چکا تھا۔

کہہ بڑا آدرش آخر میں یونہی تباہ کیا جاتا ہے۔

لیکن آدرش کیا شے ہے؟

یکلخت مال کو محسوس ہوا کہ وہ بھی بال کی کھال کھنچنے کی عادت اختیار کر چکا ہے
جس طرح اس نے آس پاس کی درگاہوں میں لمبی لمبی چوٹیاں رکھائے برہمن
طالب علموں کو چھیوں فلسفوں کے مسائل کی مین میخ نکالتے سنا تھا۔

قرب و جوار کے گاؤں میں بنارس اور جھوسی اور مگہر میں اسے بے شمار فقراء
ملے جن کی خانقاہوں میں جا کر اس نے تصوف کی باتیں سنیں۔ قصبوں اور شہروں

میں عظیم الشان مدر سے تھے جہاں ایک سے ایک جید عالم تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے عمائے پہنے شیخ الجامعہ جب اس کے سامنے پا لگی میں بیٹھے ہوئے نکلتے تو اسے بعد اذ کی یاد آ جاتی۔ نیم تاریک مٹھوں میں پنڈت اپنے پوتھی پتروں سے سر کھپا رہے تھے۔ گنگا کے کنارے کنج میں کبیر اور ان کے چیلے پریم پریم کی رٹ لگائے جا رہے تھے مگر وہ ہمیشہ کا ضدی خود پسند عرب، اس نے تہہ تک پہنچنے کا تہیہ کیا اور جس طرح وہ سلطان حسین کے مستعد سپاہی کی حیثیت سے نئے معرکے سر کرنے کے لئے اپنی برق رفتار رہوار پر بیٹھا بیٹھا پر شورند یوں میں کود پڑتا تھا، اسی طرح اب اس نے اندھیرے سمندر کو لبیک کہا جس میں اس سے پہلے ہزاروں لاکھوں روحیں ڈبلکیاں لگا رہی تھیں۔ بہت سے لہروں کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ بہت سے کشتی کا بادبان اتار کر قناعت سے ایک طرف کو ہو بیٹھے تھے اور خود کو ہواؤں کے حوالے کر دیا تھا۔ بہت سے اپنے ٹوٹے پھوٹے جہاز کے تختوں پر بے چلے جا رہے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو کب کے ڈوب چکے تھے۔ ساحل تک کوئی نہ پہنچا تھا۔ کیونکہ ساحل نظر نہیں آتا۔ سمندر بہت وسیع تھا اور اتھاہ اور چاروں طرف گھپ اندھیرا سارے میں چھایا تھا۔۔۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ انہوں نے روشنی کے مینار تعمیر کر لیے ہیں۔ بہت سے سمجھتے تھے کہ جو چراغ انہوں نے اپنی اپنی کشتیوں میں جلائے ان کی روشنی میں وہ اس سمندر کو عبور کر لیں گے مگر یہ بھی ان کی خوش فہمی تھی، ساحل نظر نہیں آتا تھا۔

کنارہ کہاں ہے؟ وہاں پہنچ کر کیا ملے گا؟ صحیح عقیدہ کیا ہے اور خدا کا تصور؟

محبت؟ ویراگ؟ میں کیا حاصل ہوتا ہے؟ نجات کیا ہے؟

پنڈتوں سے اس نے ان کے خدا کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ گوکبیر نے اس سے کہا تھا: ”کاشی کے پاٹھ سے تم کو اور باتیں بتائیں گے۔ میں کاشی کا جواہر ہوں تم تو میرا گیان بوجھو۔“ مگر اس نے اس بات کی سنی ان سنی کر دی اور ان تاریک مٹھوں اور پراسرار معبدوں کو اس نے باہر سے جھانک کر دیکھا جن کے اندر اسے قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ عود و لوبان کا دھیر دھواں، دیوی دیوتاؤں کے عجیب و غریب بت، مندروں کے اندھیرے پنہنے آئینے، پیچ در پیچ گلیاں اور چبوترے اور موکھے جن کے اندر رکھی ہوئی کسی دہشت ناک مورتی کی جھلک اسے نظر آ جاتی۔ منٹروں کا جاپ، پھولوں اور مٹھائیوں کے انبار بیلوں اور گائیوں اور بندروں اور طوطوں کی یلغار۔ سیڑھیوں پر جمع پجاریوں کی جھنجھناہٹ، گھنٹوں کی آواز، کیا ان لوگوں کے ذہن، ان کے الہیات کے مسائل بھی ان ہی تگ و تار یک ان گنت برجیوں، گلیوں اور کوٹھڑیوں والے مندروں کی طرح پیچ در پیچ گجھلک اور اور ناقابل فہم ہیں؟ یہ کون جناتوں کی قوم ہے جسے وہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کو تو اپنے ذہن پر بہت مانز تھا۔ کیا وہ مدرسہ نظامیہ کا زمانہ بھول گیا؟

یہ صحیح تھا کہ ہندو فلسفے اور الہیات کے چھ کے چھ مدرسے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اذوق تھے اور اسے خود کبھی فلسفے اور مابعد الطبیعیات سے لگاؤ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ سارے بنیادی مسائل کی طرف سے آنکھ موڑ کر محض ہری پریم کی رٹ نہیں لگائے گا۔ ہری کون ہے؟ ہری کون ہے؟ یا رام یا رحیم؟ وہ خدا کو کس نام سے پوچھے؟ کیا نام ضروری ہے؟ اور خدا کون سا ہے اور کیا وہ بھی ضروری ہے؟ دنیا بھر میں اہل بدعت اور شک پرستوں اور دہریوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے

اسلام، اس کے ایمان میں خلل آچکا تھا۔

اس نے ایک روز چپکے سے کبیر کے کنج سے نکل کر دریا پار کیا اور ایک زبردست جٹا دھاری پنڈت کے پاس جا پہنچا جن کے علم و فضل کا دور دورہ شہرہ تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ مناظرے کے لئے نہیں آیا ہے، وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مگر علم اس قدر وسیع تھا، اسے اپنے غیر اہم ہونے کا شدت سے احساس ہوا اور وہ کہاں سے شروع کرے؟ زمانے کتنے پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں کے دائرے۔ ملک اتنا وسیع تھا، وہ اس کے محض ایک حصے میں اس وقت موجود تھا۔ ابھی اس کو بنگال اور دکن اور مہاراجپوتانہ اور مال ناٹو کی بھی خبر نہیں تھی، وہاں کے علماء وہاں کے گیت کار، وہاں کی خانقاہوں اور نقیبوں کا اسے رتی بھر بھی پتا نہ تھا۔ وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔ عمل اور علم اور محبت، تینوں رستے اس کے سامنے کھلے تھے، وہ کس پر پہلے چلنا شروع کرے؟

عمل کے راستے کا بیان قدیم ویدوں میں تھا اور کلپ شاستروں اور دھرم شاستروں اور مہابھارت اور پرانوں میں اس کا تذکرہ تھا۔ مہابھارت میں کرشن نے ارجن کو عمل کی راہ دکھائی تھی۔ ویدک خداؤں کا ملک پر ہزاروں برس سے راج تھا جو رفتہ رفتہ فلسفے کی علامتوں کے بجائے عوام کے ذہن میں دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے راج رہے تھے۔

اس کرم مارگ کے متعلق اس نے پڑھا کہ یہ علت و معلول کا رشتہ ہے جس کے ذریعے انسان اور کائنات ایک دوسرے سے بندھے ہیں اور بندش ہمیشہ

تکلیف دہ ہوتی ہے اور نجات کرم کے چکر سے آزاد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔
 دوسرا راستہ علم کا تھا۔ ویدک عہد کے بعد کے حکماء نے طے کیا تھا کہ محض عمل
 سے نجات ممکن نہیں۔ خود عمل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ جاننا چاہیے، یہ کھوج لگانے کا
 رستہ بہت طویل تھا۔ اپشندوں میں کسی ایسے طریقے کی تحقیق شروع کی گئی تھی جس
 سے علت و معلول کا چکر ٹوٹ سکے۔ اس تحقیق نے چھ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو جنم
 دیا تھا۔ منطق کے اصول وضع کیے گئے۔ کپل نے کہا۔ پرش اور پراکرتی، روح اور
 مادہ ازل سے اکٹھے موجود ہیں۔ مادہ حرکت کرتا ہے اور تبدیل ہوتا ہے۔ روح
 کائنات سے علیحدہ ہے۔ کائنات کا اس کے بغیر بھی ارتقا ہوتا ہے، کیونکہ ذہن،
 شخصیت، خودی روح میں شامل نہیں لیکن پھر بھی روح مادے میں گھل مل جاتی ہے
 اور اس کی مکتی اسی وقت ہے جب مادے سے وہ خود کو جدا کر دے۔ مادے میں مبتلا
 رہنے کا نتیجہ دکھ ہے، اگر اسے اپنے اور پراکرتی کے فرق کا علم ہو جائے تو وہ آزاد
 ہو سکتی ہے۔ کپل دہریہ تھا۔ اس کے نزدیک تخلیق اور ارتقاء خدائی کارنامہ نہیں بلکہ
 مادے کی فطرت تھی۔

پھر کمال نے چن جلی کے یوگ ستر پڑھے۔ اس کا الیشور خالق کائنات نہیں
 بلکہ روح ازلی تھی جو مادے میں مبتلا نہیں ہوئی۔ ویدانت والے وحدت الوجود
 کے قائل تھے۔

عہد عتیق کے برہمن قانون ساز گوتم کے فلسفہ علم میں اس نے وجود اور عدم
 وجود، بھاؤ اور ابھاؤ کی تفصیلات پڑھیں۔ گوتم نے ادراک، منطق اور استنباط کے
 ذریعے چیزوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا خلاء میں سے

پیدا ہونے کے بجائے ابدی ذرات، زمان و مکان اور ذہن و دماغ نے تخلیق کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مٹی اور پانی کی طرح ساری مرکب اشیاء کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور رہا ہو گا کیونکہ وہ نتیجے کی حیثیت میں موجود ہیں۔ زمان و مکان اور ذرے الہد و ہیں۔ کسی سبب کا نتیجہ نہیں لہذا مرکب اشیاء کا سبب کوئی ذہن محرک ہے۔ ورنہ مرکب جو ہر کے مادی اسباب یعنی ذروں میں وہ ضابطہ و تنظیم نہیں ہو سکتی جس کے ذریعے ان کے نتائج کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ذہن محرک کو مادی اسباب کا براہ راست علم ہو گا اور نتائج کی کار فرمائی کی طاقت بھی۔ کوئی انسان اس علم اور طاقت کا حامل نہیں۔ لہذا برہمن قانون ساز گوتم نے کہا تھا کہ اس مرکب اشیاء کی دنیا کا سبب الاسباب خدا ہے۔

وقت کے متعلق اس نے پڑھا کہ زمان و مکان اضافی ہیں اور محض ایسا خلا نہیں جس میں حقیقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ وقت کے مسئلے پر کمال بہت گڑبڑ آیا، یہ مسئلہ بھی سامی نظریہ کائنات سے یکسر جدا گانہ تھا جس میں ابتدائے آفرینش سے روز قیامت تک ایک مخصوص باضابطہ وقفہ تھا۔ جس کے بعد ابدیت ہی ابدیت ہو گی لیکن یہاں تو ابتدائے آفرینش کے بعد پھر ابتدائے آفرینش تھی اور کوئی ایسا مخصوص نقطہ نہ تھا جہاں سے وقت شروع ہوا ہو۔ یہ حکماء کہتے تھے کہ وقت کا لمحہ مختلف انسانوں کے لئے مختلف ہے۔ انسانی وقت دیوتاؤں کے وقت کا سواں اور برہما کے وقت کا دس لاکھواں حصہ ہے۔ لہذا چھوٹے اور محسوس کرنے کی دنیا ہی وجود کی ساری ممکنات سلب نہیں کر لیتی۔ اس نے پڑھا: ”زمان و مکان حقیقت کی جہت ہیں اور حقیقت وجود میں آنے کی کیفیت کا دوسرا نام ہے اور ابدی ارتقاء اور

اشکال اور مینتوں کے پر پیچ نمود اور دنیاؤں کے تسلسل کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔“

پھر ایک گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے خلا تھا اور اس میں کائنات کو ظہور ہوا۔ یہ وحی اور الہام کے قائل خدا پرستوں کا گروہ تھا۔ حقیقت پرستوں کا نظریہ تھا کہ فطرت خدا کے ساتھ ابد سے موجود ہے اور آ زاد ہے۔ خدا محض صانع اور آفریدگار ہے۔ عینیت پرستوں کے نزدیک خدا کے علاوہ اور کوئی شے حقیقی نہیں تھی۔ پنج راتریوں کا عقیدہ تھا کہ وشنو ذات حقیقی ہے اور کاشمی بحیثیت کر یہ شکتی مشیت ایزدی اور بحیثیت بھوت شکتی کائنات کی ماں ہے۔ بدھ مت والوں کا قول تھا کہ خدا اور روح دونوں کا وجود نہیں۔

وہ کون سے مدرسہ فکر کا مطالعہ پہلے شروع کرے۔؟

ویدانت نے اسے اپنی طرف کھینچا اور وہ شکر اچار یہ کے مطالعے میں پھر سے جت گیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ملک میں بدھ مت کو زوال آ چکا تھا۔ گندھارا اور کاشمیر اور وادی سوات اور کرمان اور بلوچستان اور مدھیہ پردیش ہر جگہ دوبارہ ہمیشہ ور کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ ملایا اور سیام ویش اور چمپا کے دور دراز ملکوں میں نیل کنٹھ شیو کی آرتی اتاری جاری تھی جس نے ساری کائنات کا زہر پی کر اپنے گلے کو نیلا کیا تھا۔

یہ تصورات بے حد لرزہ خیز تھے۔ مہا بھیرو، آفاق کا خوفناک جوگی، جو اپنے ہاتھوں میں برہما کی کھوپڑی کا کشکول لیے ڈمرہ بجاتا، تین ڈگ بھر کے تینوں

دنیاؤں کو عبور کر لیتا تھا اور فقیروں کی طرح اپنے بیل پر بیٹھا کائنات میں مارا مارا پھرتا تھا۔ مہاکال۔۔۔ برہما و ششمویش کا تیسرا، تباہ کن روپ۔۔۔ شیونٹ راج۔۔۔

مدھیہ پر دیش اور دکھن میں لنگم کے معبد تعمیر کر لیے گئے تھے۔ گپتا عہد میں اب شہو مہاراج کی عمل داری تھی۔ عرب سیاح اپنے سفر ناموں میں اس عجیب و غریب مذہب کا تذکرہ کر رہے تھے۔ خداؤں کی فوج کی فوج تھی جو ہر طرف کودتی پھاندتی پھر رہی تھی، خوفناک عفریت نماؤں ہاتھ والی سیاہ فام ڈانٹیں، پریوں کی ایسی نرم و نازک دیہیاں۔ چاند اور سورج، آگ اور بادل، ہاتھی کی شکل والا اور بندر کی شکل والا، ناگ اور کچھوے اور تیرتھ اور میلے اور یاترا گئیں اور تہواروں کا نفل غپاڑہ اور خونی قربانیاں اور جادو منتر اور ٹوٹے ٹوٹے کالے کا ایک ہنگامہ بپا تھا۔ سمندر پار کمبوج دیش اور یاوا اور سماٹرا میں نئی برہمن شاہنشاہیت کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شیو کی ڈمرو سارے میں بچ رہی تھی۔

ہندو مذہب کی تجدید اور نئی تنظیم میں اس اکیلے نوجوان کا کتنا بڑا حصہ تھا جو آٹھویں صدی عیسوی میں مالا بار کے ساحل پر الورندی کے کنارے شوگر و برہمن کے یہاں پیدا ہوا۔ علم کے راستے پر چل کر ایک طرف جس نے اچھدوں اور گیتا اور برہم ستر کی تفسیریں لکھیں اور دوسری طرف مذہب کو فلسفہ طراز یوں سے بے نیاز کر کے عوامی بنایا جو سارے ملک میں مٹھ قائم کرتا اور مذہب کا پرچار کرتا پھرا اور بتیس سال کی عمر میں مر گیا۔

ہندوستان کا عظیم ترین مفکر۔۔۔ شکر اچاریہ! اس کے فلسفے کا مرکز خدا کی وحدانیت تھی۔ خدا، جو خالص ذہن اور خالص وجود تھا۔۔۔ نرگن۔۔۔ اور دنیا جو

مایا تھی۔

لیکن جس طرح دنیا میں دو طرح کی تھیں۔۔۔ ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی، اسی طرح علم دو طرح کے تھے۔۔۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ برہما اور ایشور۔ چنانچہ عوام، جو شکر اچار یہ کے ذہن کی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کو اس نے پروہتوں کے حوالے کر کے برہمن عملداری کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

۔۔۔۔۔ نیتی۔۔۔۔۔ نیتی۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں ہے۔ یعنی برہما کا تجربہ نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔ اپشندوں میں لکھا تھا۔ شکر اچار یہ نے اس کی تشریح کی۔۔۔۔۔ نیتی نیتی کا مطلب عدم وجود نہیں۔ ذات حقیقی مکمل بھرپور وجود ہے، اور ست، وجود، چت، شعور جو کائنات کو منور کرتا ہے برہما ہے اور ابدی ہے۔ ست چت اور آنند برہما کی صفات ہیں بلکہ خود اس کی ذات ہے۔ علم برہما کا جوہر ہے۔ ساگن برہمایا ایشور زندہ خدا ہے۔ پراکرتی اور مایا کے ساتھ برہما ساگن بن جاتا ہے، وہ بیک وقت ایشور بھی ہے اور جیو یعنی شخصی خودی بھی، شکر اچار یہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔

فلسفی مادہ و اچار یہ نے دوئی کے نظریے کا پرچار کیا۔ اس کے نزدیک برہما اور جیو کے علاوہ تیسری، سستی مادی دنیا کی تھی۔ رامانج نے کہا: برہما اور مایا الگ الگ نہیں بلکہ سب برہما ہے۔۔۔۔۔ برہم مایا۔۔۔۔۔

کمال پنڈتوں سے برہم ستر کی تفسیر پڑھتا رہا۔ شکر اچار یہ نے کہا کہ حقیقت کو دو مختلف معیاروں سے جانچا جاسکتا ہے۔ ایک راستہ یہ علم کا تھا جس پر مال خود گرتا پڑتا، ششم، ششم چلا آ رہا تھا، تیسرا راستہ ابھی باقی تھا۔ جانے اس میں اتنی ہمت باقی

رہ جائے گی کہ وہ اس راستے کو بھی آزما سکے۔

”مدرسوں میں جزا و سزا اور خیر و شر کے مسئلے پر طویل بحثیں جاری تھیں۔ مسلمانوں کے بہتر کے بہتر فرقے بزم خود صحیح راستے پر تھے۔ صوفی اور درویش اپنے اپنے حلقے پھیلانے بیٹھے تھے اور خدا کی محبت میں آپس بھر رہے تھے۔ اس نے معتزلیوں سے مباہلے کیے جو مذہب کو عقل سے پہچاننے کے مدعی تھے۔ شیعوں نے اسے اپنی جانب بلایا جن کا حلول کا فلسفہ اہل ہنوز کے فلسفوں سے ملتا جلتا تھا۔

ملا متبیوں کے قصے بھی اس نے سن رکھے تھے۔ گنگا کے کنارے کنارے آم کے درختوں میں چھپی ہوئی خانقاہوں میں اس نے ان اللہ کے بندوں کو دیکھا جو لاہوت سے ماسوت تک سارے فاصلے طے کر چکے تھے یا تصور شیخ میں گم بیٹھے تھے۔ نروان اور فنا کی تلاش میں اس نے یوگیوں اور صوفیوں دونوں کو مرا تے اور سادھی میں کھوئے ہوئے دیکھا۔ علم کا راستہ وہ طے کر رہا تھا مگر اس کا دماغ چکرارہا تھا، یہ راستہ بل کھاتا جانے کتنی دور تک جاتا تھا۔ ابھی تو وہ پیراڑ کے دامن ہی میں پہنچا تھا۔ صوفیوں نے اسے اپنی اور بلایا۔ انہوں نے کہا: آخری حقیقت روشنی ہے۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ نور۔۔۔ جو نور نہیں اس کا وجود نہیں۔ چند اور درویشوں نے اسے بتایا: آخری حقیقت خیال ہے۔ خدا کے جلال و جمال اور مال کے ذکر کی گونج اس نے ان کنجوں میں سنی۔ کیونکہ یہ ہندوستان تھا۔ یہ فرید الدین عطار اور جویری اور شیخ جلال الدین تبریزی اور بہاء الدین زکریا اور جلال الدین سرخپوش اور معین الدین چشتی اور قطب الدین بختیار کاکی کا ملک تھا اور کون

بد قسمت ہوگا جو اس ملک میں آ کر بھی وہ ناپا سکے جس کی اسے تلاش تھی۔

مگر ابھی تو وہ کپل اور شنکر اچاریہ کے ابواب بھی نہ پڑھ پایا تھا۔ کیا وہ یونہی خالی الذہن خالی دماغ لے کر ان سنتوں اور صوفیوں کے پاس چلا جائے۔۔۔؟
دل میں شبہ رکھے اور ان معصوم لوگوں کو دھوکا دے؟

ایک رات وہ گھنٹوں بیٹھا مٹھ کی دیوار کے نیچے سوچا کیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے، وہ اندر نہ جاسکتا تھا۔ اسے یہ اشلوک بہت اجنبی لگے۔ سارے جو پور کے علماء اور کاشی کے پانڈے اسے حلقہ باندھے دانت نکوستے نظر آئے۔ وہ ان سے علیحدہ نیچے موجود تھا۔ کوئی اس کی بات ہی نہ سنتا تھا، وہ دیوار کے نیچے بیٹھا رہا۔

صاحبو مہروبان۔۔۔ صاحبو مہروبان۔۔۔ اس نے پٹ کر دیکھا۔

رات کی ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ قریب میڑھیوں پر چند پھاڑی آن بیٹھے تھے اور وہ اکتارے پر الپ رہے تھے۔۔۔ صاحبو مہروبان۔۔۔ صاحبو مہروبان۔۔۔
صاحبو۔۔۔

اس نے انگڑائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مال الدین۔۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبیر کا صاحب تمہیں واپس بلا رہا ہے، وہ جو بہت مہربان ہے۔ دونوں راستے تم نے دیکھ لئے، لیکن ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔
اس پر چل کر شاید تم اس تک پہنچ سکو۔ ہاں۔۔۔ ابھی محبت کا راستہ باقی ہے۔

اس نے دوبارہ گھاٹ کا رخ کیا اور گنگا عبور کر کے کبیر کے کنج میں واپس جا

پہنچا۔

اب تو لگتا تھا جیسے عمر بھر سے وہ انہیں فضاؤں میں سانس لینا آیا تھا۔ جہاں
 ڈھاک کے جنگلوں سے قترنے کی صدائیں بلند ہوتیں۔ جہاں گورکھ ناتھ کے جوگی
 شیر کی کھالیں اوڑھے کانوں میں کنڈل ڈالے سیٹگی اور زسنگھے بجاتے جسم پر
 بھبھوت ملے ان جنگلوں میں گھومتے تھے۔ جہاں ڈھاک پھولتی تھی۔ یہ کیسی
 انوکھی فضا تھیں جہاں نوے قسم کے ماتھ اور چوراسی قسم کے سدھ پہاڑوں کی
 گچھاؤں اور نیم تاریک مٹھوں اور لرزہ خیز معبدوں میں اپنے اپنے دائرے
 پھیلائے بیٹھے تھے اور کیا لک اور کالاکھ بدن پر رکھ ملے، کھوپڑیوں کے ہار پہنے،
 کڑا بجاتے چاروں اور گھومتے تھے۔ ایک سے ایک پر مہنس اور یوگیندیوں کے
 کنارے کٹیوں میں بیٹھا تھا۔

یہ سکون بخش ماحول جہاں گیت تھے اور ڈھول اور منجیرے کی صدائیں، بسنت
 رت آتی تو سارے میں زرد اور دھانی رنگ پھیل جاتے۔ گر یکھم رت میں
 درختوں سے مہوہ ٹپکتا اور آم کے درخت بور سے لد جاتے۔ رنگیلی برکھارت میں
 چند ریاں ہوا میں ہراتیں، الاؤنیاں گائی جاتیں، ہڑکیاں پکوان پکاتیں۔

بھاؤوں کے مہینے میں گنگامائی کا جوش اور غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ شرو کے موسم
 میں پہلی چاندنی سارے میں پھیلتی اور اداس سہاگنیں اپنے پردہ سی شوہروں کی یاد
 میں برہالا پتیں، چرخہ کاتیں اور ساس نندوں سے لڑتیں۔

بہمنت رت آتی۔ اگہن اور پوس کی مردہوائیں چلاتیں، الاؤ جلتے، آٹھا اول
 گایا جاتا۔ ماگھ اور پھاگن کے مہینوں میں کھیتوں پر پالا برستا۔ چنے اور ارہر کے
 پودوں پر اوس کے قطرے جگمگاتے کسانوں کے جھونپڑوں سے چکی کی گھر گھر کی

صدائیں بلند ہوتیں۔

آوازوں اور رنگوں کی اس دنیا میں وہ مکمل طور پر رس بس چکا تھا۔
یہ سب تھا مگر چپا نہیں تھی، اسے کون زمین نگل گئی؟ کون آسمان کھا گیا؟ کون
چتا کے شعلوں کی وہ نذر ہوئی؟ کس ندی کی لہروں نے اسے اپنی اور کھینچا؟
یہ کون بتا سکتا تھا؟ ان گنت تہوار آئے اور نکل گئے۔ رکھشا بندھن اور بھیا
دوج اور جنم اشٹمی اور ہولی اور دیوالی اور محرم اور رام لیلا۔ کسی ہنگامے کسی میلے کسی
گاؤں کسی بستی میں وہ نظر نہ آئی، وہ سارے میں مارا مارا پھرا، ایک دو بار وہ ایو بھیا
گیا، اس کا جی چاہتا تھا کہ عمر انہیں سبزہ زاروں، ہر جو اور گنگا کے ان ہی ساحلوں
پر گزاردے۔

چپا کی یاد اب ایک عجیب حیثیت سے اس کے دل میں رہتی تھی۔ بھگتی مارگ
میں اس نے دیکھا تھا کہ وشنو، انتریا می ایسا خدا ہے جو دلوں کے اندر رہتا ہے، وہ
باپ ہے، شوہر ہے، ماں ہے، دوست ہے، رادھا کے لئے کرشن ہے، کرشن کے
لئے رادھا ہے۔ اس نے سوچا کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا فاصلہ تو بہت
طے کرتے ہیں مگر چپا ان گنت اندھیروں میں میرے لئے اجالا کرتی جاتی ہے۔
جب وہ ساون کی راتوں میں لڑکیوں کے گیت سنتا تو دنیا بالکل نئی شکل میں اس کی
آنکھوں کے سامنے آ جاتی کیونکہ اب اسے معلوم تھا کہ الفاظ کے معنی کیا ہیں۔
ویراگن جو پیا کی تلاش میں اندھیری رات میں نکل کھڑی ہوئی، برہا کی رات
فراق تھی۔ جوگن، گوری، سہاگن، خدا کا بندہ تھا۔ پتی، منوہر، گردھر گوپال، خدا تھا
جس کی کھوج میں گوری راج پاٹ چھوڑ بنوں میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عرب و

عجم کی شاعری کی تصوراتی کائنات سے جو اس کا رشتہ اب تک رہا تھا وہ اس رشتے سے بالکل مختلف تھا جو اس نے ان الفاظ، ان سہروں، مدھم رنگوں سے قائم کیا۔

خدا ساقی نہیں تھا، خدا جیتم تھا۔ ہری، شیا، کنہیا اور رام۔۔۔ موہے رام سے کوئی ملا دے۔ موہے رام سے۔ کوئی کہے وہ بے اودھ میں کوئی کہے بند راہن میں۔۔۔ کوئی کہے وہ بے اودھ میں۔۔۔

وہ مہینوں یونہی ادھر ادھر پھرا کیا۔ ایک بار وہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا مچی۔ الہا بانی سیانی آدمی ہے بغداد لوٹ گیا ہو گا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب؟ وہ تو گھاگرا کے کنارے کنارے گھومتا پھرتا تھا، جب وہ لوٹ کر آیا اسے جولاہوں کی بہتی واپس جاتے ہوئے ڈر سا لگا۔ گروا سے ڈانٹیں گے تو نہیں کہ تم اب تک کس چکر میں مبتلا ہو، لیکن میاں کبیر اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ تال سوکھ کر پتھر بھیو، ہنس کہیں نہ جائے۔ کچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھائے انہوں نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کپڑے کاٹنا تیار کرتے ہوئے کہا۔

کمال وہیں مٹی سے لپے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا اور کرگھے کی آواز سننے لگا۔ ہنس کہیں نہ جائے ہنس کہیں نہ جائے، وہ یہاں سے کہاں جا سکتا تھا کچھلی پریت کا ناطہ تو بہت گہرا ہوتا ہے۔ وفا کا مطلب اس کی سمجھ میں آیا۔ وفا کا راستہ تو اسے چمپا ہی نے سمجھایا تھا، وہ کبیر کے ساتھ ساتھ ایسے رہتا جیسے گنگا کے جلو میں جمناجی بہتی ہیں اور چمپا اس کے ساتھ ساتھ اس طرح تھی جیسے سنگم کے ساتھ سرسوتی جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی۔

مگر یہ ساتھ بھی چند روزہ تھا۔ کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعتی جو ابا عوام کو گمراہ کر رہا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لوگوں نے گنگائیں ڈبو دیا مگر وہ ضدی جو ابا، جل تھل راکھت ہیں رگھوناتھ، کا نعرہ لگاتا پانی سے باہر نکل آیا۔

دلی کا سلطان بڑا دیالو اور دین دار مسلمان تھا، اس نے میاں کبیر سے کہلوایا کہ وہ شہر سے محفوظ رہنے کے لئے کاشی سے کہیں دور چلے جائیں۔

۲۵

میاں کبیر بنارس سے جلا وطن ہوئے۔ شوپوری کا جنگل اجڑ گیا جہاں مولسری مہکتی تھی اور سدیشن کے پھول کھلے تھے۔ میاں کبیر کا کرگھا سمنان پڑا تھا، ان کے مکان پر خاموشی چھائی تھی۔ ممالی، ان کی چھوٹی سی بچی، بہتی کی گلیوں میں روتی پھرتی تھی۔ کاشی نواسیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ممال نے ایک بار پھر اپنا رخت سفر باندھا اور گنگا کے گھاٹ پر پہنچ کر بنگال جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا، اس کے ایک سرے پر یہاں سے سینکڑوں میل دور گوڑ تھا جہاں وہ آج سے کئی سال ادھر اپنے سلطان کو تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

چند ہفتوں بعد جہاز پٹنہ پہنچا۔ پٹنہ میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان حسین شرقی گوڑ سے بھاگل پور آ گیا تھا اور یہاں چند سال گزرے اسی جلا وطنی کے عالم میں خدا کو پیارا ہوا۔

سلطان حسین شرقی جس نے موسیقی کی دنیا میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا تھا۔
جنگلوں میں لڑا بھڑا، جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا اور ختم ہو گیا۔
لیکن حسینی پیا، جس کی سلطنت چند روزہ تھی اور جسے زندگی میں امن نصیب نہ
تھا، ہر میں ڈوب کر زندہ رہا۔

سر کی لہروں پر بہتے ہوئے اب سال نے نئی نئی دنیاؤں کی سیر شروع کی۔ نغمہ
جو سب سے پہلے پیدا ہوا۔ نغمہ حق جسے کبیر انہد ناو کہتا تھا۔ باجست انہد ڈھول
رہے۔ تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے، تجھے ہری ملیں گے۔

موسیقی کی یہ ساری دنیا اس کی اپنی تھی۔ بے دیو اور دیوتی اور چنڈی واس
کے بھجن، ماہی گیروں اور کسانوں کے گیت، کوچہ گرد فقیروں کے لُٹن۔ اس دنیا میں
حملوں اور شب خونوں اور فوجوں کی یلغار، سیاسی تلاطموں، جلا وطنی اور موت کا کھڑکا
نہ تھا۔ موسیقی کی وحدت خدا کی وحدت تھی۔

بنگال پہنچ کر وہ گنگا کے کنارے ایک ایسے گھاٹ پر اترا جس کا نام اس کو معلوم
نہ تھا۔ یہاں پان کی بلیں پھیلی تھیں اور دھان کے کھیت تھے اور جھیلوں میں نیلے
پھول کھلے تھے۔ برگد کے درخت کے نیچے کسی مرشد کی خانقاہ تھی، اس نے وہیں
رہنا شروع کر دیا۔ بنگال جو سریلی آوازوں کا وسیع بھنور تھا۔ بادل گانے والوں کی
ٹولیاں اک تارہ بجاتی گلی گلی گھومتیں۔ داستان گو کا گاکا کر روپ کھنائیں سناتے۔
مانجھی اور سپیرے اور ہاتھی پکڑنے والے ہر سہ گاتے رہتے۔ کرشن اور رادھا کی
محبت میں ہر انسان سرشارنت نے راگ الاپتا پھرتا تھا۔ اس سحر انگیز سرزمین کے
باسیوں کی رگ رگ میں موسیقی رچی تھی۔ سال ان کوچہ گرد شاعروں کے ساتھ

سارے میں گھومتا پھرا۔ پورب میں دریاؤں کی لہروں پر اپنی ناؤ کھیتا وہ چاہنگام کی پہاڑیوں اور اراکان تک جا پہنچا۔ یاتریوں کے ساتھ وہ سینٹا کنڈ گیا جہاں اونچی پہاڑی پر، جس کے دونوں طرف گہرے کھڈ تھے اور جن میں باگھ گھومتے تھے، سینٹا مہارانی کا مندر تھا۔ پہاڑی کے گھنے پر خطر جنگلوں میں صدیوں پرانے مٹھ تھے اور پہاڑی کے دامن میں سنگ سرخ کے تالاب کے کنارے کنارے معبد بنے تھے اور بڑے درختوں کے نیچے لڑکیوں کی ٹولیاں بیٹھی کیرتن گاتی تھیں۔

چاہنگام کا علاقہ دلفریب تھا۔ بل کھاتے تند رو عظیم دریا، خطرناک بن، خوشبودار پھول اور پھل، سرسبز پہاڑی راستے، بانس کے گھنے جھنڈ جن کے اندر عمیق تاریکیوں میں خانقاہیں تھیں۔

ایک روز وہ ان جنگلوں میں سے گزر رہا تھا اسے ایک تالاب کے کنارے چند لوگ اکتارہ بجا کر گاتے دکھائی دیے، وہ ان کے قریب پہنچا۔ یہ نظام ڈاکو کا گیت تھا جو وہ لوگ لہک لہک کر انتہائی عقیدت کے ساتھ گارہے تھے، اس کی دھن کیرتن کی ایسی تھی۔ ایسی نعمت سال نے آج تک نہ سنی تھی، وہ دلچسپی سے کان لگا کر سننے لگا۔ اس گیت کا مصنف ان علاقوں کا بہت بڑا ڈاکو تھا جو سو سال گزرے یہاں لوٹ مار مچایا کرتا تھا اور پھر صوفیوں کی سنگت میں پڑ کر خود بھی بہت بڑا ولی اللہ بن گیا تھا۔

اگر محمد آوتا رجنم نہ لیتے۔۔۔ کیرتن منڈلی نے گایا۔۔۔

تو اللہ کی حکومت تر لوک میں قائم نہ ہوتی۔

نمونہ ہے عبداللہ اور آمنہ

جے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیاء کی اور بی بی فاطمہ کی جو سارے جگ کی
ماتا ہیں۔ جے ہوا تر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔
جے ہو پورب سے نکلتے سوربہ کی
اب میں وندراہن کے سامنے جھکتا ہوں۔

بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹندیوں اور ساگروں کو میرا

پرنام

جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی
جے ہو دھرتی ماتا اور پوتر سنگھاندی کی
نو پاڑا کی مسجد کو میرا پرنام
کیونکہ وہ بڑا پیر ایک باران خطوں سے گزرا تھا
اب میں آگے بڑھ کر سینٹا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سینٹا دیوی اور ان
کے

مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام

جے ہو۔۔۔ جے ہو۔۔۔ جے ہو۔۔۔

کمال حیرت زدہ بیٹھے عجیب و غریب نعت سنتا رہا اور پھر گانے والوں کی
آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا، اب وہ بغداد سے ہزاروں
لاکھوں میل دور نکل آیا تھا۔۔۔ مذہب اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اور پس منظر
سے کس طرح متاثر ہوتا ہے، کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی سرزمین میں پھیلتی
ہیں۔ کمال گاتا رہا۔ جے ہو جے ہو۔۔۔ جے ہو۔۔۔

اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا، یہ بنگالی زبان تھی جو اودھ اور بہار کی بولیوں سے زیادہ مختلف نہ تھی اور سنسکرت سے قریب تر تھی اور ملک کی دوسری جدید زبانوں کی طرح تیزی سے اس کی نشوونما ہو رہی تھی۔

یہ بڑی میٹھی زبان تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا۔ اسی میں بات چیت کرتا، اسی میں سوچتا، اسی میں لکھتا۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربار جوینپور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ گو وہ دربار اس وقت لٹ چکا تھا لیکن حسین شرقي اور اس کے ساتھیوں کی شان و شوکت بہر حال باقی تھی لیکن دنیا تو اب مدتیں ہوئیں جوینپور کے ابوالمصوٰ رمال الدین کو بھول چکی تھی۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ خوبصورت نوجوان، جس کے سر کے بال کنپٹیوں پر سے تھوڑے تھوڑے سفید ہو چکے ہیں اور جو چمپا کے درخت کے نیچے بیٹھا ایک بادل سے کنچن مالا کی کہانی سن رہا ہے۔ یا اک تارہ بجا بجا کر کبیر داس کی کوئی بائی الاپ رہا ہے یا کاغذ قلم لئے بنگال زبانی میں کوئی لوک کہانی قلمبند کرنے میں مصروف ہے، یہ کون ہے؟

گاؤں کے اور بادل گانے والوں سے گیتی کتھائیں سنتے اس سرزمین کے بہت سے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرے۔ پال بادشاہوں کا بنگال جب گوتم بدھ کے پجاری یہاں موتی رولتے تھے۔ جب پدم اور بھاگیرتی اور مدھو متی پر میور پنکھی جہازوں کے بحرے تیرتے تھے۔ جب ان سایہ دار راستوں پر سے پھولوں سے ڈھکے پشپ رتھ گزرتے تھے جن میں بیٹھی چترنی ناریاں مدھر مدھر ہنستی تھیں۔ جگمگاتے محلوں میں رہنے والی ملکہ مینامتی۔ زرنکار چتر ڈولوں کے

سرخ پردوں سے جھانکتی دہنیں، وہ سب کہاں گئیں؟ وہ شان و شوکت کا زمانہ کیسے ختم ہوا؟ بدھ بنگال جو ہیرے جواہرات اور سونا اور چاندی اور موتی رولتا تھا وہ سب کیا ہوا؟ اب تو سمین بادشاہوں کے محلوں میں بھی الو بولتے تھے۔ گوتم بدھ اور دہی تارا اور درگا بھوانی اور روشنو کے پجاری دھڑا دھڑا مسلمان ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے نقشے کس طرح بدلتے ہیں، سال آنکھیں بند کر کے سوچتا۔

کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا، وہ۔۔۔۔۔ مورخ، محقق، سیاستدان، سپاہی، صوفی، کبیر کا چیلہ۔۔۔ اب گیت کار بن چکا تھا۔

اسی طرح گھومتے پھرتے وہ سونا رگڑوں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔ اس لڑکی کا نام شنیل تھا، وہ ذات کی شودر تھی۔ ایک روز جب وہ تالاب کے کنارے گا گرے کر آئی تھی سال اس کے لمبے بالوں اور سیاہ پلکوں پر عاشق ہو گیا، یہ عمر اور ذہنی پختگی عشق کرنے کی نہیں تھی لیکن روح اور دل کی کائناتوں کی ساری مسافتیں طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے، ایسا سکون جس میں پرخطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ یہ سکون اسے اس سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے حاصل ہو گیا۔ گویا یہی اس کی منزل تھی۔ جو پور کی شہزادی ایک بہت دھندلا سا خواب تھا جو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ ایودھیا کی برہمن زادی اس کی روح اور دل کے اس تہہ خانے میں موجود تھی جس کے دوازے متقل کر کے اس کی کنجی اس نے خودندی میں پھینک دی۔

کیونکہ یاد زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہے۔

شنیدل اب اس کی بیوی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شودر ہونے میں کیا قباحۃ ہے۔ اس نے شنیدل کا نام آمنہ بی بی رکھا اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بانس کے جھونپڑے میں رہنے لگا۔

گزر اوقات کے لئے وہ کھیتی کرتا، اس کے کھیت میں دھان بوئے تھے اور اس کے جھونپڑے کے سامنے چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سنگھاڑے تھے اور کنول کے پھول اور جس میں روپلے پروں والی طنخیں تیرتی تھیں۔ جب آسمان پر اندر کی کمان نکلتی اور جوبی کے پھولوں پر بھونرا گنگنا تا وہ اپنے چھوٹے سے مکان کے برآمدے میں اپنے ساتھی گیت کاروں کے ساتھ بیٹھ کر اندلہری بجاتا۔ آمنہ اپنے لوچدار جسم پر تیز جامنی یا تیز سبز رنگ کی ساری لپینے پیتل کا گھڑا کمر پر سنبھالے تالاب کی اور جاتی نظر آتی۔

دن گزرتے گئے۔ دکھی بنگال نے، جس کے سلاطین ہمیشہ آپس میں کٹتے مرتے رہتے تھے، اب چند دنوں سے چین کا سانس لیا تھا۔ گوڑ کے تحت پر سید السادات علاء الدین ابوالمظفر حسین شاہ براجمان تھا۔ وسط ایشیا کے شہر ترند سے آئے ہوئے خاندان کا یہ غریب سید، جو سلطان ابن سلطان نہیں تھا اور جس کی شرافت اور قابلیت کی بنا پر عوام نے اسے خود منتخب کر کے اپنا بادشاہ بنایا تھا، اس کے عہد میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں۔ قتل و غارت کے بازار سرد ہو چکے تھے، ایک نئی زبان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔ بنگال کا یہ عظیم ترین مسلمان بادشاہ جس کے دور میں ویاپتی ٹھا کر اور مہار پر بھوچیتن سری کرشن کے عشق کے سریلے نغمے الاپ رہے تھے۔ راج محل کی پیار یوں سے پتھر بہا بہا ک گوڑ لائے جا رہے تھے اور نئی

نئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کی جا رہی تھیں۔ دربار میں علمی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں۔

کئی برس بیت گئے۔ کمال کے بچے جوان ہو چکے تھے، اس نے اپنے لڑکوں کے نام جمال اور جلال رکھے تھے، اس کی لڑکی کا نام سکینہ بی بی تھا، وہ اپنی اولاد کی صورت دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کے دونوں لڑکے ماہر تعمیرات تھے اور گوڑ اور سنار گاؤں میں عمارتیں بنوانے میں مصروف تھے۔ گوڑ کی چھوٹا سونا مسجد اور گن منت مسجد کا نقشہ جمال نے تیار کیا تھا۔ جمال گوڑ کا میر عمارت تھا۔ بڑا سونا مسجد کی سبز اور نیلی اور سفید اور زرد اور نارنجی پکی کاری میں بنگال کے سارے رنگ سمیٹ لیے گئے۔ ان کے ستون، ان کی محرابیں اور گنبد خالص دیسی تھے۔ یہ عمارتیں بھی پال اور مین عہد کی تعمیرات کی روایت میں شامل ہو گئیں۔ یہ بنگالی طرز تعمیر تھا۔ کمال کی لڑکی کی شادی بروہان کے مرشد زادوں کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے آمنہ کو اپنے ہاتھوں سے اسی تالاب کے کنارے دفن کیا تھا۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اب بھی وہ دن بھر برآمدے میں بیٹھا مرشدی اور معرفتی نغمے لکھتا اور گاتا، اس کے بیٹے گوڑ سے اپنے گاؤں واپس آتے اور اسے ملک کی سیاست کی خبریں سنایا کرتے، لیکن یہ خبریں اب ایس بالکل کسی دوسرے سیارے کی باتیں معلوم ہوتیں۔

کیونکہ بغداد کا ابوالمنصور مال الدین، جو پچاس سال ادھر عراق سے ہند آیا تھا، کوئی دوسرا انسان تھا۔ یہ کوئی مختلف انسان تھا جو بالوں کی لٹیں اور داڑھی بڑھائے چار خانہ تہہ باندھے ہاتھ میں ایک تارہ لئے ویشنو نغمہ اپ رہا تھا۔

ابوالمصور مال الدین بنگالے کا باشندہ تھا۔ بنگالی تھا، چنانچہ جب دور پنچم دلی میں ایک بار پھر سلطنت بدلی اور سلطان ابراہیم ہارا اور ترچھی آنکھوں والا منگول ظہیر الدین جیتا اور دنیا کا بوجھ سہارنے والی گائے نے اپنا سینگ تبدیل کیا تو اپنے بڑے لڑے جمال سے یہ سارے سنسنی خیز واقعات سن کر اس نے ذرا سی بھی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس کے بیٹے جلال نے اس سے کہا کہ وہ مغلوں کے لئے عمارتیں بنانے دلی جا رہا ہے تب بھی وہ خاموش رہا، اس نے ساری دنیا گھوم کر اپنی منزل تلاش کی تھی۔ اب دنیا اس کے بیٹوں کے سامنے پھیلی تھی، وہ بھی اپنی منزلیں خود تلاش کریں گے۔

مگر اب امن کے دن ختم ہونے والے تھے۔ بنگالے پر سید علاء الدین حسین شاہ کے بیٹے ناصر الدین نصرت شاہ کی حکومت تھی۔ مغلوں سے ہارنے کے بعد دلی کے افغان، جو کل حکمرانی کرتے تھے، آج پناہ گزینوں کی حیثیت سے گوڑ اور لکھنؤ کی گلی کوچوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مرتبہ جونپور کے حکمران انہی افغانوں سے مار کھا کے یہاں پناہ لینے آئے تھے۔ یہ افغان مال کو ہر جگہ ملتے اور گوڑ کے بازاروں میں راستہ چلتے چلتے لوگوں کو روک روک کر انہیں اپنی گزشتہ عظمت اور جاہ و جلال کے قصے سناتے۔ گوڑ کی گلیوں ہی میں مال نے ایک روز ایک پرنگالی دیکھا جو اکڑتا ہوا ایک سمت کو چلا جا رہا تھا۔ مال اپنی اٹھی کے سہارے کھڑا چنبھے سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے برسوں پہلے کا وہ اندھا برہمن یاد آیا جو ان سے ہارنے کے بعد کوچین سے کاشی آیا تھا۔ اس وقت پرنگالیوں کا جہازی بیڑا چاٹکام کی بندرگاہ میں موجود تھا اور وہ لوگ گوڑ میں بھی

دندنا رہے تھے۔

وقت تیزی سے نکلتا گیا۔ گوڑ کے سیاسی حالات بگڑنا شروع ہوئے۔ اب وہاں ناصر الدین کا بھائی غیاث الدین راج گدی پر بیٹھا تھا۔

ایک روز مال نے خبر سنی کہ بہار کے شیر خان نے غیاث الدین سے بنگالے کا تخت چھین لیا، پھر معلوم ہوا کہ دلی کے شہنشاہ ہمایوں اور شیر خان میں گھمسان کا رن پڑا اور ایک روز چند بادلوں نے آ کر مال کو بتایا کہ مغل بادشاہ دھوم مچاتا گوڑ میں داخل ہو چکا ہے اور اسی کے نام کا سکہ نکال میں گھڑا جا رہا ہے۔ دور دراز ترکستان سے آئے ہوئے تاتاری پر بنگال نے ایسا جادو کر دیا کہ اس نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھا ہے، یہ سب خبریں مال کو بڑی عجیب سمجھنے کی معلوم ہوئیں۔ بادشاہتیں بدلتی ہیں تو جگہوں اور انسانوں کے نام بھی بدل دیے جاتے ہیں۔ انسان اپنے اقتدار کا سکہ جمانے کا کس قدر شوقین ہے؟ ہرے بھرے بنگال کی بد امنی بڑھتی گئی۔ شیر خان پھر گر جتا ہوا آیا اور دلی کے مغل کو واپس دلی بھگا کر دوبارہ بنگال پر قابض ہو گیا۔ ملک سہا ہوا تھا۔ ہمایوں اور شیر شاہ میں بڑی خوریز جنگ ہوئی۔ اسی لڑائی میں جمال گوڑ کی گلیوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ایک رات شیر خان کے سپاہیوں نے اس گاؤں کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں مال کی جھونپڑی تھی۔ سپاہی لوٹ مار مچاتے اس کے گھر تک آن پہنچے، باہر نکلے، وہ چلا رہے تھے۔ تم سب سے بڑے فساد ہی ہو، تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، تمہارے پیٹھے دلی جا کر مغلوں سے مل گئے ہیں۔ تم غدار ہو، تم کو تو ہم جان سے مار دیں گے، تم کو گوڑ لے جا کر قید خانے میں ڈال دیں گے۔ ارے وہ گیت بنانے والا ابو منصور یہیں رہتا ہے نا۔

باہر نکل اوبڈھے، اندر کس سازش میں لگا ہے۔ مال کانپتے ہوئے ہاتھوں میں چراغ اٹھا کر دروازے تک آیا اور حیرت سے سپاہی کو دیکھنے لگا، وہ نل مچاتے اس کی اور بڑھے، مال مضبوطی سے دروازے کی چوکھٹ تھام کر ان کے سامنے ڈٹ گیا، وہ بہت بوڑھا پھونس ہو چکا تھا اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا مگر وہ جم کر کھڑا رہا۔ اس کے پاس اپنی مدافعت کے لئے تلوار بھی نہیں تھی، وہ گوڑے جلیا جائے گا؟ اس نے کس کا تصور کیا ہے؟ اسے افغانوں اور مغلوں کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے امن سے رہنے دیا جائے۔ یہ اس کا ملک ہے۔ اس کا وطن! یہاں اس کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی بی بی کی قبر ہے، یہاں اس کے دھان کے ہرے کھیت ہیں، اس نے اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ اس نے گیت بنائے ہیں، وہ یہیں رہے گا۔ اسے غدار کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہ دارالحرب نہیں ہے دارالسلام ہے۔ اس لمحے اسے انکشاف ہوا دارالحرب اور دارالسلام میں کوئی فرق نہیں، صرف رویے کا فرق ہے، لڑائیاں دو مند ہوں کے درمیان نہیں ہوتیں دوسیا سی طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔

سمہرام کا شیر خاں اور دلی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔ دارالسلام بھی دارالحرب بن سکتا ہے اگر اس میں شر کا وجود ہو۔

شیر خاں کی فوج کے اجڈ سپاہی یہ سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے زور سے مال کو دھکا دے کر گرایا اور بلڑ مچاتے آگے بڑھ گئے۔

مال اپنے گھر کی دہلیز پر اوندھے منہ گرا، اس کے منہ سے خون کی ندی بہہ گئی

اور چند گھنٹے تک سکتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح پڑا پڑا خاموشی سے ختم ہو گیا۔
ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے، پرانا نظام بدل چکا ہے۔ گوڑ اور لکھنؤ کی
اور پٹنہ اب خواب و خیال ہوئے۔ ترکوں کی دلی کا بھی خاتمہ ہوا۔ دلی اب مغلوں
کی ہے۔

لیکن وہ کسان موجود ہے، وہ جو گھٹنوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بوریوں
ہے، وہ جو بیلوں کی جوڑی ہنکاتا میگھنا کے کنارے کنارے جا رہا ہے، وہ بھاگرتی
کی سطح پر کشتی کھیتا اور گیت گاتا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی سمت رواں ہے،
وہ مرشدوں اور بھگتوں کے قدموں میں بیٹھا کیرتن اور معرفتی نغمے الاپ رہا ہے۔

بنگال کا کسان ابو المنصور مال الدین زندہ ہے اور زندہ رہے گا، وہ تو اپنے
چھوٹے سے نوکے میں بیٹھا پدما کی تندرو موجوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ نوکا پدما کی
لہروں پر ڈولتا جا رہا ہے۔ آگے جدھر گھپ اندھیرا ہے اور فضاؤں میں طوفان لرز
رہے ہیں اور تاریک دھاراؤں میں مہیب نما کے منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور ہوائیں
بہت تیز ہیں مگر پدما کے اس بوڑھے فاقہ زدہ ملاح کی کشتی بڑے مزے سے عناصر
کا مقابلہ کر رہی ہے کیونکہ عناصر کی بے رحمی اور موت اور خطروں سے اس کی پرانی
دوستی ہے۔

آخر جب ہوا کا زور زیادہ بڑھا اور کشتی بار بار ڈولنے لگی تو سرل نے لالین اٹھا
کر گھبراہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”پیٹر ہم طوفان میں تو نہیں پھنس
گئے؟“ اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

”نہیں، یہ تو معمولی سی ہوا ہے، پریشان مت ہو۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”مگر

ذرا اس کا لے سؤر سے کہو کہ اپنا بھونڈا گانا اپنے کے بجائے پتوار کی طرف زیادہ
توجہ کرے ورنہ اس طرح ہم گھاٹ پر صبح تک نہ پہنچ پائیں گے۔“

”سو رہا ہے کیا بوڑھا کتا۔“ سرل نے چٹائی کی چھت پر جھک کر دوسری اور
جھانکتے ہوئے کہا۔ مانجھی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور صبر کے ساتھ پتوار
چلانے میں مصروف رہا۔ ”یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں۔ جب تک ہنٹر نہ لگاؤ ان میں
چستی نہیں آتی۔“ پیٹر نے کہا۔ سرل نے دور سے اپنی نفرتی موٹھ کی چھتری بڑھا کر
بوڑھے کی کمر میں چھوئی۔

”او آؤ۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”ابو المونشور۔۔۔ صاحب۔“

”ابو المونشور۔۔۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے میں تمہاری کھال نہ ادھیڑ
دوں تو تم ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ۔۔۔ سمجھے۔“

”جی صاحب۔“ وہ پھر پتوار پر جھک گیا، نوکا چلا کیا۔ کنارے پر دونوں طرف
انناس اور کیلے کے جھنڈ تھے۔ دور گاؤں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ سرل نے
نو کے کی چھت کے اندر جھانکا جہاں ابو المونشور کا مٹی کا دیا اور چٹائی اور جاء نماز اور
دو کانسی کے برتن رکھے تھے۔ دیوار پر ناریل آویزاں تھا، یہ اس بوڑھے پھونس
سفید داڑھی والے کی ساری کائنات تھی جو پدماکے طوفانی پانیوں پر ڈولتی تھی۔ سرل
کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین دلانا چاہا کہ یہ سب صحیح
ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں
اس نو کے میں لا بٹھایا ہے۔ اس عجیب و غریب ملک میں جسے ”بنگال“ کہتے

ہیں جسے ”انڈیا“ کہتے ہیں۔

لالٹین اٹھا کر اس نے چاروں اور نظر ڈالی۔ روشنی سے لہروں پر راستہ سامنے
گیا۔ برابر سے ایک بڑا شمیان گزر گیا۔ چاند بہت دور بید کے درختوں کے پیچھے
سے آہستہ آہستہ کاہلی کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔

۲۶

جب سرل ہاورڈ ایشلے نے کوئز کالج کیمبرج سے بی۔ اے کیا اس وقت اس کی
عمر صرف بیس سال کی تھی، اس کا باپ ایک بہت مفلوک الحال پادری تھا اور سرل
بڑی مشکلوں سے اپنے قصبے کے زمیندار کی مدد حاصل کر کے کیمبرج تک پہنچ پایا
تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن آ کر اس نے ڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔
یہاں پڑوس میں فلیٹ اسٹریٹ تھی جس کے قہوہ خانوں میں لکھنے والے اور اخبار
نویس جمع ہو کر دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے۔ اکثر سرل بھی اپنے ساتھیوں کے
ساتھ ان کی محفلوں میں شریک ہوتا یہیں ایک روز ایک شراب خانے میں سرل کی
ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا
ہوا تھا، وہ اسے موٹی آواز میں تفصیل سے بتاتا رہا کہ بنگال میں اسے نیل کی
کاشت میں کتنے ہزار پاؤنڈ کا نفع ہوا۔ نیو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ ان
کے امراء کتنے دولت مند ہیں۔ کلکتہ کس قدر دلچسپ شہر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے
ہو؟ ہندوستان چلو۔ تم سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو، اگر عقل سے کام لیا تو چار روز

میں وہاں سونے کے محل کھڑے کر لو گے۔۔۔ کیا کہا؟ تم شاعری کرنا چاہتے ہو۔
ڈرامے لکھا کرو گے؟ وکالت بڑا نو بل پیشہ ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔ چند
روز بعد پیٹر اسے سٹی میں اپنے چچا کے پاس لے گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک
ڈائریکٹر تھا۔

سرل کو کلکتے میں ملازمت مل گئی۔ ایک روز وہ ٹل بری سے ایک انڈیا میں پر
بیٹھا اور ڈوور کی سفید چٹائیں اس کی نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوئیں تو اسے
احساس ہوا کہ وہ انگلستان چھوڑ رہا ہے۔ انگلستان جہاں کینٹ میں اس کا قصبہ
ہے اور جہاں یکم بہتا ہے اور جہاں گولڈ اسمتھ اور کوپر اور گرے اور برک نے جنم
لیا تھا، جہاں ہوگا رتھ اور گیفر برو اور رینالڈز نے تصویریں بنائی تھیں۔ ٹرنز کے
سورج کی روشنی میں ڈوبے ہوئے مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے اور
لندن کی گلیوں میں سودا بیچنے والیوں کی آوازیں اور قصبہ بانی گرجا گھروں کے
گھنٹوں کی صدائیں اور بلند و بالا جارحین محلات میں سے بلند ہونے والی چیمبر
موسیقی مدھم ہوئی۔ انگلستان جہاں سکون تھا اور مکمل حسن۔ بنگال اور کینیڈا اور جنوبی
امریکہ سے آئی ہوئی دولت نے ملک کو مالا مال کر دیا تھا۔ نت نئے فیشن ایجاد ہو
رہے تھے، اونچے اونچے قصر تعمیر کیے جا رہے تھے، باغات سجائے گئے تھے، غریب
امیر ہو چکے تھے، امیر ہیرے موتی رولتے تھے، ہر طرف صرف ایک چرچا تھا۔
دولت۔ دولت۔ سرل جو ادب کا اسکا لرتھا، جسے دولت سے غرض نہیں تھی، وہ بھی
اسی دھن میں جا رہا تھا، وہ مفلس طالب علم بنگال پہنچ کر امیر ہو جائے گا۔ لندن
میں اس کا بھی ایک محل ہوگا، یا کون جانے شاید وہ کسی وحشی ہندوستانی سردار سے

جنگ کرتا ہوا مارا جائے اور مدراس یا میسور میں اس کی گمنام قبر بنے۔

اس نے ایک پھریری لی اور ڈیک سے ہٹ آیا۔ سمندر بہت بھیاٹک تھا۔ دنیا میں اس وقت کیا کیا ہو رہا تھا اور وہ دراصل خود کتنا حقیر تھا۔ اس جہاز پر کیسے کیسے لوگ سوار تھے اور کیسے کیسے ارادے اور تمنائیں لیے اس اندھیرے میں ایک منزل کی سمت رواں تھے۔ ان سب کا حشر کیا ہوگا؟ کمپنی کے تاجر، کلکتہ کنسل کے وہ ممبر جو رخصت کے بعد واپس جا رہے تھے، مدراس کا چیف جسٹس، اعلیٰ خاندانوں کی چند بن بیاباں لڑکیاں جو حسب معمول اس امید میں ہندوستان جا رہی تھیں کہ وہاں ان کی شادیاں ہو جائیں گی، جہاز کا کپتان حیدر علی کے معرکے کے قصے سن رہا تھا، پٹنے اور ڈھاکے کے نیل کے تاجر ہر وقت اپنی کاروباری باتوں میں مگن رہتے اور سب کے سب متواتر ڈیرا پیتے۔ کوئٹہ کالج کیمرج کے خاموش کواڈرینگل سے نکلنے کے بعد سرل نے دیکھا دنیا دراصل یہ تھی۔

پھر جہاز جنوبی افریقہ کے ساحلوں سے پاس سے گزرتا ہندوستان کے قریب تر ہو گیا۔ اس امید تک پہنچتے پہنچتے سرل نے اندازہ لگایا کہ ایک بن بیاباں اعلیٰ خاندان کی لڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے، وہ ان سب میں معمولی شکل کی تھی اور کسی فوجی کپتان سے شادی کرنے جا رہی تھی جو فورٹ جارج میں تعینات تھا، مگر وہ سرل کی صورت پر تبصرہ گئی، پھر اس نے جہاز کے کپتان اور دوسرے ساتھیوں سے سرل کے مافی حالات کا پتا لگایا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ ابھی بہت غریب ہے اور کمپنی میں فیکٹر کی حیثیت سے ملازم ہو کر جا رہا ہے اور لڑکیوں کے بجائے فی الحال کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کے بعد مس ازابیل نے شورے کے ایک

مولے تاجر سے عشق لڑانا شروع کر دیا۔ جہاز کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب نہ ہوتا تو مہینوں کا سفر اجیرن ہو جاتا۔

دنیا بدلتی جا رہی تھی، وہ سکون، جس میں ڈوبا ہوا انگلستان وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آ رہا تھا، زیادہ دن اس حالت میں نہیں رہے گا۔ نئے نئے کارخانوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے اس کے وطن کے پھولوں کی رنگت بدل دی تھی۔

پھول، بہاریں، پیرس، ہائے پیرس، وائے۔۔۔ سرل نے ایک گہری سانس لی۔ پیرس بھی تو ابھی ابھی خون میں نہایا تھا۔ انقلاب۔۔۔؟

روس۔ والیٹر۔ آزادی۔؟

امریکہ کی جنگ۔ آزادی۔؟

جہاز اب ڈنفا سکر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ مشرق تھا۔ حبشی غلاموں کا وطن اور مشرق سرل کا منتظر تھا۔ چین اور ہندوستان اور ایران اور مصر سب چلا کر اسے پکار رہے تھے، او بھائی سرل آؤ ہم نے تمہارے سوا گت کے لیے ساری تیاریاں کر رکھی ہیں۔ انجیلیں لے کر اور بندوقیں اور تلواریں لے کر آؤ اور آ کر ہماری کھال اتار لو۔ کانپورا اور ڈھاکہ کے پرانے پاپیوں نے اسے بتانا شروع کیا: سمجھ سے کام لو تو چند سال میں لکھ پتی بن جاؤ گے۔

”یہ سراج الدولہ کون تھا۔“ سرل نے پیٹر جیکسن نے پوچھا۔

”سراج الدولہ“ پیٹر نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”میں تم کو اس کا سارا واقعہ تفصیل سے سناؤں گا۔ میں قاسم بازار میں رہ چکا ہوں، بڑا سخت بیہودہ تھا۔ ظالم، مکار، مگر ہمارے وفادار دوست بھی ہیں۔ مثلاً او وہ کامو جو وہ نواب۔

”وہ کون ہے؟“

پیٹر جیکسن نے سرل کو فیض آباد اور لکھنؤ کی الف لیوی داستانیں سنانا شروع کیں، پھر میسور والوں کا اور ارکاٹ کا تذکرہ کیا۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے سرل پچھلے دوسو سال کے واقعات سے واقف اور ہندوستان کی پوری تاریخ کا ماہر ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی برہمیت۔ ایک سرخ زبان والی مورتی کو پوجتے ہیں۔ بیواؤں کو آگ میں زندہ جلاتے ہیں۔ ننگے پیر گھومتے ہیں۔ گائے اور بندر اور سانپ کو خدا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مظالم۔ عورتوں کو پردے میں گھونٹ کر رکھتے ہیں۔ پندرہ پندرہ شادیاں کرتے ہیں۔ غرضیکہ پیٹر جیکسن نے جو کچھ اسے بتایا وہ خاصا پریشان کن تھا مگر بہر حال حقائق سے کون چشم پوشی کر سکتا ہے اور یہ سب تاریخی حقائق تھے جن پر پیٹر جیکسن نے روشنی ڈالی تھی۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ نیو بلحاظ نسل کمتر تھے۔ ایشیائی سارے اور ہندوستانی بالخصوص گھٹیا درجے کے انسان تھے۔ عثمانی ترکوں سے بھی بدتر کیونکہ عثمانی ترک کم از کم سفید فام تو تھے۔ ”نیو چونکہ نسلاً گھٹیا ہیں۔ لہذا ان کے دماغ بھی بے حد پست ہیں۔ بنگال میں ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی ہے جو کھود کھود کر جانے کس زمانے کی بکواس نکال رہی ہے۔ سنسکرت اور فلانا اور ڈھاکا۔ مردہ زبانیں جن میں جادوؤں کے نسخے لکھے ہیں۔ اس پر ہمارے چند محققوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہندوستانی بھی ایک زمانے میں مہذب تھے۔“ پیٹر نے بات ختم کی۔

سامنے بمبئی کا ساحل نظر آ رہا تھا۔

ہندوستان۔۔۔!!

جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ مسافر اتر کر ساحل پر آ گئے۔ ڈیڑھ سو سال قبل تک سورت کی بندرگاہ پر مغل کسٹم افسر یورپیوں کا نا طبقہ بند کر دیا کرتے تھے مگر اب اپنی حکومت تھی۔ سرل کے سارے ساتھی ٹھاٹھ سے سیٹی بجاتے جہاز سے اترے اور بہت سے سیاہ فام انسانوں نے آ کر ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دوڑ دوڑ کر ان کا اسباب اتارنے میں مشغول ہو گئے۔ پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی پاکلی پیٹر کے استقبال کے لیے آئی ہوئی تھی۔ سرل اس کے ساتھ پاکلی میں بیٹھ کر مالا بارہل کی طرف چلا۔

سرلک کے دونوں طرف دولت مند پارسیوں کے مکان تھے، جن کی عورتیں لکڑی کی بالکنیوں میں سے جھانک رہی تھیں اور نیچے بچے کھیل رہے تھے۔ مضبوط جسموں والی مراٹھی عورتیں تیز رنگوں کی ساریاں پہنے ساحل کی ریت پر چل رہی تھیں۔ مالا بارہل پر پھول کھلے تھے۔ بارش ابھی ہو کر تھمی تھی۔ انگریزوں کی کوٹھیوں کی کچھریل کی چھتوں پر رنگ برنگے پھولوں کی بلیں کھلی تھیں اور کیلے اور ناریل کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پیٹر اور سرل کا میزبان پھاٹک تک ان کا استقبال کرنے کے آیا۔ پھر انہوں نے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں بیٹھ کر چاء پی۔ گوانیز خانساں جو اپنے آپ کو پرتگالی کہتا تھا لپک لپک کر مہمانوں کی خاطر میں کرتا رہا، پھر بے ہنگم سا سایہ پہنے میری باہر آئی جو صاحب خانہ کے بچوں کی کھلائی تھی۔

میری پہلی یوریشین لڑکی تھی جو سرل نے دیکھی۔ سرل اپنے کمرے کے درتے میں کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ کو نے میں حبشی لڑکا لپا جھپ اس کے

جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ یہ لڑکا دوسرے غلاموں کے ساتھ ٹڈ غاسکر سے درآمد کیا گیا تھا اور جتنی دیر وہ کمرے میں رہا۔ سرل کو بڑی وحشت محسوس ہوتی رہی مگر بہر حال یہ مشرق تھا۔ شام کو وہ سب ہوا خوری کے لیے نکلے۔ ارد شیر، صاحب خانہ کے پارسی کوچمین نے جھک کر مودبانہ لہجے میں پوچھا: ”کس طرف؟“

”چرچ گیٹ چلو“ پھر میزبان نے سرل سے کہا، ”نوجوان لڑکے ہمارا شہر تمہارے شاندار کلکتے کا تو مقابلہ نہیں کر سکتا جہاں تم جا رہے ہو مگر بمبئی کی بھی کیا بات ہے۔“ اپالو سے لے کر چرچ گیٹ تک گھاس کے سرسبز قطعے تھے اور ناریل کے گھنے جھرمٹوں کے درمیان پانی کی جھیلیں جگمگا رہی تھیں۔ دور کو ابا کے لائٹ ہاؤس میں روشنی چمک رہی تھی۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی، اس رات میزبان کے یہاں کھانے پر سرل کو دو پارسیوں سے ملوایا گیا۔ یہ دونوں جہاز سازی کے کارخانے کے مالک تھے اور فر فر انگریزی بول رہے تھے۔ کس قدر بھانت بھانت کے باشندے اس ملک میں ہیں۔ سرل نے حیرت سے پوچھا۔

چند روز بعد وہ پیٹر جیکسن کے ساتھ فیکٹری دیکھنے کے لیے سورت گیا۔ مغربی گھاٹ کا خوبصورت علاقہ اور کلیان اور ناسک کا حسن اور سرسبز پہاڑی راستے جن پر نیلا کبرہ چھایا ہوتا اور تاپتی کے کنارے۔ مہا کجرات دلش کے سبزہ زاروں پر سورت بسا ہوا تھا۔ سورت۔۔۔ مغلوں کی بندرگاہ سو سال پہلے جس کی آبادی لندن اور پیرس سے زیادہ تھی اور جس کے باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور جہاں رنگین چنریاں اوڑھے لڑکیاں لکشمی کے آگے دیے جلانے کے بعد گر بانا چتی

تھیں۔

بمبئی لوٹ کر آنے کے بعد سرل دوسرے جہاز کا منتظر رہا جو اسے مدراس اور کلکتے لے جائے۔ پیٹر جنکسن فی الحال یہیں ٹھہر رہا تھا، اب سرل کو تنہا سفر کرنا تھا۔ وہ ہندوستان کا ایک حد تک عادی ہو چکا تھا۔

جہاز نے لنکر اٹھایا اور کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اب نئی دنیا میں اس کی نظروں کے سامنے جھلسا رہی تھیں۔ ناریل کے جھنڈوں میں چھپی ہوئی مسجدیں اور مندر۔ برہمنوں اور مسلمانوں کی آبادیاں۔ سنہرا شہر گوا ولندیزیوں کا سرنگا پٹم جس کی عمارتوں کو دیکھ کر اسے ایک لمحے کے لیے ایمسٹرڈم کی یاد آئی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ یورپ۔۔۔ یورپ۔۔۔ کس قدر دور رہ گیا تھا۔ پانڈی چڑی میں کئی فرانسیسی جہاز پر آئے، وہ دوسرے جہاز سے فرانس جا رہے تھے، ان میں تین راہبات تھیں اور ایک سوریون کا طالب علم۔۔۔ وہ فوراً سرل سے گھل مل گیا۔ وہ ماں باپ سے ملنے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا، وہ جلدی جلدی کندھے اچکا کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ پیرس کی باتیں۔ یونیورسٹی کی اور انقلاب کی باتیں۔ آزادی، مساوات اور اخوت زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ فرانس زندہ باد، وہ اسی طرح جوش سے بچوں کی طرح نعرے لگاتا اتر کر کشتی میں بیٹھ گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جانے اس کا کیا نام تھا اور اس میدان رستاخیز میں اس کا کیا حشر ہوگا، ہر طرف خونریزی تھی اور جنگیں۔ بنگال میں جنوب میں، یورپ میں نیپولین نے اودھم مچا رکھی تھی۔ سارا یورپ جل رہا ہے اور کئی مرتبہ اور جلے گا اور اس ہنگامے میں کیمرج اور سوریون کے طالب علم آندھی کے پتوں کی

طرح کھو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

اور وہ، سرل ہاورڈ ایشلے، خلیج بنگال کے پانیوں پر محو سفر ہے اور ہر طرف موت و انت نکو سے کھڑی ہے۔ سامنے میسوری ہیں اور مرہٹے۔ شمال میں چڑھی ہوئی داڑھیوں اور گھیردار شلواریوں والے افغان اور سکھ تلواریں چکا رہے ہیں اور چاروں کھونٹ وحشت ہے اور تباہی اور دلی میں دکھ ہے۔ فیض آباد میں دکھ ہے۔ مرشد آباد میں دکھ ہے، یہ سب سرل کو نہیں معلوم، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ دلی میں شاہ عالمگیر ثانی اس وقت چند آبائی کا قرض دیکھنے کے بعد استادان رس کان سے خیال چند رکونس ہلمپت میں سننے میں مصروف ہیں۔ پھر مدراس نظر آیا۔ فورٹ سینٹ جارج۔ اور شہر کے مکانات جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بندرگاہ میں ملیح پرسکون شکلوں والے ہندو سوداگر جہاز پر آئے۔ دو باضوں نے اسے گھیر لیا۔۔۔ سب مصر تھے کہ وہ انہیں اپنا گماشتہ بنائے۔ لندن اور بمبئی میں دوستوں نے مدراس کے گورنر اور اعلیٰ طبقے کے افراد سے ملنے کے لئے جو تعارفی خط دے دیے تھے ان کو جیب میں ٹٹولنے کے بعد ڈراگھبر اہٹ کے ساتھ سرل جہاز سے اترا۔ یہاں پیٹر جیکسن اس کی رہنمائی کے لیے موجود نہ تھا۔

مدراس میں جہاز پانچ چھ دن ٹھہرا۔ اس نے والا جاہ نواب ارکاٹ کا محل دیکھا۔ مندروں اور قلعوں کی سیر کی۔ سینٹ طامس روڈ کی انگریزی کی دکانوں پر نظر ڈالی، ایک روز وہ ٹہلتا ٹہلتا پوریشین آبادی کی سمت نکل گیا۔

یہاں اسے ایک مکان کی سیڑھیوں پر ایک لڑکی کھڑی نظر آئی۔ دوغلی نسل کی حسین لڑکی۔۔۔ وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرائی اور اندر چلی گئی۔ ایک سیاہ فام

عورت گود میں بچہ اٹھائے باہر نکلی اور دہلیز پر بیٹھ کر دال چال بینے لگی۔ سرل کو دیکھ کر تین چار بچے باہر آ گئے، پھر ان کا باپ برآمد ہوا جو ایک بے حد مفلس یوریشین معلوم ہوتا تھا۔ سرل ان کو دیکھ کر پچھلی سے دیکھتا رہا۔ ”اندراؤ گے؟“ ایک بچے نے پوچھا، وہ سب متحیر تھے کہ انگریز صاحب ان کے محلے کی طرف کیسے آنے لگا۔ سرل کی قوم انگلستان میں طبقاتی کاسٹ سسٹم کی شدت سے قائل تھی۔ ہند میں انہوں نے سیاہ اور سفید کی نسلی تفریق کی بنیاد ڈالی تھی۔ مدراس بلیک ٹاؤن، یوریشین ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن میں بنا ہوا تھا۔ سرل نے کیمرج میں رہ کر اٹھارویں صدی کی لبرل ازم کا بڑا پرچار کیا تھا مگر کالے اور گورے کی تقسیم اس کی سمجھ میں آتی تھی، اب اس نے دیکھا کہ ہند میں رہنے والے گورے کالوں کی چھوٹ لگ جانے کے بعد اپنے درجے سے گر چکے تھے۔ یہ یوریشین وائٹ ٹاؤن کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے، وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہ لڑکی اسے دوبارہ نظر آئی، وہ اپنے گھر کی باڑ پھلانگ کر آگے جا رہی تھی۔ ایک بار اس نے سرل کو پٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ بخدا یہ یوریشین لڑکی بے حد حسین تھی۔ ان بھورے بالوں والی سفید فام انگریز امیرزادیوں سے کہیں زیادہ دلش جو گورنمنٹ ہاؤس میں شام کو پولو کھانا چتی تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں مرہٹہ اور کجراتی اور مالا باری عورتوں کی ایسی تھی۔ سیاہ، اور باحیا اور رسیلی اور خوفزدہ سی۔ اسے یہ لڑکی بے حد اچھی لگی۔ ”ذرا بات سننا۔“ اس نے جلدی جلدی قدم بڑھا کر اسے جالیا۔ ”تم یہیں رہتی ہو؟“ اس نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

”ہاں، تم نے ابھی میرا مکان دیکھا تو ہے۔ تم کلکتے سے آئے ہو؟“

”نہیں، کلکتے جا رہا ہوں۔ لندن سے چلا تھا، یہاں بمبئی سے آ رہا ہوں۔“

”بہت سفر کرتے ہو۔“

”ہاں۔ اور ابھی بہت سفر کرنا ہے، تم یہاں کب سے رہتی ہو؟“

”ہمیشہ سے۔“

”ہمیشہ سے۔“

”مگر تم تو عیسائی ہو۔“

”ہاں۔ کیا ہندوستانی عیسائی نہیں ہو سکتے؟“ پھر وہ ذرا ٹھٹھکی۔ ”میرا دادا

انگریز تھا۔ بالکل تمہاری طرح کا، میری ماں ہندوستانی ہے۔“

وہ گڑبڑا گیا۔ پیٹر جیکسن نے اسے جہاز پر نصیحت کی تھی کہ یوریشین قوم سے میل جول بالکل نہ بڑھانا۔ پچھلی صدی میں ہمارے ہم وطنوں نے یہاں آن کر کالی عورتوں سے اتنی شادیاں کیں اور تعلقات قائم کیے کہ لے کے پوری نسل کو سیاہ فام بنا دیا۔ تمہارا باپ زندہ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ سرل نے پوچھا۔

”وہ کیا بیٹھا ہے سیڑھیوں پر، تم نے دیکھا نہیں۔ شراب کی دکان کرتا ہے۔“

”آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔“ سرل نے ہمت کر کے ایک بیچ کی طرف اشارہ

کیا۔

لڑکی ذرا جھجکی اور پھر سر پر اپنا سیاہ جالی کا رومال ٹھیک کر کے بیچ کی طرف بڑھی جو سڑک کے کنارے پڑی تھی، یہ راستہ گرجے کو جاتا تھا۔ اس کی کلائیوں میں سبک سی تسبیح لپی ہوئی تھی۔

”تم کیتھولک ہو؟ سرل نے ایسے تجسس سے پہلے کسی سے سوالات نہ کیے

تھے۔

”ہاں“

وہ بڑے باوقار انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

پھر دفعتاً جانے کیا ہوا کہ سرل بغیر جانے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اسے مخاطب کر کے بولا: ”تم۔ تم مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔ میرے ساتھ کلکتے چلو۔“

لڑکی نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“

”میرا باپ مجھے مار نہیں ڈالے گا، تم کیتھولک نہیں ہو اور اونچے طبقے کے انگریز ہو اور آج کے بعد شاید تم مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔ تمہاری طرح کے بہت سے سیاح مدراس آتے ہیں۔“ اس نے اداسی سے درخت کا پتہ توڑا۔

سرل کو احساس ہوا کہ وہ شدت سے اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔ ”سنو“ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”سنو“ مگر وہ پھر ہڑا گیا۔ اس نے اب تک اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا تھا۔

”مجھے ماریا ٹیریزا کہتے ہیں۔“

”ماریا ٹیریزا مجھے تم سے عشق ہے۔“

اس رات وہ گورنمنٹ ہاؤس کی بال میں جانے کی بجائے چپکے سے یوریشین

ناؤں بھاگ آیا اور اس کی اگلی رات اور اس کی اگلی رات۔ چوتھے روز صبح جہاز کلکتے کے لیے لنگر اٹھا رہا تھا۔

سفر کی تیاری کرتے وقت اسے معلوم ہوا کہ یہ کیا زبردست حماقت تھی، وہ اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اب تک اس نے ماریا سے شادی کے لیے کہا بھی نہیں تھا مگر وہ بیوقوف لڑکی خالص ہندوستانی عورتوں کی مانند شاید دل میں اسے اپنا دینا تصور کرنے لگی تھی، جب وہ اسے خدا حافظ کہنے گرجے کے باغ میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ وہ ایک گٹھڑی کپڑوں کی ہاتھ میں سنبھالے اس کے ہمراہ کلکتے چلنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اپنی ساری قابلیت اور شاعرانہ انداز بیان اور ڈرامے کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ماریا ٹیریزا کو یقین دلایا کہ ابھی اس کا ساتھ لے جانا ممکن نہیں۔ وہ جلدی ہی اسے بلوانے کیلئے کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمینہ محسوس کیا۔

اس چھوٹے سے جذباتی ایڈونچر کے بعد سرل پھر اپنی منزل مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ خلیج بنگال کی نیلگوں وسعت میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس لڑکی کو تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاز اب کلکتے کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ڈائمنڈ ہاربر میں داخل ہو کر جہاز نے لنگر ڈالا اور پائلٹ کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ مسافر عرش پر نکل آئے۔ سامنے بنگال کا ساحل تھا۔ پائلٹ کے ساتھ جہاز فلکاروانہ ہوا، وہاں مسافر اتر کر کشتیوں میں بیٹھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے ذاتی بجرے آئے ہوئے

تھے۔۔۔ سرل اس ہنگامے میں کسی کو نہیں جانتا تھا، وہ جلدی سے کود کر ایک کرائے کی کشتی میں بیٹھ گیا۔ مانجھیوں کی ایک پوری پلٹن نے چپو چلانے شروع کر دیے اور تھوڑی دیر بعد بندرگاہ کے شور و نفل سے نکل کر کشتی پر سکون کھلے پانیوں پر آ گئی۔ آس پاس مسافروں سے بھری دوسری کشتیاں چل رہی تھیں۔ پانی کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے۔ دور گھنے جنگلوں میں سے کبھی کبھی شیروں کے گر جنے کی آواز اور گیدڑوں کی صدائیں سنائی دی جاتی تھیں۔ کشتی میں مچھروں نے بھنبھانا شروع کر دیا تھا۔ کلکتہ ابھی بہت دور تھا۔ محلات کا شہر۔ سونے اور چاندی کی بستی۔ مشرق کا لندن۔ اب رات ہو رہی تھی۔ بنگالے کا سحر انگیز چاند پانی کی سطح پر کشتی کے ساتھ ساتھ تیرتا جاتا تھا۔ مانجھی اپنی زبان میں گارہے تھے۔ ان کی آواز سرل کو غیر معمولی طور پر سریلی معلوم ہوئی۔

پھر منظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔ کشتی گارڈن ریج پہنچ رہی تھی۔ ساحل پر دونوں طرف شاندار مکانات بنے تھے۔ دریا کے دائیں کنارے پر کلکتہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ کلکتہ جو اب دنیا کے بہترین شہروں میں شمار کیا جا رہا تھا، بالآخر اس کے سامنے موجود تھا۔ گھاٹ پر بنگالی بنے مسافروں کی گھات میں موجود تھے۔ اعلیٰ افسروں کو لینے کے لیے ان کے دوست احباب آئے ہوئے تھے۔ جن نوواردوں کے دوست یہاں موجود نہ تھے اپنا سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا کر پرہنگالی مسافر خانوں کا رخ کر رہے تھے۔ گھاٹ کے اس رنگارنگ مجمعے سے باہر نکل کر سرل بھی ایک پاکی میں بیٹھا اور شہر کی گنجان آبادی سے باہر نکل کر پاکی بردار بارک پور کی طرف بڑھنے لگے جہاں سرل کو فی الحال قیام کرنا تھا۔

بارک پور میں انگریزوں کے کنٹری ہاؤس تھے۔ ولندیزیوں کے سیرام پور اور فرانسیسیوں کے چندر نگر تک ان مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے آس پاس سرکاری عمارات تھیں۔ شان دار گورنمنٹ ہاؤس جہاں چند سال پہلے کارنوالس دھوم دھام سے براجمتا تھا اور اب جہاں مرجان شور فورٹ ولیم کا گورنر جنرل بننے والا تھا، پھر رائیٹرز بلڈنگ جس میں سرل کا دفتر تھا۔ چرچ کی عظیم الشان عمارت۔ آس پاس بلیک ٹاؤن تھا۔ جس میں ہندوستانی، پرتگالی، ارمینی، یوریشین اور مفلوک الحال یورپین بستے تھے۔

چورنگی روڈ پر کلاسیکل طرز کی عالی شان عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے ہال، ہیل پائے والے برآمدے، چوڑے زینے، جھلملیوں والے دروازے اور اونچے درتپے۔ دریا کے کنارے کنارے انگریز امراء کے گارڈن ہاؤس تھے، جن کے باغیچوں میں ہندو اور چینی مالی کام میں مصروف تھے۔ کوٹھیوں کے عقب میں شاگرد پیشے تھے۔ جہاں مرغیاں اور مٹھیں گھوم رہی تھیں۔ تالاب تھے جن میں واٹر کیلی کھلی تھی اور مچھلیاں پلی تھیں۔

چھ مہینے بعد سرل نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اب میں سیٹل ہو چکا ہوں اور خدا کی عنایات کا شکر گزار ہوں، میرا بنگالی گماشتہ اشوتوش ڈے جو فرالے سے انگریزی بولتا ہے میرے سارے معاملات کا نگران ہے۔ میرے عہدے میں بھی ترقی ہونے والی ہے اور میں مفصل میں نیل کی تجارت شروع کر رہا ہوں، میں نے ایک مسلمان منشی نوکر رکھا ہے۔ جس کا نام ابوالکارم ہے، وہ مجھے فارسی اور بنگالی پڑھاتا ہے اور میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔

کئی سال گزر گئے۔ سرل اب کلکتے کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی
 اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی۔ اس کے پاکی بردار ہر وقت
 سرخ وردی میں ملبوس رہتے۔ سونہا بردار چاندی کے موٹھ کی چھڑیاں لے کر چلتے۔
 رات کو مشعلچی اس کی فینس کے آگے آگے دوڑتے۔ خانساں اور خدمت گار اس
 کے مطبخ اور کھانے کے کمرے کے نگران تھے۔ حقہ بردار اس کا پیچوان بھرتا تھا۔
 دفتر میں اس کا کلرک یوریشین تھا جس کا نام رالف تھا۔ سرل کو اس کی موجودگی میں
 بڑی بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ رالف، بلیک ٹاؤن کا باسی، بڑی وفاداری سے
 سرل کی خوشامد میں لگا رہتا۔ دفتر کے انتظام کے لیے بنگالی سرکار موجود تھا اور ان
 گنت ہرکارے اور پیادے اور چپراسی۔ ایک تن تنہا سرل لیشلے اور اس کے ذاتی
 عملے میں چالیس پچاس آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کا مالی تھا اور گراس کٹ
 اور سائیکس اور چابک سوار اور ہشتی دربان، چوکیدار، پھر اس کا بجرہ تھا جس کے
 ماتھی اس کے ملازم تھے۔ درزی، دھوبی اور ناکی ان سب سے علیحدہ۔ اس سلطنت
 کا، جو اس کی سفید رنگ کی کوٹھی میں قائم تھی، سرل لیشلے بلا شرکت غیرے مالک و
 مختار تھا، وہ چاہتا تو ان سب کو الٹا لٹکا کر پٹوا سکتا تھا اور ایسا اس نے اکثر کیا، وہی
 سرل جو کچھ عرصہ قبل کیمرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشقِ سخن کرتا
 پھرتا تھا اور کسی بہت میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا، جوڈل ٹمپل کے پھانک
 سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور گرے کی نظموں پر سر دھنسا سنسان سرکوں پر
 ٹہکا کرتا اور رات کو کسی طالب علم سا تھی کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔

صبح سات بجے دربان اس کی کوٹھی کے ہال کا دروازہ کھولتا۔ دھوپ جھلملیوں

سے چھن چھن کر اندر آنے لگتی، تو سرل اپنی مسہری سے اٹھتا۔ اس کے سرکار اور چیر اسی کاغذات لے کر فرشی سلام کرتے بیڈروم میں داخل ہوتے۔ حجام اس کا خط بناتا۔ وگ سر پر جمانے کے بعد واسکٹ پہنتا ہوا وہ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا جہاں وہ چاء پیتا جاتا اور پیچوان کے کش لگاتا۔ کاروبار اور سرکاری کام کے سلسلے میں جتنے غرض مند صبح صبح سلام کرنے آتے وہ سب میز سے کچھ فاصلے پر مودبانہ کھڑے رہتے۔ سرل بے نیازی سے احکام صادر کرتا۔ دس بجے کے قریب یہ سارا جلوس پاکی کی طرف بڑھتا اور پاکی اس کے دفتر کی طرف روانہ ہوتی۔ چار بجے واپس آ کر سرل کلکتے کے قاعدے کے مطابق شام کے سات آٹھ بجے تک سویا کرتا، اس کے بعد لباس تبدیل کر کے اور بن سنور کے خواتین سے ملنے کے لئے نکل جاتا، ہوشل کا لڑکھٹا۔ کورس میں ہوا خوری کرتا یا کہیں ڈنر پر چلا جاتا۔ کس قدر مکمل اور فرصت کی زندگی تھی اور اسی آرام اور آسائش کے ساتھ اس کا بینک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ تجارت میں اسے بے اندازہ منافع ہو رہا تھا۔ گورنر جنرل اس سے بے حد خوش تھا۔ افواہ تھی کہ اسے شاید دوامی بندوبست کے انتظام کے سلسلے میں کسی اہم عہدے پر مفصل میں یا لکھنؤ ریڈیو سی بیج دیا جائے۔ کلکتے میں وہ ماؤں کے لیے ایک مستقل موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ بال رومز میں اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بن بیابی امیرزادیاں اکثر سوچتی ہیں کہ وہ کون خوش قسمت لڑکی ہوگی جس سے امیر اور پرنس سرل ایٹلے بیاہ کرے گا۔

مگر ایڈی ہیمل یا ایڈی سنتھیا کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے اس غیر معمولی ذہن اور دماغ کے مالک سرل ایٹلے نے ایک بڑی ہی معمولی اور نامیاد

حرکت کی یعنی ایسی حرکت جو عام طور پر کبھی دولت مند انگریز کرتے تھے اور جو ہندوستان کے انگریز ”نوابین“ کا عام دستور تھا۔

یعنی سرلہ شلے نے بھی ایک نیو عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔

انگریز ”نوابوں“ کا انگلستان میں بھی خوب مذاق اڑایا جاتا، وہاں کا جاگیردار طبقہ ان کو اپنے ہم پلہ سمجھنے سے منکر تھا۔ کل کی بات تھی کہ یہ لوگ سٹی میں معمولی تاجر یا گزر گے تھے۔ اور نو دولتے تاجر سے پشتینی زمیندار کی ہمیشہ سے الٹی رہی ہے مگر ہندوستان میں ان لوگوں نے اپنے لیے ایک الف ایلوئی دنیا تخلیق کر رکھی تھی۔ پٹنہ، ڈھاکہ، قاسم بازار، بالاسور اور ہنگلی کے تاجر، مرشد آباد، لکھنؤ، بنارس، گوالیر اور دلی درباروں میں سفارت کے فرائض انجام دینے والے ڈپلومیٹ، کلکٹر، جو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے ضلعوں میں تعینات تھے۔ فوجی افسر جنہوں نے اودھ میں چھاؤنیاں چھانی تھیں۔ فوجی ایڈوچررز جو ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں اوپننگی بنے دندنا رہے تھے۔ یہ سب اب سرلہ کے ساتھی تھے۔ سرلہ ان کا نقطہ نظر خوب سمجھتا تھا۔ پلاسی کے بعد سے لکشمی نے ہندوستانیوں نے روٹھ کر فرنگی کا گھر دیکھ لیا تھا۔ انگریز کے یہاں ہن برس رہا تھا۔ شہر کی چورنگی میں ان کے ماؤن ہاؤس تھے۔ شہر سے باہر بڑے بڑے باغات میں انہوں نے بنگلے بنوا رکھے تھے۔ اودھ اور مرشد آباد کی ریڈیو نمسی میں رہنے والے انگریزوں کے یہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ شورے اور نیل کے تاجر کروڑ پتی ہو چکے تھے۔ نوابوں کی طرح زندگی گزارنا ان کا آدرش تھا۔ حرم، حقہ، شعر و شاعری، مانچ رنگ، مرغ بازی۔۔۔ یہی مشاغل ان فرنگیوں کے تھے۔۔۔ ہندوستانی نوابوں اور انگریز اوپنچے طبقے نے آپس میں

سمجھوتہ کر کے ایک انتہائی مہذب فضاء کی بنیاد ڈالی تھی۔ دیوانی ملنے کے بعد انگریز سولین بنگال میں منظر عام پر آیا، یہ لوگ بے حد کم عمر میں انگلستان سے یہاں آتے اور بہت جلد ساری ہندوستانی خصلتیں اختیار کر لیتے۔ کلکٹر کی حیثیت سے اضلاع میں تعینات ہونے کے بعد اپنا وقت وہاں کے راجاؤں اور نوابوں اور زمینداروں کی صحبت میں گزارتے۔ بنگال کی جاگیردارانہ تہذیب میں فرنگی افسر بھی گھل مل چکا تھا۔ پلاسی کے بعد کمپنی کا فیکٹر فقط دولت جمع کر کے وطن واپس جانے کے بجائے اب نواب کہلانے کے خواب دیکھتا تھا اور اردو ادب میں دلچسپی رکھتا تھا اور حرم میں دس دس عورتیں رکھتا تھا۔

سرل بھی شنیل کو اپنی کوٹھی میں داخل کر کے گویا باقاعدہ نواب بن گیا۔ سیاہ لمبے بالوں اور نشلی آنکھوں والی شنیل ڈھاکے کے قریب کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ انگریز نواب اور ہندوستانی نواب نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس سے تہذیب و تمدن وغیرہ کو تو خوب ترقی ہو رہی تھی مگر شنیل دہی کا باپ اسی طرح فاقے کر رہا تھا بلکہ اب اس کے فاقوں میں زیادتی ہو گئی تھی کیونکہ ڈھاکے پر اقتصادی تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ شنیل کی سات بہنیں تھیں جن میں تین بال و دھوا تھیں اور چار کی ابھی شادی نہیں ہو سکی تھی، اس کا ایک بھائی تھا جسے کلکتے کے ایک گودام میں ملازمت مل گئی تو اس نے اپنی بہنوں کو ڈھاکے سے بلوا بھیجا۔ اس گودام کے مالک کا نام سرل صاحب تھا۔

سرل صاحب ابھی لڑکا ہی سا تھا مگر کلکتے میں اس کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک روز شنیل پوچا کہ ایسے کالی گھاٹ جا رہی تھی کہ سرل صاحب نے کہیں اسے دیکھ لیا۔

سرل صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ کافی دل پھینک واقع ہوئے ہیں، گو کلکتے کی مسی بابا لوگ اس سے خفا رہتی تھیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی میم کیوں نہیں بنالیتا۔ شنیدا کا بھائی اپنی مغلسی سے تنگ آ کر سوچ رہا تھا کہ وہ سیرام پور جا کر عیسائی ہو جائے۔ سارے دلدردور ہو جائیں گے۔ اس کو اپنی بہنوں کے بوجھ سے نجات ملے گی۔ مشن والے آپ ہی ان کے شادی بیاہ کی فکر کریں گے، مگر اسی روز سرل صاحب کے سرکار نے آ کر اس سے کہا: ”صاحب نے تمہیں یاد کیا ہے۔“ اور اس کے اگلے روز شنیدا سرل صاحب کی کوٹھی پر پہنچادی گئی اور اس طرح اس کے خاندان کو انلا اس سے نجات ملی۔

ہر معاشرے کی اپنی اقتدار بن جاتی ہیں، یہ اس وقت کا عام دستور تھا۔ نسلی تعصب ابھی زیادہ نہیں بڑھا تھا بہت سے انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔ شاہ عالم ثانی کی بیٹی شہزادی فیض النساء اور کمبلے کی شہزادی ظہور النساء بیگم کی شادیاں انگریزوں سے ہوئی تھیں۔ کلکتے کے جوب چارنوک کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔

سرل صاحب نے شنیدا سے بیاہ نہیں کیا، مگر شنیدا ناخوش نہیں تھی، وہ شان سے کوٹھی میں رہتی تھی اور نوکروں پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی مانند اور بہت سی دہلی عورتیں اعلیٰ طبقے کے انگریزوں کے زمان خانے میں براہی تھیں۔ ان کے بچے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجے جاتے تھے اور جب تک ان بچوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم از کم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔

مگر سرل کو معلوم تھا کہ اس کی اور شنیدا کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا، وہ دیر اس یا

کلکتے کے یتیم خانے میں داخل کر دیے جائیں گے۔ بڑے ہو کر ان کو اعلیٰ نوکریاں نہیں ملیں گی وہ رالف کی طرح کلر کی کریں گے یا کسی رجمنٹ میں شامل ہو کر بینڈ بجاتے مرہٹوں سے لڑنے جایا کریں گے۔ اس کی لڑکی کو کسی انگریز نواب زاوی کی آیا بننا پڑے گا یا کسی فوجی افسر کی داشتہ۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ یوریشین طبقہ کس قدر زبردست ٹریجڈی کا حامل ہے، تب اسے خوبصورت ماریا ٹیریز یاد آئی جسے وہ مد راس میں ایسے کہنے پن سے چھوڑ آیا تھا۔

یوریشین طبقے کی بنیاد پر تنگالیوں کی آمد کے زمانے سے پڑی تھی، پھر فرینچ اور ولانڈیز یوں نے آ کر اچھوتوں کو عیسائی کیا، جو شخص بوٹ اور ہیٹ پہن کر بگڑی ہوئی پر تنگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں میں نسلی تعصب نہیں تھا۔ ان کی آمد سے اس طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یوریشین بڑے قابل رحم لوگ تھے۔ بے چارے کرانی، جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودر اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرل کو یہ سب سوچ کر جھرجھری سی آئی تو کیا اسے ایڈی سنتھیا سے شادی کر لینا چاہئے، پھر شنبلا اپنی ریلی آواز میں اسے پکارتی اور وہ ہڑبڑا جاتا اور پالکی میں بیٹھ کر کورس کی طرف نکل جاتا۔ اس کی زندگی بڑی مصروف اور بڑی ہنگامہ خیز گزر رہی تھی۔ گورنر جنرل کے بال اور پبلک بریک فاسٹ، پیسٹنگ اسٹریٹ اور علی پور کے کانسرٹ اور رقص، گارڈن ریج کے جشن اور تقریبات، پھر مفصل کے سفر۔ ڈھاکہ، چاٹگام، مرشد آباد، چوبیس پرگنہ، مونگیر۔ سارا بنگال اور سارا بہار اس کے قدموں میں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کے سارے آبائی راستے اس کے لیے کھلے تھے۔ نیل کے ان گنت کاشتکاروں کی زندگیوں اور

قسمتوں کا وہ مالک تھا۔ دھانی شری اور ہری منگل اور کرناٹی اور مدھومتی اور شوہنری کی لہروں پر اس کی کشتیاں نیل کی باربرداری کر رہی تھیں۔ ڈھاکے کے مغلوں کا عظیم الشان ناؤ واڑہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے دور سے اپنی انقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چھوئی: ”ابو لمونشور اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے تمہاری کھال نہ ادھیڑ دوں تو ذرا طاقت سے پتوار چلاؤ!“ اس نے کہا۔

بوڑھا زیادہ کوشش سے پتوار پر جھک گیا۔ سرل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، کس قدر سخت جان لوگ ہیں، اس نے سوچا۔ ابھی چند سال ہوئے کیسا ہولناک قحط صوبے میں پڑا تھا۔ دریاؤں میں اتنے طوفان آتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں مگر یہ لوگ اسی بے حیائی سے جئے جاتے ہیں۔ حد ہے واقعی۔ اس نے گھڑی دیکھی، اب رات کے نو بج رہے تھے، اسے آج ہی رات کو رلبہ گریش چندر رائے کی زمینداری پر پہنچنا تھا۔ کلکتے میں حکومت میں بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ایک دو دن بعد جان شور جانے والے تھے اور نیا گورنر جنرل آ رہا تھا۔ یہاں سے لوٹ کر اسے گورنمنٹ ہاؤس بھی جانا تھا۔ آج کیا تاریخ ہے؟ اس نے پیڑ سے پوچھا۔ پیڑ خرائے لے رہا تھا۔ سرل نے لائین اٹھا کر بنگال گزٹ پر نظر ڈالی۔ کل کا اخبار تھا۔

آٹھ جون ۱۷۹۸ء، سرل یک بیک چوٹک اٹھا۔ اسے ہندوستان آئے آج پورے پانچ سال ہو گئے تھے، ان پانچ سالوں میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نیل کی تجارت دن دوئی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ کجرات کی نیل کی صنعت دم

توڑ چکی تھی، اس کی جگہ کمپنی کے انگریز پلانمرز دی سے بنگال تک پھیل چکے تھے۔
 بنگال کا کسان انگریز پلانمرز سے قرض لے کر نیل بوتا تھا اور پھر مختلف طریقوں
 سے اس پر ظم توڑے جاتے تھے۔ عدالتوں میں اس کی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔
 انصاف کرنے والے خود ان پلانمرز کے بھائی بند تھے۔

بنگال کا کسان ابوالمنصور مال الدین جودن بھرنیل کے کھیتوں میں مشقت
 کرتا تھا اس وقت اپنے نئے آقا سرل ہاورڈ ایشلے کو نوکے میں بٹھا کر اس پار لیے
 جا رہا تھا اور چاند پدما کے پانیوں پر اتر آیا تھا اور ہوا میں خنکی آچکی تھی اور انناس اور
 کیلے کے جھنڈ میں گیدڑ بول رہے تھے۔
 کیونکہ رات بہت ہولناک تھی۔

۲۷

کنارے پر آ کر ادھے چرن نے لائین اونچی کی اور اس کی روشنی کو پانی پر
 چمکایا۔ دورافتح پر سے ایک کشتی سبک روی سے تیرتی ہوئی گھاٹ کی طرف جا رہی
 تھی، انہوں نے لائین زمین پر رکھ دی اور چادر لپیٹ کر وہیں اکڑوں بیٹھ گئے
 قریب باشا کا جھونپڑا تھا جس میں گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ بانس کے جھنڈ کے
 نیچے ان کا اپنا چھوٹا سامکان تھا۔ جس کے دروازے پر چراغ جل رہا تھا۔ سارے
 میں ایک ہیبت ناک سناٹا تھا جس میں صرف راجہ گریش چندر رائے کے محل کی
 طرف سے سازوں کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں، سناٹا وہاں پٹنے اور

لکھنؤ تک کی طوائفیں آئی تھیں۔ راجہ صاحب کو اٹ صاحب نے خلعت عطا کی تھی، اس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ کلکتے سے صاحب لوگ اس میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ چوپال میں عجیب طرح کی خاموشی طاری تھی۔

”کچھ بات کرو دادا۔“ پرمود نے چلم کی راکھ کریدتے ہوئے اس آواز میں رادھے چرن سے کہا۔

رادھے چرن خاموشی سے گھاٹ کی اور دیکھتے رہے۔ ہوائیں بانس کے جھنڈ میں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

ایسی ہی راتوں میں گھنگریا لے بالوں والے ستیہ پیر ستیہ نرائن (گوڑ کے سلطان علاء الدین حسین شاہ کا صوفی نواسا جو بنگال کے مسلمانوں کے لیے ستیہ پیر اور ہندوؤں کے لیے وشنو کا اوتار ستیہ نرائن بن گیا۔) ماتھے پر صندل کا ٹیکا لگائے ہاتھ میں بانسری لیے مارنجی لباس پہنے اپنی کمر کی زنجیریں جھنجھاتے پدماکے کنارے کنارے جاتے نظر آ جاتے ہیں، اگر مجھے کبھی ستیہ نرائن مل جائیں تو میں ان سے پوچھوں، تو میں ان سے کیا پوچھوں۔۔۔۔؟ رادھے چرن اکڑوں بیٹھے سوچا کیے۔

بہت سی زنجیروں کے جھنجھانے کی آواز نے سنائے کو توڑا۔ رادھے چرن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ستیہ پیر تو نہیں ان کے چند فقیر موجود تھے۔ بانسوں کے جھنڈ سے نمودار ہو کر وہ رادھے چرن کے مکان کی طرف مڑ گئے تھے اور دروازے پر کھڑے حسب معمول صدائیں لگا رہے تھے۔

رادھے چرن نے بڑے کوفت کے ساتھ ان کو دیکھا۔ ستیہ نرائن کے بھکاری

ان کے دوار پر کھڑے تھے اور ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا۔ اچھی فصل کی دہی لکشمی کے بچھن گانے والے یہ مسلمان فقیر گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے۔ صدیوں سے یہ فقیر اسی طرح گاتے بجاتے آئے تھے۔ گاؤں کی ہندو عورتیں ان کی جھولی میں آٹا اور چاول ڈالتی تھیں اور ان سے دعائیں لیتی تھیں۔ یہ ان کو اچھے شگون کی باتیں بتاتے، سانپ کے کاٹے کا اپنے منترؤں سے علاج کرتے، ان کے بغیر زندگی مکمل نہیں تھی۔ پچھلے سال انہوں نے شنیدا کے لیے کہا تھا، جب وہ دکھشنا دینے باہر آئی تھی، کہ یہ بیٹی پدمنی ہے، پھر انہوں نے پدمنی کی ساری نشانیاں شنیدا کی ماں کو بتلائی تھیں۔ پدمنی جو چڑیوں کے جگنے سے پہلے جگتی ہے۔ شام پڑے گھر میں چراغ جلاتی ہے، اپنے شوہر کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہے۔ بیٹی بڑے نصیبوں والی ہے، انہوں نے بشارت دی تھی۔

ان کی آواز سن کر شنیدا کی ماں دلیز پر آئی، اس کے منگے خالی پڑے تھے۔ فقیرؤں کو دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ یہ سنیہ پیر اور مانک پیر اور لکشمی اور چنڈی ان سب دہی دیوتاؤں کی قوم پر اسے بڑا غصہ آیا، یہ سب دھوکے باز ہیں، سارے دہی دیوتا۔ اس نے ساری کے آنچل سے آنسو خشک کرنا چاہے اور چپ چاپ کھڑی ان کو دیکھتی رہی، وہ حسب معمول سیتلا اور چنڈی اور شیوا کا جاپ کیا کیے 'شنیدا کہاں ہے۔' 'بالا خران میں ایک نے پوچھا۔

”کلکتے۔“ رادھے چرن کی بی بی نے کہا۔

”وہاں کیا کر رہی ہے؟“

”اس کا۔۔۔ اس کا بیاہ بیاہ ہو گیا۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا، اس

نے یہ نہیں بتایا کہ شنیلہ کو پردے سے نکلنا پڑا اور وہ ایک فرنگی کی کوٹھ میں رہ رہی ہے۔ مسلمان فقیروں نے آشیر باد دی۔ ”میں نے اس کا ماتھا دیکھ کر بتایا تھا سجاگن لکشمی ہے۔ پدنی، ہمارا داماد کیا کرتا ہے۔۔۔؟“

”کلکتے میں کام کرتا ہے۔“

”اچھا۔“ فقیروں نے اطمینان سے مزید دعائیں دیں اور واپس مڑنے لگے، اب ان کو ہر گھر سے یہی سننے کو ملتا تھا۔ ہمارے پاس دان کے لیے کچھ نہیں۔ ان کو اس قحط سالی کی عادت پڑ گئی تھی۔ بڑے کال کو پڑے تقریباً تیس سال گزر چکے تھے جب سنا تھا کہ فرنگیوں کی راجدھانی کلکتے کی سڑکیں فاقے سے مرتے ہوئے انسانوں کی لاشوں سے پٹ گئی تھیں، مگر اب کلکتے کی سڑکیں دور دور تک پھیل چکی تھیں، اب گاؤں گاؤں لوگ مر رہے تھے۔

”ٹھہرو۔۔۔“ شنیلہ کی ماں نے کہا۔ ”میں نے پر فلا کو ہاٹ بھیجا تھا۔ شاید وہ کچھ لے آیا ہو۔“

مگر فقیر دعاؤں کی بوچھاڑ کرتے اور اس قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔ شنیلہ کی ماں اپنے بھانجے کا انتظار کرتی رہی۔

مگر وہ ہاٹ سے گھر لوٹنے کے بجائے سامنے چوپال میں جا بیٹھا تھا، اس کے سارے ساتھی منہ لٹکائے بیٹھے تھے، وہ تین دن سے تیل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تیل سونے کے بھاؤ بک رہا تھا۔ نمک عنقا تھا، چاول کی وہ صورت کو ترس گیا تھا۔ چھالیا اور تمباکو اور چاول اور نمک اور ہر شے کی تجارت پر کمپنی بہادر کے فرنگیوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ دریاؤں پر ان کی کشتیاں مال سے لدی ہوئی چل رہی

تھیں مگر بازار میں قیمتیں آسمان تک پہنچ چکی تھیں۔ چوپال میں سات آٹھ آدمی اور آن کر بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ باتیں شروع ہوئیں: ”اوجیت داوا تم بھی ڈھاکے سے آرہے ہو؟“ پرمودر نے پوچھا۔ ”ہاں میں بھی اور دلیپ بھی اور سب۔ اب وہاں کھانے کو نہیں ملتا، سارے کرگئے ٹوٹ گئے، اب ہم بھی مل چلائیں گے۔ تمہارے راجہ صاحب ہمیں زمین جوتے دیں گے؟“ اوجیت نے کہا۔

”پتا نہیں۔“ پرمودر نے اکتا کر جواب دیا، وہ یہ سب سوچتے سوچتے عاجز آ گیا تھا مگر اس کا دماغ اب کام نہ کرتا تھا۔ لوگ جوق در جوق دیہات کا رخ کر رہے تھے۔ زرعی زمین پر آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہندوستان جو دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک تھا اب خالص زراعتی ملک میں تبدیل کر دیا گیا تھا، جہاں پیداوار کم تھی، لگان زیادہ اور روز قحط پڑتے تھے۔ ان آنکھوں نے کیا کیا زمانے پلٹتے دیکھے۔ رادھے چرن نے چوپال کے ہجوم پر نظر ڈال کر سوچا۔ کارنوالس کے نئے قانون نے بالکل ہی کمر توڑ دی تھی۔ تین چار نو جوان لڑکے ان کے قریب آن کر بیٹھ گئے۔

”داوا تمہاری نوابی میں بھی ایسا ہوتا تھا۔“ اشوتوش نے سوال کیا۔

”کیا؟“ رادھے چرن نے بے دھیانی سے پوچھا۔

”یہی سب مہنگائی۔۔۔ اور کال۔۔۔ دنگا فساد۔“

لمبی سفید بکرے کی ایسی داڑھیوں والے دو ہندو بوڑھے ناریل کرید کر لڑکوں کو دھندلی آنکھوں سے دیکھا کیے، یہ دونوں بکسر میں لڑے تھے۔ گاؤں ان

پرانے وقتوں کے بڑھوں ٹھڈوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مغلوں اور نوابوں کے زمانوں کے گن گاتے تھے اور روتے تھے۔

”وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہماری عورتوں کو پردے سے نکلنا پڑے گا، ہمارے بچے گلیوں میں بھوکے مریں گے۔ ہمارے بادشاہ کا تاج گر پڑے گا۔ مہا بھارت میں لکھا ہے۔“ بوڑھے پھونس دھن گوپال مزدار نے کہنا شروع کیا۔

”ارے مہا بھارت کو چھوڑو دادا۔“ پرنلا نے جل کر اس کی بات کاٹی۔ یہی تو ان بوڑھوں میں ایک عیب تھا۔ بات بے بات پر سراج الدولہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ یہ دھن گوپال دادا ابھی کچھ داستان شروع کرنے والے تھے۔ پرنلا نے ان کو ہتھے پر ہی ٹوک دیا۔ ”کیا گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔ ”کلکتے چلو۔ جہاں شام واگئے ہیں (شیام رادھے چرن کا لڑکا تھا جو سرل صاحب کے گودام میں ملازمت کر رہا تھا) اور لاٹ صاحب کی چاکری کرو۔ سراج کے زمانے لد گئے دادا۔“

رادھے چرن حیرت سے سنتے رہے، یہ لڑکا پرنلا بالکل مارواڑیوں کی ایسی باتیں کر رہا تھا، یہ ذہنیت اس میں کہاں سے آگئی؟ ان کو مارواڑیوں سے نفرت تھی۔ رادھے چرن پرانے شرفا کے اس طبقے میں سے تھے جو فارسی پڑھتا تھا۔ مغلوں کی سرکار کا نظم و نسق سنبھالتا تھا اور باقی وقت پوجا پاٹ میں لگا رہتا تھا، مگر اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا متوسط طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ

تجارت کر کے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بیویوں کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیردار اور کسان کے درمیان کا

یہ نیا سرمایہ دار طبقہ انگریز کا دوست اور دست راست تھا اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔

”لاٹ صاحب کی چاکری۔“ دھن گوپال نے کھانسنے کے بعد جوش سے بولنا شروع کیا، اس کی داڑھی اٹھین کی روشنی میں ہلتی ہوئی مضحکہ خیز معلوم ہوئی، وہ خود بہت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ ”لاٹ صاحب“ اس نے دہرایا۔ ”اس سے مطلب؟ ہمارا بادشاہ ابھی دلی میں موجود ہے، وہ تمہارے لاٹ صاحب کا دماغ ٹھیک کر دے گا۔“

”تمہارا بادشاہ اندھا کر دیا گیا ہے گوپال دادا۔“ پر فلا فقہیہ مار کر ہنسا۔ ”تم جانے کس دنیا میں رہتے ہو، تمہارے بادشاہ نے پہلے ہی دیوانی کلائیو کے حوالے کیوں کر دی۔ اب دماغ ٹھیک کرے گا۔“ پر فلا تلخی سے ہنسا۔ دونوں بوڑھے چپ چاپ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ رادھے چرن نے کوفت سے پر فلا پر نظر ڈالی۔ ان لڑکوں کو کچھ سمجھانا بیکار تھا، یہ بھی بتانا بیکار تھا کہ بادشاہ نے اپنی مرضی سے دیوانی نہیں دی۔ کلائیو نے زبردستی حاصل کی تھی۔ اس فاقے زدہ ملک میں پیدا ہونے والے ان نوجوانوں کو کس طرح یقین آ سکتا تھا کہ یہی بنگال دیس کا زرخیز ترین صوبہ تھا۔ یہی بنگال فردوس ہند کہا جاتا تھا، اس وقت اس دیس میں پرانے ملک انگلستان کا زمینداری نظام رائج نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی مصنوعات کی برآمد پر محصول نہیں لگے تھے۔ اس وقت لوگ ذاتی جائیداد کے تصور سے آشنا نہیں تھے، یہ سب رادھے چرن کے دیکھتے دیکھتے ہوا تھا۔ چند روز قبل جب دوامی بندوبست کے سلسلے میں دورہ کرتا ہوا ڈھا کے کانگریس کلکٹر یہاں آیا تو

اس نے اپنے دربار میں رادھے چرن کو بلا کر کہا تھا کہ ہم یہ سب تمہارے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ مسلمان نوابوں نے تم لوگوں کو اپنی بد انتظامی سے تباہ کر دیا تھا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو صاحب۔ ہمارے نوابوں کے یہاں بد انتظامی نہیں تھی، میں کا۔ ستھ ہوں، میرے پرکھ صدیوں سے مرشد آباد میں حکومت کا انتظام کرتے آئے ہیں۔ میں آج بوڑھی گنگا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہ رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنی خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس بھی کھو دیے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بکتے ہو۔۔۔ تم۔۔۔“ اور جب رادھے چرن غصے سے کانپنے لگے تھے تو ان کو کلکٹر کے چراسیوں نے کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس روز اس کمرے میں ایک انگریز مشنری بھی موجود تھا جو اپنا سفر نامہ لکھ رہا تھا اور یہ مکالمہ سننے کے بعد اس نے قلمبند کیا تھا۔ ”بنگال کا ہندو مسلمان نوابوں سے نفرت کرتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں، اس ملک میں کوئی اتحاد نہیں۔ دراصل اسے ایک کہنا ہی نہیں چاہیے، یہ بہت سی اقوام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہندو مسلمان ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں، یہ دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔“

رادھے چرن دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھے رہے۔ کشتی اب ان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ایک بلند و بالا نوجوان فرنگی بیٹھا تھا جس کے وگ کا پاؤڈر اور تلوار کا دستہ چاندنی میں جھللا رہا تھا۔ مونشور دادا ہانپتے کانپتے نوکے کو کھے رہے تھے۔

رادھے چرن نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ علی وردی نے مرتے وقت نو جوان سراج سے کہا تھا: فرنگیوں نے شہنشاہ کے ملک اور ان کی رعایا کی دولت کے آپس میں حصے بخرے کر دیے ہیں۔ اس کی طاقت زبردست ہے، ان کو قلعے اور فوجیں حاصل نہ کرنے دینا ورنہ ملک ان کا ہو جائے گا۔ اس وقت چوبیس سالہ سراج مرشد آباد میں تھا۔ فرنگی اس کی توہین کے طور پر اسے قاسم بازار کی تجارتی کوٹھیوں میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس نے ملک کے ان تاجروں کا محصول معاف کر دیا تھا مگر خود نواب کے علاقے سے جو سامان آتا، انگریز اس پر زبردست محصول کارہے تھے۔ کلکتے کی تسخیر کے بعد بھی سراج نے انگریزوں کے عہد نامے پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو معاف کر دیا تھا۔ رادھے چرن کا باپ ان سب معرکوں میں سراج کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ انگریزوں نے ہنگلی میں قتل و غارت مچایا تو سراج نے لکھا: تم نے میری پر جا کو تاراج کیا ہے۔ تم اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو، اگر تم اب بھی محض تاجروں کی طرح رہنے پر اکتفا کرو تو میں تمہاری ساری مراعات واپس کر دوں کیونکہ جنگ تباہ کن ہے، تم مجھ سے امن کے معاہدے کرتے ہو اور پھر حملہ کر دیتے ہو۔ سراج نے لکھا: مرہٹے، جن کو کسی مقدس انجیل کا واسطہ نہیں ہے، اپنے معاہدوں پر قائم ہیں اور تم جو خدا اور عیسیٰ کی قسمیں کھاتے ہو اپنے وعدوں کو توڑ ڈالتے ہو۔

اور ایڈمرل وائسن نے جواب دیا تھا: ”میں ایسی آگ تمہارے ملک میں لگاؤں گا جسے گنگا کا سارا پانی نہ بجھا سکے گا، میں ایسی آگ لگاؤں گا۔ میں ایسی آگ۔۔۔“ یکا یک مشعلوں کی روشنی سے افق جگمگا اٹھا۔ بوڑھی گنگا کی موجیں

جھلملا رہی تھیں۔ صاحب کی کشتی گھاٹ پر پہنچ چکی تھی۔ رجبہ گریش چند رائے اور ان کے حوالی موالی گھاٹ پر استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ رادھے چرن نے بڑا کرسمرا اٹھایا اور اس کی روشنی میں ان کی آنکھیں چندھیا گئیں، وہ چادر لپیٹ کر آہستہ سے اٹھے اور اپنے نیم تار یک مکان کی طرف مڑ گئے۔

چوپال میں بیٹھے ہوئے سارے آدمی سہم کر ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ رجبہ صاحب کے پیادے رات کی دعوت کے لیے بیگار پکڑنے کی غرض سے چوپال کی سمت آرہے تھے۔

۲۸

پچیس سال گزر گئے۔

ڈھاکہ کے کارخانوں میں الو بول رہے تھے، سارے ملک میں لوہے کی بھٹیاں مدتیں گزریں سرد ہو چکی تھیں۔ انگلستان کی ملوں سے ایسا دھواں اٹھا تھا جس نے ساری دنیا کو تار یک کر دیا اور اس تاریکی میں ہندوستانی جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی بنیاد پر انگلستان میں صنعتی انقلاب اور نئی سرمایہ داری کی نیو اٹھائی جا چکی تھی، اب باضابطہ شہنشاہیت کا دور تھا۔ مرشد آباد جو کبھی کلائیو کولنڈن سے عظیم تر دہلائی دیا تھا اب سنسان پڑا تھا۔ مملکتہ گنجان شہر بن چکا تھا، اسی کلکتے میں علی پور روڈ پر سرل ہاورڈ ہشلے کی عظیم الشان عمارات کھڑی تھیں۔ سرل ہاورڈ

لہشلے، پچاس سالہ، دنیا دار، کامیاب، جہاندیدہ، پرانا پانی، گھاگ جان کمپنی کا اہم
 ستون نجی اردو نشر کامرہی اور سر پرست، اودھ کے بادشاہ کانگوٹیا یار اس سے اپنے
 شکاری کتوں سے ہلو ہلو کرنے کے بعد اب بوچے میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا
 کہ حسب معمول ہوا خوری کے لیے نکلے، اس کے فزیشن نے اسے تاکید کی تھی
 کہ وہ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھے، محنت کم کرے، غم کم کھائے، شراب اس سے
 بھی کم پئے، روز باقاعدہ ہوا خوری کرے، ورنہ مر جائے گا۔ فزیشن کی ان
 نصیحتوں پر اسے ہنسی آتی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی بے حد گھٹیا ہے۔
 گھٹیا، کامیاب، دولت مند، اوسط قسم کا انسان جو پچاس سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو
 اس کے طبیب اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ ہمارے گورنروں، اعلیٰ حکام
 اور دوسرے بڑے آدمیوں کے طبیب بھی ان سے یہی کہتے تھے۔

وہ کس قدر گھٹیا آدمی تھا۔ سرل نے کوفت کے ساتھ اپنے شاندار محل پر نظر ڈالی
 جس کے باغ میں فوارے چل رہے تھے اور کالے ملازمین کی پلٹن کام میں
 مصروف تھی۔ خداوند۔۔۔ مجھے تو نے اتنا ذلیل کیوں بنایا؟ پھر اس نے چند اہل
 کار اپنی طرف آتے دیکھے اور وہ جلدی سے اپنا بڑے صاحب والا انداز چہرے پر
 طاری کر کے بوچے میں جا بیٹھا۔ قاصد گورنمنٹ ہاؤس سے آئے تھے، اپنے
 کلرک کے ذریعے چند کاغذات اسے لکھنؤ کے ریڈیلنٹ کے پاس بھجوانے تھے۔
 بنگال کے حالات مخدوش تھے، اضلاع کے مسلمان کسانوں نے اودھ کے چند
 باغی مولویوں کی سرکردگی میں سراٹھایا تھا اور فتنہ فساد پھیلاتے پھر رہے تھے۔
 دریائی اور خشکی کے راستے محفوظ نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں پریشانی تھی۔ اودھ

کے بادشاہ کے پاس ان کاغذات کا پہنچنا ضروری تھا، اسے مفسدوں کا سرکچلنے کے لیے ندیا کے ضلع بھی جانا تھا (ندیا کے ضلع میں پلاسی باغ تھا جس میں آم کے گھنے کنج تھے اور موسم گرما کے عروج پر جب آم میں پورا آرہے تھے وہاں کرنل کلائیو، سراج سے لڑا تھا)۔ ندیا۔۔ گورنمنٹ ہاؤس سے آئے ہوئے اس سرکاری خط میں اس نام کو پڑھ کر اور بہت سی باتیں ذہن میں آگئیں۔ ناموں اور لفظوں کے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی، ہر چیز کا کسی نہ کسی شے سے تعلق تھا۔ ساری دنیا ساری کائنات اسے کوئی نہ کوئی افسانہ سنانے کے لیے تلی بیٹھی تھی، اپنا افسانہ وہ کس کو سنائے گا؟

خط پر دستخط کر کے قاصدوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ پھر چلنے کے لیے تیار ہوا۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے، سامنے سڑک پر چند کالے مرگلے آدمی ایک ارتھی اٹھائے ہری بول ہری بول کے ہولناک نعرے لگاتے جلدی جلدی قدم اٹھاتے مرگھٹ کی طرف جا رہے تھے۔ سرل کو ایک پھریری سی آئی اور اس نے جھک کر ایک سوگوار سے پوچھا: ”کس کی ارتھی لیے جاتے ہو؟“

”وڈھا کیشوری کے رادھے چرن بابو۔“

سرل چونکا، رادھے تو شنیلہ کے باپ کا نام تھا۔

شنیلہ کون تھی۔۔؟

دنیا میں ہزاروں رادھے چرن ہوں گے اور اس نے شنیلہ کے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا جو سنا تھا کہ کبھی کبھی اپنے بیٹے سے ملنے گاؤں سے آ جایا کرتا تھا اور کافی خبیثی اور بددماغ بوڑھا تھا۔

سرل ٹوپی اتار کر سڑک کے کنارے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ ارتھی والوں نے

بڑی حیرت سے اس کو دیکھا۔ انگریز حاکم جو زندہ بنگالیوں کے ساتھ جوتے لات سے بات کرتا تھا مرے ہوئے بنگالی کی یہ تکریم کیوں کر رہا تھا؟

بے چارے رادھے چہن بابو۔ کاش تم چند لمحوں کے لیے زندہ ہو کر اپنی یہ عزت افزائی دیکھ لیتے۔

جلوس آگے نکل گیا۔ ہری بول، ہری بول کی آوازیں مدھم مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کہاروں نے ادب سے پوچھا: ”صاحب کدھر جائے گا؟“

سرل پھر بڑے میں جا بیٹھا۔ ”جہاں چاہو چلو۔“

اس نے زندگی کی ہنگامہ خیزیاں دیکھی تھیں۔ موت کی گرم بازاری کا نظارہ کیا تھا، اس نے دنیا کے ہر رنگ کو ہر پہلو سے پرکھا تھا۔ انسان کس طرح جیتے تھے، کس طرح مرتے تھے، یہ گورکھ دھندا کیوں تھا؟ گہری ندیا اگم جل زور بہت ہے دھار۔ کھیوٹ سے پہلے ملو جو اترا چاہو پار۔ کھیوٹ کہاں تھا اور اس سے ملنے کی فرصت کسے تھی، مگر روح کا یہ غم کیسا تھا جو مدتوں سے کھائے جا رہا تھا۔ کسی دور، کسی حال میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زندگی سے اسے جتنی توقعات تھیں ان سے کہیں زیادہ مہربانی سے زندگی اس سے پیش آئی تھی مگر زندگی کو اس نے اپنی طرف سے کیا دیا تھا؟ اس نے گھبرا کر چاروں اور دیکھا: یہ پر رونق خوبصورت شہر، اس کی دولت اس کی آبادی، سب اس کے قدموں میں بکھری تھی، اسے چاروں طرف کے انسان اپنا منہ چڑاتے نظر آئے۔ چوراہے پر پہنچ کر کہاروں نے کندھا بدلنے کے لیے بوچہ زمین پر رکھا، سامنے ایک پر تگالی شراب خانہ تھا۔ ہنگلی کے برطانوی اور اطالوی ملاح دروازے پر بلز کر رہے تھے، اندر کوئی زور زور سے ہارپ بجا رہا

تھا۔ ایک عورت سر پر سیاہ جانی کارومال اوڑھے تیز تیز نظروں سے اسے گھورتی شراب خانے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

”ٹھہرو، یہیں رکو۔“ سرل نے چلا کر کہا روں سے کہا، انہوں نے بوچہ دوبارہ زمین پر دھردیا۔ سرل کو ذکر اس عورت کے پیچھے پیچھے دوڑا، وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کو کلکتے کے اس گھٹیا یورپین شراب خانے میں گھستا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک پیلی رنگت اور بچھی بچھی آنکھوں والا یورپین بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سرل کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مارے رعب کے اس کی زبان ہکا گئی۔ ”سر۔ سر۔“ اس کے آگے اس کی آواز حلق میں ڈوب کر رہ گئی۔

سرل خاموشی سے اسے دیکھا کیا۔ ساری دنیا کے شراب خانوں کے کاؤنٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے یہ ان کے مالک کس قدر پر اسرار لگتے تھے، ان سب کی بڑی خاموش برادری تھی۔ یہ آوارہ گردوں، چوروں، اچکوں، بد معاشوں اور طوائفوں کی اپنی مخصوص اس دنیا تھی۔

اتنے میں وہی عورت تیز تیز آواز میں بولتی تیزی سے قدم رکھتی ایک لکڑی کے زینے پر سے اتری، نیم تاریکی میں اس کے سفید دانت جھلملائے۔ اب دو برطانوی ملارج نل مچاتے اندر آچکے تھے اور ان کے ساتھ دو بے حد حسین یوریشین لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک لڑکی بہت زور زور سے تمچہ لگا رہی تھی۔

اس لڑکی کے چہرے پر سرل کو اپنی آنکھیں نظر آئیں، وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ ”کدھر جاتے ہو سرل صاحب۔“ اس عورت نے، جس کے پیچھے وہ اندر آیا تھا، یگانگت اس کے سامنے آ کر دروازے میں اس کا راستہ روکتے ہوئے استہزاء سے

کہا۔ اس کے بندے جھگورے کھا رہے تھے اور وہ خاصی بے تکی نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر اس نے بڑے اطمینان سے سرل کو گھورنا شروع کیا۔ ”سرل صاحب، اپنی لڑکی سے ملتے جاؤ، تم نے مجھے کلکتے بلایا تھا۔ میں پچیس سال سے تمہاری منتظر ہوں۔ میں اسے چار سال کا گود میں اٹھا کر یہاں لائی تھی مگر تمہارے چوبداروں نے مجھے آج تک تمہاری کوٹھی میں گھسنے ہی نہیں دیا، میں کیا کرتی۔۔ تم نے تو میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا، تم جاننا چاہتے تھے کہ ہم لوگوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہیں۔ دیکھ لو، اس طرح گزرتی ہیں۔

”سرل صاحب، تم تو بنگال گورنمنٹ کے بہت بڑے افسر ہو۔ کچھ میرے لیے روپیوں کا بندوبست کر دو۔ سنا ہے نیو غورتوں نے تم سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ میں تو پھر ایک حد تک تمہاری ہم قوم ہوں۔“

سرل پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، اسے محسوس ہوا ابھی اسے دل کا دورہ پڑے گا اور وہیں کھڑے کھڑے ختم ہو جائے گا۔ اسی وقت سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی گزری جس میں کلمتہ کرا نیکل کے چند صحافی بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر سرل کی جان ہی نکل گئی، اگر کسی طرح ان کو اس معاملے کی خبر ہوگئی تو کل تک یہ سارا واقعہ کلکتے بھر کی سوسائٹی میں مشہور ہوگا۔ ولایت تک بات پہنچے گی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اس کا چوبدار بھاگ کے اس کے پاس آیا: ”صاحب، آپ کا جی ماندہ ہے۔ چلئے۔“ پھر بوچے میں جا بیٹھا۔

عورت کمر پر ہاتھ رکھے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔

”حضور گھر چلے گا؟“ کہا روں نے پوچھا۔

گھر؟ اس کا گھر کہاں تھا؟ ”نہیں باغ والے بنگلے چلو۔“ اس نے غصے سے کہا۔ اپنے باغ میں پہنچ کر وہ سوچے گا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔
بوچہ آگے بڑھتا گیا۔

جلدی۔۔۔ جلدی۔ اس نے کہا روں کو ڈانٹا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا، یہ زندگی کا فانوس تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف رنگا رنگ تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے رفقہائے کار، فورڈولیم کالج کے منشی اور نثار، ایشیا ٹک سوسائٹی کے محقق، اودھ کے شعراء اور فن کار، حتیٰ کہ لکھنؤ کی چمپا بائی۔ یہ سب مل کر اس کی روح کے غم کو نہیں مٹا سکتے تھے۔
اس کی روح کے غم کیا تھے؟۔۔ عورتیں۔۔؟

ہرگز نہیں۔ عورتوں کے مسئلے نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کامیاب، مطمئن انسانوں کی زندگیوں میں ایک خاص خانہ ہوتا ہے جو صنفِ لطیف کے لیے وقف رہتا ہے۔ ان کی محبتیں، نا کامیاں، رومان، ازدواجی زندگی کی مسرتیں یا بے کیفیاں، یہ سب چیزیں اس لیبل کے تحت آتی ہیں جس پر ”عورتیں“ لکھا ہے۔ سرل ہیشلے، جس نے شاعر کی نظروں سے دنیا کو پہلی بار دیکھا تھا، اب شاعر کے بجائے ایک کامیاب انسان بن چکا تھا، اس کی روح کا دکھ یہ تھا کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔ اس ملک سے، جس نے اپنی ساری جمع پونجی اس کے قدموں میں ڈال دی۔ ان عورتوں سے، جنہوں نے وقت کے مختلف حصوں میں اسے چاہا۔ مدراس

کی ماریا ٹیریزا، ڈھاکی شوری کی شنیلا اور بہت سی عورتیں جو اس کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر اس پر نچھاور ہوئیں۔ سرل ایشلے نے دنیا سے سب کچھ حاصل کر لیا لیکن اس کے بدلے میں دنیا کو کچھ دیا نہیں، یہ بڑی بد نصیبی کی بات تھی، اگر اس کے عہد میں مذہب کا چرچا ہوتا تو شاید وہ خدا میں پناہ ڈھونڈتا لیکن دنیا عقلیت پرستی اور سائنس اور مادیت کی طرف جا رہی تھی۔ بنک آف انگلینڈ چرچ آف انگلینڈ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ زندگی کے معنی تھے اور زیادہ سرمایہ اور زیادہ تجارت، حکومت اور زیادہ ترقی اور اقتدار۔ اپنے گارڈن ہاؤس میں پہنچ کر اس نے اس ہفتے کی ڈاک دیکھی، کچھ دیر سوچا پھر پیچوان کے کش لگانے کے بعد دوبارہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ دل کی ویرانیاں بھی تھیں مگر فرض اسے پکار رہا تھا کہ دنیا کے ضلعے میں جا کر باغی کسانوں کی سہولت کرے۔ قانون اور انصاف کا تقاضا تھا کہ ان باغیوں کو سخت ترین سزائیں دی جائیں، گودل کی ویرانی کہتی تھی مکھنؤ چلو، وہاں دربار کی رنگینیوں میں سارے غم دھل جائیں گے۔

کوٹ پہن کر وہ پھر بوچے پر سوار ہوا اور چورنگی کی طرف لوٹا، جدھر اس کا دفتر تھا۔

نوجوان بنگالی کلرک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اب تک فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ تھنگھریا لے بال اس کے ماتھے پر آن گرے تھے۔ میز پر چاروں طرف

میا لے کاغذات کا انبار تھا۔ باہر برآمدے میں اڑیہ قلی لڑکا اونگھتا جاتا تھا اور پٹکھے کی ڈور کھینچ رہا تھا۔ سرل کو دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور پٹکھا زیادہ تیزی سے کھینچنے لگا۔

”گڈ آفٹرنون سر۔“ نو جوان نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بڑے رساں سے کہا۔

”گڈ آفٹرنون۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”گوتم نیلمبر دت سر۔“

”میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”میں کل ہی پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے دفتر سے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔“

”کب سے کام کر رہے ہو؟ ابھی تو لڑکے ہی معلوم ہوتے ہو۔“ سرل نے

دلچسپی سے پوچھا، اس کا نیو لوگوں سے یہ دوستانہ انداز ایک زمانے میں کارنوالس

کو بہت کھلا کرتا تھا کیونکہ جب سے جان کمپنی کو سیاسی اقتدار ملا تھا کارنوالس نے

پالیسی تبدیل کر دی تھی۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہندوستانی محکوم۔ انہیں کسی

حالت میں بھی نیو لوگوں سے برابری کا برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔ ہسٹن بہادر، وارن

ہیسنگو کے زمانے خواب و خیال ہو چکے تھے۔ کارنوالس کے عہد سے انگریز اور نیو

کے درمیان سماجی خلج وسیع ہوتی جا رہی تھی مگر سرل اولڈ سکول کا ’نواب‘ تھا۔ اسی

طرح شاعروں سے ملتا۔ بحرے سنتا۔ اودھ ریڈیٹسی میں رہ کر اس پر ہندوستانییت

کا رنگ اور بھی گہرا ہو چکا تھا، اسے کارنوالس یاد آیا۔ گڈ اولڈ کارنوالس جو غازی

پور پہنچ کر بیٹھے کا شکار ہو گیا، اب تو اس کی ہڈیاں بھی قبر میں گل گئی ہوں گی۔ اسے

موت کے احساس نے پھر گھبرا دیا، اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں
اور پھر بنگالی کلرک پر نظر ڈالی۔ ”تم نے کہاں پڑھا ہے؟“

”سنسکرت کالج بنارس اور یہاں“ اس نے جواب دیا، ”کلمتہ کالج میں
ایف۔ اے تک پڑھا ہے، اب بی۔ اے کرنا چاہتا ہوں۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے“ سرل نے واقعتاً خوش ہو کر کہا۔ ”دفتر کے بعد بھی
مجھ سے ملتے رہا کرو۔“ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نیلمبروت کو پھر بلایا۔

”سفر کرنا پسند ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کبھی شاہ اودھ کی عملداری میں گئے ہو؟“

”میں بنارس سے آگے کبھی نہیں گیا۔“

”اب جاؤ گے۔؟ چند ضروری کاغذات ہیں، تمہارے ساتھ مسلح دستہ جائے
گا، میں خود نہیں جا سکتا کیونکہ مجھے اضلاع کا دورہ کرنا ہے۔ گھر جا کر سامان
باندھو۔ کلپیش سے کہو جہاز میں تمہارے لیے کیبن کا بندوبست کر دے۔“

”یس سر۔ تھینک یوسر۔“ وہ اٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر
کاغذات پر جھک گیا۔ سرل اسے بڑی محبت سے دیکھا کیا۔ انسانوں کو پہچاننے،
ان کی روح کے اندر جھانکنے کی اس نے اس سے پہلے کوشش کیوں نہیں کی تھی؟

جہاز نے، جو کلکتے سے بنارس جاتا تھا، ابھی لنگر نہیں اٹھایا تھا۔ بارشوں کا موسم
آچکا تھا اور عموماً اور پٹنے تک گنگا کی موجیں ہلاکت خیز تھیں۔ گوتم نیلمبر سامان

سفر درست کرنے کے بعد اب بادلوں کے چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کا چھوٹا سا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی سب راج شاہی میں رہتے تھے اور بھیتی کرتے تھے۔

اس سے شام ہو چکی تھی۔ آنگن کے کونوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ گلیوں میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی، وہ اپنے کمرے کے برآمدے میں، جس کی سیڑھیاں گلی میں اترتی تھیں، چٹائی بچھائے الٹین جلانے ایک موٹی سی انگریزی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اور بار بار ڈکشنری دیکھتا جاتا تھا، اتنے میں آہٹ ہوئی اور اس نے سفید ساری میں لپٹی ایک چالیس سالہ عورت سامنے کھڑی دیکھی، وہ جلدی سے اٹھا اور نمسکار کرنے کے بعد اس سے پوچھا:

”کیا بات ہے ماں؟ کس سے ملنا چاہتی ہو؟“

”تم ہی سے۔“

”مجھ سے؟“

”ہاں۔ تم سرل صاحب کے کلرک نہیں ہو؟“

”ہاں ہوں تو۔“

”میں شنیدا ہوں۔“

”شنیدا۔ ماں؟“ اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ ”تمہاری کیا سیوا کروں؟“

”میں۔ میں سرل صاحب کی بیوی ہوں۔“

”اچھا؟“ اسے یاد آیا دفتر میں اسے کسی نے بتایا تھا کہ سرل صاحب کے

زمانہ خانے میں برسوں سے ایک ہندو عورت رہتی تھی جس کو کچھ عرصے سے انہوں

نے علیحدہ کر دیا تھا اور اس کے لیے دوسرا مکان لے رکھا تھا۔

”تم کو صاحب بہت مانتے ہیں، میرا ایک کام کرو گے، تم لکھنؤ جا رہے ہو نا؟“

”ہاں۔ ماں۔“

”تم نے چمپا بائی کا نام سنا ہے؟“

”چمپا بائی۔ وہ کون ہے؟“

”لکھنؤ کی بڑی مشہور طوائف ہے۔ صاحب جب بھی لکھنؤ جاتے ہیں اس پر ہزاروں خرچتے ہیں، میری اب بات بھی نہیں پوچھتے۔ میرا اب دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک بوڑھا باپ تھا وہ بھی مر گیا۔ بھائی اپنے کاروبار میں لگے ہیں۔ بھانجہ اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے۔“ جاؤ اپنے فرنگی کے پاس۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میری ایک لڑکی بھی ہے، وہ دس سال کی ہوئی تو اسے صاحب نے اپنی بہن کے پاس بھیج دیا، وہ ولایت سے لوٹ کر آئی ہے تو مجھے پہچانتی بھی نہیں۔ اسے لوگوں کو بتاتے شرم آتی ہے کہ اس کی ماں کا لی عورت ہے۔“

نیلمبر کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ صاحب کی ایک لڑکی بھی ہے۔ ”تمہاری بیٹی کا کیا نام ہے؟“

”مارگریٹ اجابل، پر میں اسے نیلا پکارتی تھی۔“

”تم عیسائی ہو گئی ہو؟“

”نہیں، مگر نیلا ہمارے دھرم کو بہت برا سمجھتی ہے۔ تم چمپا سے کہو وہ صاحب کا خیال چھوڑ دے، تم لکھنؤ سے آ کر مجھ سے ملو گے نا، تم مجھے بتاؤ گے تم نے چمپا سے

کیا کہا؟“

”میں تم سے ضرور ملوں گا ماں۔“ گوتم نیلمبر نے کہا، پھر وہ اسے پہنچانے کے لیے گلی میں اتر آیا۔ ”تمہاری پالکی کدھر ہے؟“

”میں پیدل آئی تھی، تم میری فکر نہ کرو۔“ گلی کے اندھیارے میں اس کی سفید ساری کچھ دیر تک جھلملاتی رہی پھر وہ موڑ پر پہنچ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ گوتم نیلمبر برآمدے میں واپس آ کر دوبارہ اپنی ڈکشنری پر جھک گیا۔

۳۰

لکھنؤ کے رومی دروازے میں پہرہ دن چڑھے کی نوبت بجنے والی تھی۔ ہیل گاڑیاں اور شکر میں چرخ چوں کرتی دیہات کی طرف سے شہر کے ناکوں میں داخل ہو رہی تھیں، ان ہیل گاڑیوں پر ترکاریاں اور پھل لدے تھے اور مسافر سوار تھے۔ چوک اور نحاس میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ امراء کے محلات کے پائیں باغ صاف کیے جا رہے تھے۔ ملازمین باقی پھولوں کے گلہ سٹے اور کچرے سمیٹ رہے تھے۔ مہریاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سڑکوں کے کنارے سائقوں اور تہنوں نے اپنی اپنی دکانوں کی آرائش شروع کر دی تھی۔ لوگ آتے تھے، دو گھڑی ہنس بول کر، زردہ کھا کر یا حقے کے دوکش لگا کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف آگے بڑھ جاتے تھے۔ میدان میں نجیسیوں کی پلٹنیں قواعد کر رہی تھیں۔ تلنگے، جھلنگے، حبشی سپاہی، راجپوت عہدے دار، محلات شاہی کے پہرے پر مستعد

کھڑے تھے۔ رمنا کے جنگلوں میں چڑیاں چھپا رہی تھیں۔ گومتی کے کنارے کشتیاں بندھی کھڑی تھیں، ابھی بحروں کے چلنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ساحل دریا پر بنی ہوئی کوٹھیوں کا عکس شفاف پانی میں جھلما رہا تھا۔ ساون کے اودے بادلوں اور آس پائے کے سبزے کی وجہ سے گومتی بھی سبزہ رنگ ہو رہی تھی۔ حیات بخش، ٹیڑھی کوٹھی، کنکر والی کوٹھی، سنگھاڑے والی کوٹھی، خورشید منزل، سب جگہوں پر بادل جھک آئے تھے۔ باغوں میں پکا لگ گیا تھا۔ کنجوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ لکھنؤ ساون منانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

پھر دوپہر کی نوبت بجی طعام خانوں کی رونق دو بالا ہوئی۔ بھلیا رنیں مصروف ہوئیں۔ لوگ اپنے اپنے کارخانوں سے کھانا کھانے کے لیے نکلے۔ دیوان خانوں میں دسترخوان بچھے۔ بیگمات نے خس کی ٹیوں کے پیچھے جوہر کی بساطیں بچھائیں۔ مہریاں اور خواصیں پاندان کھول کر بیٹھیں۔ لڑکیاں بالیاں چڑیاں رنگنے میں مصروف ہوئیں۔ کڑھائیاں چڑھانی گئیں۔ سہ پہر کی نوبت بجی، دن ڈھانا شروع ہوا۔ دلفریب باغات میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ رمنا میں پلے ہوئے جنگلی جانور چنگھاڑتے پھرے اور ہرن کلیں بھرا کیے۔ چڑیا جھیل پر بادل جھک آئے تھے۔ موتی محل پر بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں برس گئیں۔

چوتھا پہر آیا۔ سورج ڈوبنے لگا۔ ہواؤں میں خوشبوئیں امنڈ آئیں۔ شام اودھ اپنی پوری آب و تاب سے بزم آراء ہوئی۔ سارے شہر کو رنگا رنگ کی خوشبوؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چھڑکاؤ کی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو، گندھیوں کی دکانوں کی مہک، قنوج کے نیلے اور جوہور کے گلابوں کی خوشبو،

مندروں میں سے اٹھتے ہوئے عود کی لپٹ۔ بادشاہ کے محل میں بہتی ہوئی عطر کی نہر کی خوشبو، پھر گلی کو چوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے، لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آ گئے۔ انہوں نے باغوں کا رخ کیا۔ گلی کو چوں میں سے نغمے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ خوش شکل اور خوش لباس کنجڑ نہیں، تیز و طرار تنبولیں، حسین اور حاضر جواب بھیا رنیں ساون اور لاونیاں گاتی پھر رہی تھیں۔ گلی کے لڑکے بیت بازی کرتے جاتے تھے اور گولیاں کھیلنے تھے۔ غریبوں اور امیروں کے مکانوں سے ستار اور جل ترنگ اور طنبو ۳۳ رے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ندی کنارے بیٹھے ہوئے جوگی تری جاتے تھے۔ نئی بیابی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی سڑک کی اور دیکھتی تھیں کہ ساون منانے کے لیے ان کا بھائی میکے سے ڈولی کب نیچے گا۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے۔ پچیاں پکوان بنا رہی تھیں، ہر شخص مسرور تھا۔

لوگو! خوش ہو لو کہ دنیا فانی ہے، جانے کتنے دن کا چین تمہارے نصیبوں میں لکھا ہے۔ آپس میں ہنس بول لو، غنیمت جان لو کہ یہاں دو چار ہم جنس مل بیٹھے ہیں۔ کل کیا جانے کیا ہو۔ کوچ نگار سانس کا باجست ہے دن رین۔ باقی صرف خدا رہے گا جو کہیں بہت دور بیٹھا اس لیا! کا تماشا کرتا ہے وہ خدا جو صوفیوں کا ہے اور فرنگی محل کے مولویوں کا اور بالانا تھ کے جوگیوں کا اور وہ کسی سے بھی اپنی انگلی اٹھا کر کہہ سکتا ہے: بس، اب ختم کیا جائے۔

اے حقیر اور بے بس اور مضحکہ خیز انسانو! تم سب ایک مکڑی کے غیر مرنی جال میں گرفتار ہو چکے ہو، مکڑی کو تم پہچانتے نہیں ہو کیونکہ تمہارا جال غیر مرنی ہے۔

کب تک تمہاری یہ مسرت رہے گی، بے چارے لوگو! مسرت بڑی عظیم چیز

ہے۔ دوسروں سے ان کی مسرت نہ چھیننا۔

یہ لوگ جوان سرکوں پر چل رہے ہیں، گارہے ہیں، خوش ہیں، انہوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ یہ باوقار، بانفاست، باوضع، پر امن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ جوان باغوں میں جمع ہیں بڑے اہم لوگ ہیں کیونکہ یہ ایک بڑی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے فرانس کی مانند انہوں نے جیسے کے فن کو اعلیٰ ترین بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ یہ نام، یہ صورتیں بڑی اہم ہیں، جب کوئی ان کا نام لیتا ہے تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ شجاع الدولہ، بہو بیگم، مینی بہادر، ٹکیٹ رائے اور اوڈھ کے یہ مرنجان مرنج باشندے جو ہزاروں سال سے گھاگرا اور گومتی کے کنارے رہتے آئے ہیں۔ رام چندر کے زمانے میں بھی یہی لوگ تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں بھی یہ لوگ زندہ تھے۔ یہ کسان اور جوگی۔ دریا کے کنارے وہ مانگا گوسائیں دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شجاع الدولہ کی فوج میں شامل ہو کر بکسر میں انگریزوں سے لڑا تھا۔ یہ پر امن کسان اپنا ملک بچانے کے لیے نواب کے سپاہیوں کی حیثیت سے مرہٹوں سے لکر لیتے تھے۔ یہ مرنجان مرنج ملوا ہے اور گوالے عظیم آباد تک پہنچ کر انگریزوں سے بھڑ گئے تھے، امن نہیں تھا۔ سندھیا کی فوج نے انکا پار کا علاقہ تباہ کر رکھا تھا۔

الہ آباد میں کلائیو ڈرنہیل پر شاہ عالم کا تخت بن چکا تھا۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ کی زبردست فوج سے گھبرا کر عہد نامہ کیا تھا کہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھیں گے مگر حسب معمول وہ اس وعدے سے پھر چکے تھے اور جب فیض آباد کا شجاع الدولہ مرا اس کو صدمہ تھا کہ انگریزوں کو ملک

سے نکال نہ سکا۔ شجاع الدولہ جو مہاجی سندھیا کا پگڑی بدل بھائی بنا تھا۔ یہ نام اس داستان کے ہیں۔ داستان صبح ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے فن داستان گوئی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے کہ خود بھی یہ قصہ سناتے سناتے قصے میں تبدیل ہو جائیں گے۔

ان کا قصہ مضحکہ خیز ہے!

لکھنؤ پر یوں کے شہر کی طرح جگمگا رہا ہے۔ یہ مانوس گلیاں، سڑکیں، محلے، گنج، کٹرے، باغ، ٹاکے، بارونق، آباد، بھرے پرے۔ یہ قلعہ چھٹی بھون ہے۔ یہ معالی خان کی سرائے ہے۔ یہ آصف الدولہ کے جان نثار راجہ جھاؤ لال کا پل ہے۔

ڈراٹھرو، آصف الدولہ۔۔ یہ کس کا نام لیا کہ دل کے سارے تار جھنجھٹا اٹھے، وہی آصف الدولہ جس کا نام لے کر ہندو دکان دار صبح کو اپنی دکانیں بولتے ہیں؟ جس کو نہ دے مولا۔ اس کو دے آصف الدولہ، جو کہتا تھا ”جہاں میں جہاں تک جگہ پائیے، عمارت بناتے چلے جائیے۔“ جس نے قحط سالی کے زمانے میں پر جا کوروزی مہیا کرنے کے لیے امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں رات کو مشعلوں کی روشنی میں کام ہوتا تھا کہ شرفاء، کوٹھی ڈھوتے اور اینٹیں چنتے شرم نہ آئے۔ دیا لو، نئی، دیوتا سمان آصف جس نے باغات، بارہ دریاں، شیش محل اور ہاتھی دانت کے بنگلے بنواڈالے جو غریبوں اور اہل کمال کی پرورش اور قدر کے لیے نئی تجویزیں دماغ سے اتارتا تھا۔ جری شجاع الدولہ کا تختی بیٹا آصف۔ اس کے فرانسیسی جنرل کاڈ مارٹن کے قلعے کو غیشیا کے باغ میں بہار کے سارے پھول کھلے ہیں۔ فرح بخش

کوٹھی کے نیچے سے ندی سبک خرا می سے بہہ رہی ہے۔ طعام خانے کے دریچوں کے نیچے سے کشتیاں گزر رہی ہیں۔ برسات میں کوٹھی کی پٹلی منزلیں تدا آب ہو جاتی ہیں تو جزل اوپر کی منزلوں میں چلا جاتا ہے۔ فرانسیسی معماروں کی بنائی ہوئی کوٹھیوں میں جھاڑ فافوس سجے ہیں۔ پیانور کھے ہیں۔ ولایتی فرنیچر جھل جھل کر رہا ہے۔

یہ شہر ایودھیا اور بنارس کی قدیم موسیقی کا محافظ ہے۔ یہاں کی بھیروی سارے ملک میں مشہور ہے۔ یہاں محرم کے زمانے میں بہاگ اور پیلو اور سوسنی گھل جاتی ہے۔ بیگمات کے محلوں کی چہار دیواری میں لے دار اور گگے باز ڈونڈیاں سال بھر جشن موسیقی مناتی رہتی ہیں۔ چوک کے کمرے اور مضامات کے باغ اور بارہ دریاں با مال ڈیرے دار طوائفوں کی تانوں سے گونجتی ہیں۔ چاندنی راتوں میں کھار اور مزدور منڈیروں پر بیٹھ کر برہا گاتے ہیں۔ برج کے رہس دھاری راس لیا کا سوانگ رچاتے ہیں۔ برہمن رتاقص ایک گھنگرو بجا کر مانج رہے ہیں اور آس پاس سارے میں موت کا گھنگرو بج رہا ہے۔ پچھلے ستر اسی سال سے یہ ناک فیض آباد اور لکھنؤ کے رنگ بھوم پر کھیلا جا رہا ہے۔ ان کرداروں کی اہمیت باہر والے نہیں سمجھ سکتے۔ ان سب نے مل کر اس دنیا کی تخلیق کی ہے جو اووہ کے باشندوں ہندو و مسلمانوں کی اپنی دنیا ہے۔ یہ لوگ کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں، ان جیسے نام اور کہیں نہ ہوں گے۔ ان کی جیسی زبان، مذاق، لباس۔ یہ لوگ، غریب امیر عورت مرد، جوٹھا کر امام بخش اور الالہ حسین بخش، مرزا میندھو اور نواب کمن کہلاتے ہیں اور اما من مہری اور مرزا جنگلی اور سکھ بچن لونڈی اور

نواب ہشتی بیگم، یہ سب روتے ہیں، ہنستے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، لڑتے ہیں۔ شجاعت ان کا شیوہ ہے، آن پر جان دینا۔ شرافت، احسان مندی، وفاداری، نیکی۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ سماج کی جتنی اچھائیاں اور جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ سب ان میں موجود ہیں، اسی لیے یہ لوگ بڑے جذباتی ہیں۔ بتاٹے اور کوڑی پرنا چنے والے رقص، کشمیری بھانڈ، جل ترنگیے، بین کار، باچی برہمن، چلی، شاعر، مرثیہ گو، داستان گو، کالیستھ، فوجی، بانکے، چنڈو باز، بھگت باز، نقال، بہروپے، عالم، فاضل، کلاؤنٹ، یہاں رزم و بزم ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ یہ اصل روانی معاشرہ ہے۔

لکھنؤ سے ستر میل کے فاصلے پر بنگلہ فیض آباد ہے۔ رام کا شہر ایودھیا جسے شجاع الدولہ نے دلی کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ جہاں گلاب باڑی ہے اور گھاگرا کے گھاٹ اور بڑے مغلوں کے زمانے کی مساجد۔ دلی میں اب بچارے چھوٹے چھوٹے مغل بیٹھے ہیں۔ یہ مضحکہ خیز چھوٹے مغل بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کو سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔

دلی کا ایک شہزادہ لکھنؤ میں پڑا ہے۔ بنارس میں پناہ گزین ہے۔ اودھ دربار سے اس کو دوا کھ سالانہ وظیفہ دیا جاتا ہے، یہ امیر تیمور صاحبقران کی اولاد ہے۔

اور ایرانی شیعوں کی اولاد اس سے اودھ پوری میں ڈگ وچے رام چندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے اور اس نے اپنی اس زبردست وراثت کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بادشاہت ہندوؤں کے لیے ان کی قومی ریاست کے مترادف ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا اختلاف کوئی نہیں جانتا کیونکہ گڑھی کا ٹھا کر اور محل کا نواب دونوں

جاگیردارانہ اقدار کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور ان کی پر جا، جس میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں، ان کے سپاہیوں کی لانچوں سے یکساں بٹی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ایک ہیں۔

مذہبی تفریق کو پر جا کا خالص ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ محرم میں بلوے نہیں ہوتے نہ مسجدوں کے سامنے باجہ بجایا جاتا ہے۔ ہندو تعزیہ داری کرتے ہیں اور مسلمان دیوالی مناتے ہیں کیسا الٹا زمانہ ہے۔ نواب بہو بیگم ہر سال ہولی منانے فیض آباد سے اپنے بیٹے کے پاس لکھنؤ آتی ہیں۔ ساری سلطنت میں ہندو راجاؤں نے مسجدیں اور امام باڑے بنوا رکھے ہیں۔ لکھنؤ سے اسی میل کے فاصلے پر بہرائچ ہے جسے ہزاروں برس پہلے شراوہتی کہتے تھے۔ جہاں سالار مسعود غازی کی درگاہ ہے۔

ہر سال بڑی دھوم دھام سے ہندو مسلمان مل کر ان کی بارات نکالتے ہیں۔ جیٹھ مہینے میں ان کا میلہ لگتا ہے۔ سرخ نیزے اور جھنڈے اٹھائے ڈنکی بجاتے ہزاروں ہندو مسلمان دیہاتوں سے ان کے مزار کا رخ کرتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان صوفی ستیہ پیر کی مانند جو ستیہ نرائن بن چکے ہیں۔ بت شکن سالار مسعود عرف بالے میاں نے اودھ کے ہندوؤں کے لیے بالنا تھ کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے مقبرے کے قریب کا اگن کندُ بالا رکھ کی دھونی کہا جاتا ہے۔ درگاہ کی نذر مجاور اور پوجا کے محاصل پنڈے حاصل کرتے ہیں۔ پنڈوں اور مجاوروں میں آپس میں اس آمدنی کی تقسیم کے متعلق معاہدہ ہے۔ سرلہ شیلے کے دوست بشپ، بہر اور ان کے ساتھی، جو آج کل اس ملک میں چاروں اور گھوم کر اپنے سیاحت

نامے قلمبند کر رہے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس ملک کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے اور ویسٹ منسٹر میں ہماری حکومت کو چاہیے کہ ان وحشیوں کو اپنے جہالت اور تعصب سے نجات دلانے کے لیے جلد از جلد مزید انجیلیں اور مزید بندوبستیں بھیجے۔

لکھنؤ کے باسیوں کو خبر نہیں کہ ان بے چاروں کے لیے بندوبستوں سے لہو ہونے جہاز کلکتے کی اور آ رہے ہیں۔ آغا میر شاہ زمن کے وزیر اعظم ہیں۔ مسیتا بیگ کوتوال شہر کا حاکم ہے جس نے عہد سعادت علی خان کے دھومی بیگ کوتوال کی انصاف اور امن پروری کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ شہر میں مکمل سکون ہے۔ مشہور ڈاکو محرم منانے کے لیے عارضی طور پر رہا کیے جاتے ہیں اور پھر جیل میں خود واپس آ جاتے ہیں۔ بانکے مفسدوں کی سرزنش کے لیے موجود ہیں۔ ہوا میں اشرفیاں اچھالتے چلے جائیں کوئی نہ پوچھے گا۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ ہیں، ایک کی بیٹی سارے محلے کی بیٹی سمجھی جاتی ہے۔ وضع داری اور شرافت پر جان دینے کا عام رواج ہے۔

یہ ابوالمظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر کا وارا سلطنت ہے جن کی شادی میں روپیوں یا اشرفیوں کے بجائے ہاتھیوں پر سے ہیرے جواہرات کی بوچھاڑ کی گئی تھی جن کو لوٹ کر غریب غربا دولت مند ہو گئے تھے، ان کے حرم سرا میں فرنگی کرنل ایش کی بیٹی مبارک محل براہمتی ہے۔ ان کی بیٹی کی شادی بنگالے کے قاسم علی خاں کے لڑکے سے ہوئی ہے۔

اک ذرا ٹھہرنا۔ کون قاسم علی خاں۔ بنگالے کا آخری خود مختار نواب، وہ سید

زاوہ جو اپنی شکست کے بعد دلی جا کر جلاوطنی کے اس عالم میں مرا کہ اس کی شال
فروخت کر کے اس کی تجھیر و تکھین کی گئی۔

یہ شاہ زمن کا دارالسلطنت ہے۔ شاہ زمن نے گومتی کے کنارے امام باڑہ
نحف اشرف تعمیر کرایا ہے۔ محرم میں اس میں چھ انٹاں کیا جاتا ہے تو لگتا ہے ظلم
ہو شرابا کا ایک منظر ہے۔

بازاروں میں کھوے سے کھواچھل رہا ہے۔ سودے والے اپنی اپنی شاعرانہ
صدائیں لگا رہے ہیں۔ دکانوں میں دنیا جہان کا مال فروخت ہو رہا ہے۔ سعادت
علی خاں کے عہد کی بنی ہوئی عمارتوں میں قہقہے گونج رہے ہیں، ان خوبصورت
عمارتوں کی آرائش دیکھ کر جی بھرتا ہے۔ اتنی خوبصورتی اور نفاست پائدار ہو سکتی
ہے!

حسن پانڈا نہیں ہوتا۔ شاکیہ منی گوتم سدھارتھ نے ایک مرتبہ کاشی کے ہرنوں
کے باغ میں کہا تھا۔ ہر شے فنا ہے، فنا سے بچو، دکھ سے بچو، سائے سے بچو اور وید
انت میں لکھا ہے کہ مایا کی مثال ایسی ہے گویا بانجھ عورت کا لڑکا سراب کے پانیوں
میں نہانے کے بعد آسمان پر اگے ہوئے پھول پہن کر ہرن کے سینگوں سے بنی
آسمان ہاتھ میں لیے باہر نکلے۔ مت بھولو کہ رام چندر کے ایودھیا اور پرسن جیت
کے شراوتی اور چندر گپت کے پاٹلی پتر اور کالی داس کے اجین اور حسین شرقی کے
جونپور اور علاء الدین حسین کے گوڑ میں بھی زندگی کا حسن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور
مت بھولو کہ ہر حسن میں موت پوشیدہ ہے۔

سڑک پر سے ایک سکھ پال گزر رہی ہے جس کے گنبد پر سنہری کلس سجا ہے اور

شوخی و شنگ مہری جس کا چھٹکا پکڑے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔ کہاؤں کی
وردیاں سرخ رنگ کی ہیں اور ان کی سرخ گڈیوں پر مچھلی کے طلائی نشان بنے
ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ والی لٹھیاں ہیں۔ راہ گیروں کی نظریں
اس سکھ پال پر جمی ہیں، یہ اپنے وقت کی حسین ترین لڑکی چمپا کی سکھ پال ہے۔

وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

وقت اور حسن اور موت۔

باغوں میں میلے ہو رہے ہیں۔ مرغیوں اور بٹیروں اور مینڈھوں اور ہاتھیوں کی
لڑائیاں منعقد کی جا رہی ہیں۔ انگریز ریڈیڈنٹ بادشاہ کے ساتھ بریک فاسٹ
کھاتا جاتا ہے اور سامنے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔ برآمدے میں انگریزی بینڈ
بج رہا ہے، مشاعرے ہو رہے ہیں۔ دربار میں یکتاے روزگار رقص پر کاش جی
کتھک ناچ رہا ہے۔ شوالوں میں بھوانی کی پوجا ہو رہی ہے۔ آم کے کنجوں میں
ملہاراڑ رہا ہے۔ شمشان گھاٹ پر وہ جو اس ہنگامے سے نکل گئے ہیں پھونکے جا
رہے ہیں۔ نحاس میں داستان طرازوں نے اپنی محفلیں آراستہ کر رکھی ہیں۔ علماء
اور حکماء کی مجلسوں میں مباحثے جاری ہیں۔ بھنگڑیے سبزی گھوٹنے میں مجو ہیں۔ سر
سنگھار اور بخیرے اور پکھاوج کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔
قبرستانوں میں قبریں کھودی جا رہی ہیں۔

فنا۔ فنا۔ ہر شے فنا ہے۔

وقت فنا میں شامل ہے۔

وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا

ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔

اب رومی دروازے میں مغرب کی نوبت بگے گی۔

چار پہر دن گزر چکا ہے۔ چار پہر رات گزر جائے گی، ہر پہر میں آٹھ گھڑیاں ہیں، ہر آٹھویں گھڑی پر کجر بجاتا ہے۔ انسانوں کا جلوس اپنی اپنی قبروں میں اتر رہا ہے۔

وقت موت ہے۔

۳۱

عہد آصفی کے بنے ہوئے رومی دروازے کی نوبت کی آواز گوتم نیلمبر کے کانوں تک پہنچی، اس وقت اس کی شکرم شہر کے نا کے میں داخل ہو رہی تھی۔ نا کے پر اس نے سپاہی کو اپنا پروانہ راہداری دکھلایا۔ بادشاہ اودھ کے سپاہی نے پوچھا: ”قبلہ کہاں سے تشریف لاتے ہیں“ اس نے بتایا: ”کلکتے سے الہ آباد کے بنی گھاٹ تک جہاز پر آیا تھا، وہاں سے اسٹیج کوچ اور شکرم پر بیٹھا بارش سے بھیلتا چلا آتا ہوں۔“

”کہاں کا قصد ہے قبلہ؟“

”ریڈیوسی۔“

سپاہی نے ایک لمبے کے لیے اسے غور سے دیکھا۔ ”فرنگی سرکار سے جناب کا سلسلہ ہے؟“

”ہاں“ اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

”ہاں میاں“ رام دین دوسرے سپاہی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا، ”خدا کسی نہ کسی وسیلے سے رازق ہوتا ہے ہرنگی کی سرکاری تھی۔“

اس کے بعد رام دین نے پہلے سپاہی کو ایک باموقع شعر سنایا اور گوتم نیلمبر کو داد طلب نکاہوں سے دیکھا۔ گوتم نیلمبر نے بچپن میں فارسی ضرور پڑھی تھی مگر ان لوگوں کی ٹکسالی اردو اس کے پلے نہ پڑی، یہ اس نے پہلی بار دیکھا کہ ملک میں ابھی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں نیو بادشاہ اب تک حکومت کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ شکرا آگے بڑھی۔

یہ شہر کے مضافات تھے۔ سڑک کے کنارے چند ابیر بھوبھل میں بھوری لگا رہے تھے۔ کہا رجا من کے نیچے بیٹھے ستو گھولتے تھے۔ چھکڑوں پر منوں آم لدے چلے جاتے تھے۔ ایک پتیل کے نیچے لکڑ سلگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا جوگی دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ پیچھے بھوانی کا مٹھ تھا۔ نیلمبر نے غیر شعوری طور پر مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی کالی ماں کو پردیس میں دیکھ کر اسے بڑی تقویت ہوئی۔ ریڈیڈنسی نواب سعادت علی خان مرحوم کی ایک اطالوی طرز کی کوٹھی تھی جسے فرنگیوں نے خرید لیا تھا، وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ صاحب نواب مال رضا بہادر کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کی آمد کی اطلاع اودھ سرکار کے سر رشتہ اخبار کو بھجوا دی گئی۔ دوسرا ہرکارہ گولہ گنج میں نواب مال رضا بہادر کے مکان پر پہنچا۔

نواب ابوالنصو رمال الدین علی رضا بہادر نصرت جنگ (جو دراصل چوہیس

سالہ نواب کمسن کا وہ نام تھا جو شخص شاہی اور ریڈیٹسی کی تقریبات پر لیا جاتا تھا) کھانے کے بعد ریڈیٹنٹ کے ساتھ بیٹھے چوسر کھیتے تھے۔ یہ شہر کے ایک بہت بڑے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مرشد آباد اور لکھنؤ کے شاہی خاندانوں سے ان کی قرابت داری تھی، کافی بڑا تعلقہ کلیان پور میں تھا۔ خوش شکل تھے اور خوش آواز۔ مرثیہ خوانی پوری راگ داری سے کرتے تھے اور میرانیس کے ساتھ ساتھ مجلسیں پڑھتے تھے۔ شہر کی طوائفیں ان پر عاشق تھیں۔ شاعر تھے اور دیوان مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ شادی سولہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی، اب تک متعدد خانہ زاد لونڈیوں سے متع کر چکے تھے۔ ان دنوں چپا جان پر لٹو ہو رہے تھے، مگر اب معلوم یہ ہوتا تھا کہ کلکتے والے سرل صاحب کی طرح یہ ریڈیٹنٹ صاحب بھی اس کے رقیب بننے پر تلے بیٹھے تھے۔ انہی خیالات میں غلطیاں و بیچاں وہ چوسر کی چال بھی سوچ رہے تھے کہ چوہدار نے آ کر اطلاع دی کہ ایک بنگالی بابو کلکتہ گورنمنٹ سے کاغذات لے کر آئے ہیں۔ بلی گارو میں باریابی کے منتظر ہیں۔

رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ برآمدے میں جلتی رنگ بج رہی تھی، ابھی چپا آنے والی تھی۔ ریڈیٹنٹ کو بڑا غصہ آیا۔ جب سے لارڈ ایم ہرسٹ کلکتے میں گورنر جنرل ہو کر آیا تھا اس نے اپنے انتظامات اور مستعدی سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اچھی خاصی ڈاک بٹھا دی تھی، ہر دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی پیغامبر کلکتے سے یہاں پہنچتا رہتا تھا۔ دل چپا کے ناچ میں پڑا تھا مگر برطانوی حکومت کی وفاداری اور فرض کے عظیم تصورات نے چپا کے خوش آنند ہیولے کو دھندا دیا۔ ریڈیٹنٹ صاحب فوراً بلی گارو لوٹ گئے۔

”یہاں چمپا بانی کہاں رہتی ہیں؟“ دوسرے روز گوتم نیلمبر نے ریڈیو ٹی وی کے ایک منشی سے دریافت کیا۔ ہری شنکر زریب مسکرایا۔ یہ بنگالی بابو بھی اہل دل معلوم پڑتے ہیں، بھئی واہ ہم جانتے تھے یہ بیٹھے لکھا پڑھی ہی کرتے رہیں گے۔

”کیا آپ بی چمپا صاحب کے یہاں تشریف لے جائیں گے؟“

”ہاں“ اس نے گھبرا کر جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہری شنکر اس کی گھبراہٹ پر بہت متعجب ہوا کیونکہ ہری شنکر کے اس معاشرے میں طوائف کا درجہ بہت اہم تھا اور باعزت۔ جس کے بغیر مہذب سوسائٹی مکمل نہیں تھی۔ منشی ہری شنکر نے ہر کارے کے ذریعے چمپا کو اطلاع بھجوائی کہ سرل صاحب کے منشی ملنا چاہتے ہیں۔ چمپا نے کہلوایا: زہے نصیب، ضرور آویں۔

شام پڑے جب موتیا اور خس کی خوشبو ہوا میں امنڈی اور زمین پر کیوڑے اور گلاب کا چمڑکاؤ کیا گیا، چوک روشنیوں سے بقعہ نور بن گیا تب گوتم نیلمبر دت کا ہوا دار چمپا جان کے سبز رنگ کے سہ منزلہ مکان کے سامنے جا کر رکھا جس کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازے تھے اور پھانک پروردی پوش چوہدار کھڑے تھے۔ گوتم جھجکتا ہوا ہوا دار پر سے اتر اور دو شمالہ کندھوں سے لپیٹتا زینے پر چڑھا۔

کمرے پر بڑا جماؤ تھا۔ فرش پر سفید چاندنی کچنی تھی۔ سفید چھت گیری میں جھاڑ آویزاں تھے۔ طاقتوں میں کنول اور گلاس روشن تھے۔ صحنی، جو چوک کے رخ کھلتی تھی، اس پر گلات کی بیل چڑھی تھی۔ دروازوں کے برابر پھولوں کے بڑے بڑے چینی کے گئے رکھے تھے جن سے سارا کمرہ معطر تھا۔ صحنی میں کسی نے مال گنج چھینر رکھا تھا۔ چاروں طرف قد آدم آئینے لگے تھے۔ ان آئینوں میں گوتم

نیلبر کو عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں۔ ایسے لوگ جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کدھر کو جائیں گے؟ یہاں اس معطر کمرے میں کب تک ان کا جماؤ رہے گا؟ یہ لوگ جو شرتی کے چنے ہوئے انگرکھے اور گلبدن اور مشروع کے کلیوں دار پانچاھے اور دوپلی اور نکے دار ٹوپیاں اور مندیلیں پہنے شانی رومال اوڑھے اطمینان سے گاؤتکیوں کے سہارے بیٹھے تھے ان کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں تھیں، ان میں جوان اور ادھیڑ اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ متین، ثقہ، سنجیدہ، مہذب، نہایت خاموشی اور اہتمام سے یہ لوگ بیٹھے بڑے تکلف اور اخلاق سے آہستہ آہستہ رک رک کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ ایک کونے میں راجہ شیو ماروفا کے کسی شعر پر بحث ہو رہی تھی، دوسری طرف چند حضرات موسیقی کے کسی نکتے پر تبادلہ خیالات کر رہے تھے۔

نیلبر دت لمحے بھر کے لیے ٹرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا، اس نے اپنا بہترین چونڈ پھن رکھا تھا اور اس کے سر پر مندیل تھی مگر اس کی شکل و صورت ہی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ پر دیسی ہے۔ حاضرین محفل نے اسے دیکھ کر تہذیب کی وجہ سے کسی اچنبھے کا اظہار نہ کیا۔ نواب کمسن نے، جو صدر نشین تھے، اسے اپنے قریب بلا کر مسند کے قریب جگہ دی اور اس سے خیریت مزاج دریافت کرتے رہے۔

”ہمارا بھی کلکتے جانے کو بہت جی چاہتا ہے مگر معاف اللہ بہت جو حکم کا سفر ہے۔“ انہوں نے کہا، وہ گنگا جمنی گڑگڑی پیتے جاتے تھے اور ان کے خوبصورت

چہرے پر فانوس کی روشنی آنکھ پھولی کھیل رہی تھی۔ ”بنگل کے زمینداروں کا کیا کہنا، بڑے بڑے رفیع الشان روساء اس ملک میں ہیں۔ جناب کا تعلقہ بنگالے میں کس طرف ہے۔؟“ نواب کمسن کے ایک مصاحب نے پان کی تھالی پیش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”میرا تعلقہ کہیں نہیں ہے، ملازمت کرتا ہوں۔“

”ملازمت؟“

اب نیلمبر کو پھر وہی جھنجھاہٹ محسوس ہوئی جس کا اسے ما کے پر سامنا کرنا پڑا تھا۔ ”میں کمپنی کی سرکار میں ملازم ہوں۔“

”خوب۔“ نواب مال رضا نے پہلو بدلا۔ ”تب تو جناب انگریزی بھی پڑھے ہوں گے۔“

کسی اور نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔ تھوڑی سی شد بد ہے۔“

”اچھا بھلا کتنی۔ خط پڑھ لیتے ہیں؟“

نیلمبر دت مسکرایا۔ ”جی ہاں“ اب ذرا اس نے آرام کا سانس لیا۔ یہ بڑے نیک طینت اور بھولے لوگ تھے، ان سے خائف ہونے کی کیا ضرورت تھی، گو یہ عجیب بات تھی کہ یہ بھی اسی دنیا میں رہتے تھے جس میں وہ زندہ تھا۔

نواب کمسن اس سے نواب سعادت علی خاں کا تذکرہ کرتے رہے جن کے انتقال کو چند سال ہی گزرے تھے اور جنہوں نے لکھنؤ میں کلکتے کے طرز کی عمارتیں بنوا کر شہر کو یورپین رنگ دے دیا تھا۔ گو تم نیلمبر ان کو کلکتے کی باتیں بتلاتا رہا۔

اتنی دیر میں ساز ملائے گئے۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی تک سب سے
 درست، چمپئی رنگت، سیاہ بھنورا بال اور سیاہ آنکھیں، ناک میں ہیرے کی لوٹنگ
 پہنے، اووے گرٹ کے فرشی پائیجامے میں ملبوس گوندنی کی طرح زیوروں سے لدی
 بڑے ٹھسے سے چلتی ہوئی آ کر وسط میں بیٹھ گئی اور بڑے دلفریب انداز میں اس
 نے جھک کر نیلمبردت کو تسلیم کی، پھر اس نے شہانا میں آصف الدولہ کی غزل شروع
 کی:

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
 تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
 تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

تماشا خدائی.....

سامعین مسحور ہو کر اس کی آواز سنتے رہے۔ گوتم نیلمبراس کی شکل دیکھنے میں محو

تھا۔

کلکتے کا انگریزی دان برہمن کلرک لکھنؤ کے جادو میں گرفتار ہو گیا، دن گزرتے
 گئے۔ بارشوں کی وجہ سے کلکتے تک کے راستے بند تھے۔ جنم اشٹمی کا تہوار آیا۔
 بھادوں کا مہینہ آیا۔ اماؤس کی راتیں جب چمپا اپنی صحیحی میں بیٹھ کر گوڑ ملہار گاتی۔
 جب کنجوں میں کرشن کنہیا کے لیے جھولے ڈالے گئے۔ برج کے رہس دھاریوں
 نے کرشن لیلہ کے سوانگ تیار کیے۔ چمپا را دھابنی۔ کبھی چمپا کو گوتم نے ہریمچنٹی شاہ
 زمن غازی الدین حیدر کے دربار میں دیکھا جہاں وہ آواز کے شعبدے دکھائی
 تھی، اس نے چمپا کو جمعرات کے روز درگاہ حضرت عباس جاتے دیکھا۔ میلوں اور

باغوں میں دیکھا۔ گومتی پر بحرے میں تیرتے دیکھا، ہر طرف چمپا تھی۔

وہ شنیلہ کا جو پیغام اس کے پاس لے کر آیا تھا کب کا بھول چکا تھا۔

اس رات جب وہ چمپا کے یہاں سے لوٹا آدھی رات کا کچرنگ چکا تھا، نیچے سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ گانا ختم کرنے کے بعد چمپا نے حاضرین سے اجازت چاہی تھی اور کورنش بجالانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی، چلتے چلتے رک کر اس نے ٹیبلر سے کہا تھا: ”آپ ہی بنگالے سے آئے ہیں نا، پھر بھی آتے رہیے گا، ہم غریبوں کو بھول نہ جائیے گا۔“ اس کے بعد محفل برخاست ہوئی تھی۔ اب گلیوں میں سائے پھر رہے تھے۔ سارا شہر سوتا تھا۔ صرف چوک کے بالا خانوں کی روشنیاں جل رہی تھیں مگر اب وہ بھی ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ نواب کمن اور دوسرے معززین اپنے اپنے ہوا داروں، تاج خانوں، پالکیوں اور بوچوں پر سوار ہو کر اپنی محل سراؤں کی طرف جا چکے تھے۔ سوتا ہوا شہر۔

اس سے گوتم ٹیبلر حسب معمول جاگتا تھا، وہ تو اکثر اپنی راتیں جاگ کر گزارتا تھا۔ راج شاہی میں، جہاں اس کا جھونپڑا دھان کے کھیتوں میں تھا، وہ اپنی کوٹھڑی میں دیا جلا کر رات رات بھر بنگالی پڑھا کرتا تھا۔ بنارس میں رات گئے تک وہ لیمپ کی روشنی میں سنسکرت کا مطالعہ کرتا تو عجیب باتیں اس کے دماغ میں آتیں۔ مابعد الطبیعیات، یہ جانے کس زمانے کی باتیں تھیں اور کس قدر غیر ضروری مگر کالی داس اور بھرتی ہری اور راج شیکھر پڑھ کر وہ سوچ میں کھو جاتا، کیا کبھی ایسا زمانہ بھی تھا جب ہم نیو لوگ ایسے قابل ہوتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔

کلکتے میں وہ رات رات بھر پڑھتا اور پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا، آج پہلی

مرتبہ رات کو دروازہ کھولا اور شیلے اور کانی داس کے متعلق سوچنے کے بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصور نے اپنا تسلط جما لیا۔ اسے بڑا غصہ آیا، کوفت بھی ہوئی۔ عورتوں کے مسئلے پر اس نے بہت کم سوچا تھا۔ راج شاہی میں جب سترہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے وہ بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس اور کلکتے کی طالب علمانہ زندگی میں ہزاروں مصروفیتیں تھیں۔ عاشقی کے لیے ابھی بہت وقت پڑا تھا، ابھی تو اسے بی۔ اے کرنا تھا۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنا اس کا مقصد حیات تھا، پھر ممکن ہے وہ انگلستان بھی جاسکے۔

لکھنؤ کی اس ویشیا سے اس سے مطلب؟ وہ سر جھکائے سرک پر آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کے کہاڑوں نے اسے آواز دی: فینیس ادھر ہے خداوند، وہ مڑا اور فینیس پر سوار ہو کر اپنے جائے قیام کی طرف چل دیا۔ دوسرے روز سے بھادوں کے جھالے شروع ہو گئے۔ دن بھر وہ ریڈیڈنسی کے دفتر میں بیٹھا رہتا، کبھی کاغذات لے کر آغا میر وزیر اعظم کے مکان پر جاتا، کئی بار وہ شاہی محل بھی گیا اور ہر میٹنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو انگریز بادشاہوں کا لباس پہنے (جو گوتم نیلمبر نے ولیم چہارم کی تصویروں میں دیکھا تھا) مرصع کرسی پر بیٹھے تھے اور ریڈیڈنٹ جھک کر بڑے ادب سے ان کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا، دن اسی طرح مصروفیات اور چہل پہل میں گزر جاتا، رات قیامت بن کر آتی۔

رات، جو چمپا کی راجدھانی تھی۔ اس رات میں گوتم نیلمروت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی زندگی اور دنیا میں ویشیا کا خیال ہی کراہت انگیز تھا، پھر وہ سوچتا عورت جو دیہی ہے۔ نکاشمی، گوری، اوما۔ جو ماں ہے اور بہن اور لی لی اور بیٹی۔

اسے طوائف نہیں ہونا چاہیے، یہ بڑی زیادتی ہے، پھر اسے خیال آیا کہا جاتا ہے عورت تو مخض دکھنے کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ اس میں عورت کی عظمت ہے جس کی ہماری عمر مرد کی ٹہل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے۔ حتیٰ ورتا عورتیں، بال و دھوا کیں۔ یتیم لڑکیاں جن کو ورثہ نہیں ملتا۔ عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے، جوتی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے مگر اس چمپا کو دیکھو جو خود جل کر مرنے کے بجائے دوسروں کو جلا کر مارتی ہے۔

ناستری سوتنترم۔ منوہاراج میں لکھا ہے۔ عورت آزاد نہیں ہے، بالکل صحیح تھا۔ رامائن کی چھٹی کتاب میں تو یہاں تک لکھا تھا کہ خطرے کے وقت، شادی کے موقع پر اور عبادت کے سہ عورت باہر آ جائے تو قابل اعتراض نہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ عورت کے وید پڑھنے سے بڑا انتشار پھیل سکتا ہے۔

سننے ہیں کہ کسی زمانے میں دیس کی عورتیں باکمال ہوتی تھیں، پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ بے پردہ گھومتی تھیں اور جانے کیا کیا۔ اپنے گاؤں کی مسلمان عورتوں سے اس نے بھانومتی اور کنچن مالا اور کسم مالتی مالا اور رانی مینامتی کی جو روپ کتھائیں بچپن میں سنی تھیں ان سب میں بھی پرانے وقتوں کی عورتوں کی بڑائی کے قصے تھے، لیکن یہ سب گپ تھی۔ بھلا ہماری عورتیں جو اس قدر جاہل اور پس ماندہ ہیں کبھی بھی بہتر حالت میں رہی ہوں گی، یہ عقل میں نہیں آتا۔ ناستری سوتنترم۔ شہنشاہی اور جاگیردارانہ سماج میں عورت کو آزادی مخض اسی وقت میسر ہوتی ہے جب وہ بازار میں آ کر بیٹھ جائے تب اس کو عزت بھی ملتی ہے دولت بھی، پھر

اس کے لیے شعر و شاعری کرنا بھی جائز ہے لکھنا پڑھنا بھی۔ ورنہ علیحدہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپا بانی اسی نظام کی پروردہ تھی اور گوتم اس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ خود ان نئے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا اور جاگیر دارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقتدار الگ بنا رہا تھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔

منشی ہری شکر کے ساتھ وہ ایک روز کشتی میں ندی پار کر کے مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے رہنا جا رہا تھا کہ معاً اس کی نظر سامنے پڑی، ایک سنہرا بچہ آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جا رہا تھا۔

”دہائی ہے کمپنی بہادر کی!“ اس کی کانوں میں ایک نقرئی آواز آئی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ چمپا کی آواز تھی جو دوسرے بچے میں بیٹھی تھی۔ نیلمبر کو گھبرا کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اگر وہ اہل لکھنؤ کی صحبت میں ذرا زیادہ رہ لیا ہوتا تو جواباً کہتا کہ حضور یہ فقرے ہم پر تیز کرتی ہیں، مگر وہ بالکل ہڑبڑا گیا۔ سامنے سے آغا میر کا بچہ آ رہا تھا۔ چند اور مرصع اور منقش کشتیوں میں امراء و وزراء، صاحبان عالی شان، یعنی انگریز اور شہر کی نامی طوائفیں رہنا جا رہی تھیں۔ دریا پر مچھلی اور گھوڑے کی شکلوں کے بچروں کا میلہ سالکا تھا۔ اتنے میں چمپا کی کشتی قریب آ گئی۔

”ہماری کشتی میں آ جائیے۔“ اس نے کہا۔

”تا کہ آپ ان کو بھی لے ڈوسیے۔“ ہری شکر نے جواب دیا، اس کے بعد دونوں میں ضلع جگت شروع ہو گیا، ہنتے بولتے یہ سب گھاٹ پر پہنچے۔ بارہ دری کی

طرف جاتے ہوئے ہمت کر کے گوتم نیلمبر نے طے کر ڈالا کہ جو فرض اسے شنیدنا
وہی نے سونپا تھا اسے ادا کر کے کم از کم اپنے ضمیر کو ہلکا کر لے۔ جس وقت چمپا
پانچے اٹھا کر بیڑھیاں چڑھ رہی تھی گوتم نیلمبر نے اس سے پوچھا:
”تم سرل صاحب کو جانتی ہو۔“

وہ چپ رہی۔

”چمپا بانی جی میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دو۔“
”اچھا جانتے ہیں، پھر تم سے کیا۔“

”ان کی بی بی ہے، کلکتے میں۔“ اسے تو قہقہہ تھی کہ یہ سن کر چمپا کا رنگ فق ہو
جائے گا، عرق ست اس کی پیشانی پر چمکنے لگے گا مگر وہ اطمینان سے بولی: ”اچھا تو
پھر۔ جتنے لوگ ہم سے ملتے ہیں سب کی بیبیاں ہوتی ہیں۔“

”ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔“ نیلمبر نے اور زیادہ اہمیت کے ساتھ کہا۔

”سب کی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، تم اپنا مقصد بیان کرو۔“

”تم سرل صاحب سے قطع تعلق کر لو، یعنی اب کے سے جب سرل صاحب
یہاں آئیں تو ان سے نہ ملنا، وہ ریڈیڈنٹ بن کر یہاں آنے والے ہیں ان کے
مہینے۔“

چمپا ٹھٹھک گئی اور ایک لمحے کے لیے اس بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ ”آپ
عجیب ہونق انسان ہیں۔ حضرت یہ کہتے کہ اب آپ کی ہم پر طبیعت آئی ہے!“
نیلمبر کو چکر سا آ گیا۔ حد ہو گئی بیہودگی کی، اس کا جی چاہا وہیں سے اٹے پاؤں
واپس چلا جائے مگر اب لڑائی شروع ہونے والی تھی۔ خلقت جمع ہو چکی تھی۔ بادشاہ

سلامت اور اہل دربار اپنی کرسیوں پر فروکش ہو رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا، وہ جا کر ایک طرف کوچکا کھڑا ہو گیا۔

والپسی میں اسے نواب کمین اور ریڈنٹ کے ساتھ ساتھ تک گھاٹ آنا پڑا۔ بحرے میں چمپا کا ساتھ ہو گیا۔ اس کشتی میں اور کوئی نہ تھا، وہ اسے بڑی محبت کی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ”سنو جی“ اس نے دفعتاً کہا۔ ”ہم سرل صاحب کو ہزار دفعہ چھوڑ دیں گے، مگر تم ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ۔ تم ہمیں بہت زیادہ بھاگنے ہو۔“ وہ خاموش رہا۔

چمپا کی رنگت سرخ ہو گئی۔ ”تم نے سنا۔ ہم۔ چمپا جس پر ایک عالم جان دیتا ہے خود بے حیا بن کر تم سے یہ کہہ رہے ہیں، مغرور آدمی۔“

وہ اسی طرح خاموش رہا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں میں تیزی سے جھلملانے لگیں، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بحر اب چھتر منزل کے پاس پہنچ چکا تھا۔

”ہم نے آج تک کسی سے یہ نہیں کہا، بد بخت مغرور آدمی۔ اپنے آپ پر زیادہ مازاں نہ ہونا، یہ وقت بہت جلد گزر جائے گا“ کشتی گھاٹ تک پہنچ گئی۔

گوتم نیلمبر نے آنکھیں کھول لیں، وہ اسے تیوری پر بل ڈالے غور سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ ہنس پڑی۔ ”ہوئی آدمی۔“ اس نے پیار سے کہا۔ ”بات کرنے کی تم کو تمیز نہیں اور تم پر ہم عاشق ہوئے ہیں، یہ قدرت کا تماشا دیکھو!“ نیلمبر چپ چاپ بحرے پر سے اترا۔ چمپا نے اپنی سکھ پال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے یہاں آؤ گے نا؟ از برائے خدا ضرور آنا۔ میاں نیلمبر صاحب۔ تم کو کیا

کہہ کر پکاروں؟ پنڈت جی مہاراج۔ ورنہ پاؤں سے جی پچھتاکیں گے۔ وال چنے کی کھائیں گے۔“

نیلمبر دوسری طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی اور ہری شکر کی پاکی اور کہاروں کو ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔

”ہم سے ملو گے نا؟“

”نہیں“ نیلمبر نے مختصر سے جواب دیا اور جلدی سے جا کر اپنی پاکی میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وہ تین دن تک نہیں سو سکا، اس دوران میں اس کے پاس چمپا کے متعدد پیغام آئے۔ اس قدر اچانک اس عورت نے یہ کیسا نالٹک کھیا تھا، مگر عورت کے چہرے آج تک کون سمجھ پایا ہے۔ یہ لڑکی، بڑے بڑے دھنواں اور سورما جس کے بازو اٹھاتے تھے، اسے میری کون سی ادا بھاگئی۔ منشی ہری شکر نے فائلوں پر سے سراٹھا کر اس سے کہا: ”بھائی نیلمبر۔ ہمارے کاشی کے کبیر داس کہہ گئے ہیں۔

چھوٹی موٹی کامنی سب ہیں ہنس کی بیل

بیری مارے داؤں سے یہ ماریں ہنس کھیل

مگر تم اس کے یہاں چلے کیوں نہیں جاتے، اس میں کیا حرج ہے؟“

نیلمبر اودھ کے اس لالہ بھائی کو نہ سمجھا پایا کہ چمپا کے یہاں جانے میں کیا حرج ہے۔

”بھگوان نے ماری ہمارا جی بہانے کے لیے تو بنائی ہے۔“ ہری شکر نے پھر

کہا۔ نیلمبر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ماری تو بڑی مقدس چیز ہے، اسے تم دل کا

بہلاوا سمجھتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ارے میاں، ہری شنکر نے حقے کا کش لگا کر ہنس کے جواب دیا، ”ہم نے اس کو چے میں بڑے بڑے جٹا دھاری برہمن چکر لگاتے دیکھے ہیں، تم کس کھیت کی مولیٰ ہو۔“

نیلیمبر اٹھ کر باہر آ گیا اور ریڈ نیسی کے باغ میں بلا متعصد ٹہلنے لگا۔ مانی مولیٰ کی چھاؤں میں چلم پیتے تھے اور شاگرد پیچھے میں کہاروں کی محفل میں کٹورا چل رہا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے برآمدے میں منڈیاؤں چھاؤنی سے آئے ہوئے دو گورے شراب کے نشے میں دھست ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، اتنے میں اسے ٹیلے کی ڈھان پر زرد رنگ کا دوپٹہ اوڑھے جمنامہری اوپر چڑھتی نظر آئی۔ جمنامہری جو چمپا کی پیغامبر تھی، وہ خاموشی سے پھر اندر چلا گیا۔

کوار کا مہینہ لگ چکا تھا اور الہ آباد میں جہاز کلکتے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کانڈات کا پلندہ سنبھال کر وہ واپس لوٹنے کے لیے تیار ہوا۔

جب وہ نا کے کی طرف جا رہا تھا، یکا یک اس نے گاڑی بان سے پوچھا: ”یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔“

”نخاس۔۔۔ خداوند۔۔۔“

”ادھر گاڑی موڑ لو۔“

”بہت خوب۔۔۔ خداوند۔“

شکر چمپا کے مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئی، وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر گیا۔ چمپا صحنچی میں بیٹھی تھی۔ نیلیمبر کی آواز سن کر اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

”تم آ گئے۔“

”نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔“

”دو گھڑی رک جاؤ، دودھ کھاؤ گے، شربت منگوا دوں؟“ اس کا تامل دیکھ کر

اس نے کہا۔ ”برہمن کی دکان سے جل پان منگوا دوں؟“

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

”ہیں۔ میں صرف تم کو خدا حافظ کہنے آیا تھا۔“

”خدا حافظ۔“

وہ دروازے میں ٹھٹھکا رہا۔

”ہمارے شہر کا دستور ہے دعا دیتے وقت کہتے ہیں: سوانم حسینؑ کے خدا کوئی

غم نہ دے، یہ دعا میں تم کو نہیں دے سکتی۔ تم حسینؑ کا غم بھی نہیں جانتے، تم تو جانتے

ہی نہیں غم کہتے کسے ہیں۔“

”سنو، چپا۔“ نیلمر نے دھیرے سے کہا۔ ”تمہاری زندگی اتنی رنگین ہے،

بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی، کس چکر میں پڑ گئیں۔ میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے۔“

”ہاں میرا اور تمہارا کیا ساتھ ہے بھلا، تم نے آج تک مجھے اپنا ہاتھ بھی نہیں

چھونے دیا۔ ہمارے یہاں کے ہندو تو اتنی چھوت چھات نہیں کرتے۔“

”سنو۔“ اس نے چپا کو پھر سمجھانے کی سعی کی۔ ”تم کو میں اس لیے پسند ہوں

کہ ان سب لوگوں سے مختلف ہوں جو تمہارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انوکھی

چیز ہر ایک کو بھاتی ہے۔“

”کیا تمہارے دیس میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔“ اس نے سادگی سے سوال کیا۔

نیلمبر کو ہنسی آ گئی ”ہوتی کیوں نہیں مگر تمہاری جیسی نہیں، اچھا اب میں چلتا ہوں۔“

”اللہ۔ کس قدر طنطنہ ہے، معلوم ہوتا ہے رجبہ جھاؤ لال کے جانشین آپ ہی ہیں۔“ چمپا نے ہنسنے کی کوشش کی۔

اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ شہر میں چاروں طرف بونھٹا خے چڑھائے گئے۔ فانوس جگمگائے، تدریلیں جلیں، نیچے سڑک پر سے ایک بارات گزر رہی تھی۔ تخت رواں پر مانچ ہوتا جا رہا تھا۔ ماہی مرا تب کی قطار میں لڑکے بالے اور شہدے اچھلتے کودتے چل رہے تھے، دوسرے تخت رواں پر سوانگ اور کرتب ہو رہے تھے۔ روشن چوکی بج رہی تھی۔ مشعلوں کی روشنی بالا خانے کی کھڑکیوں پر آ کر پڑی، اس روشنی میں چمپا کا کاندانی کا دوپٹہ جھک جھک کرنے لگا۔ نیچے ڈونیاں سو باگاتی جا رہی تھیں۔ چمپا کھڑکی میں آ کر بارات دیکھنے لگی۔ ”جانے کس سجاگن کی بارات ہے۔“ اس نے کہا، نیلمبر نے پٹے کرا سے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اس کی مانگ میں سیندور ہوگا، پیروں میں مہندی، ناک میں سہاگ کی نتھ۔“ اس نے آہستہ سے اپنی مانگ کو چھوا جس میں افشاں چنی تھی لیکن جو سیندور سے عاری تھی، اب یہ پھر ناک کھیل رہی ہے۔ گوتم نیلمبر نے پریشان ہو کر سوچا۔

”آدمی اس قدر کا کٹھور ہوتا ہے۔“ چمپا نے کہا۔

”ہمیشہ سے عورت اور مرد ایک دوسرے پر یہ الزام رکھتے آئے ہیں، یہ تکرار

”بھی فضول ہے۔“

”تم ابھی جا رہے ہو۔“

”ہاں۔“

”صبح ہوتے ہوتے لکھنؤ سے بہت دور نکل چکے ہو گے۔“

”ہاں۔“

”یہ وہاں سنا ہے۔“

بچن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کرو کی بھور کبھی نہ ہوئے“

نیلمبر کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ شہر کا شہر کسی میلے کے لیے ایک سمت کو

رواں تھا۔ گلیوں میں سنڈے مونچھوں پر تاؤ دیتے اکڑتے پھر رہے تھے۔ قلما

قنیاں، جیشینیں، ہڑونگیاں، چونے والیاں، قصباتی پاتریں چھن چھن کرتی ٹولیاں

بنائے باغ کی طرف جا رہی تھیں۔ بانکے اپنی تلواریں چمکا رہے تھے۔ مد کیے،

چرے، بھٹلڑیے چندو خانوں میں جمع تھے۔ چو طرف نل مچا تھا۔ دنیا کس قدر روزگ

رنگ جگمگاتی، اسی دنیا کو بھرتی ہری نے رنگ بھوم کہا تھا۔

اس رنگ بھوم پر ایک بے معنی ٹانگ یہ بھی کھیلنا جا رہا تھا، اندھیرا چھانے لگا۔

اس کی شکرم نیچے منظر کھڑی تھی۔

بھاگو میاں، بھاگو میاں سے جلدی۔ کلکتے کا راستہ کھونا ہوتا ہے۔ کلکتے چلو۔

تمہارا ٹھکانہ وہیں ہے میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔

پھر وہ جلدی سے اپنا کاغذات کا لپچہ سنبھال کر تیزی سے زینے سے اترا، اس

نے ایک بار بھی پٹ نہ دیکھا اور سیدھا شکرم میں پہنچ کر دم لیا۔

گاڑی کے پہیوں نے سڑک کے پختہ فرش پر شور مچانا شروع کیا۔ بارات کا ہنگامہ ابھی باقی تھا۔

بھیڑ میں سے نکلتی شکرم آغا میر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئی۔ نو عمر کوچبان، ہیٹے گا مہربان، ذرا بچ کے قبلہ، کی ہانک لگاتا شہر کے باہر نکل آیا۔ اب وہ حضرت گنج کی مانوس سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف اونچی گوتھک وضع کی انگریزی عمارتوں میں کنول جلتے تھے۔ سڑک پر سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے اور ہاتھی اور پالکیاں گزر رہی تھیں۔

یہ راستہ نسبتاً سناں تھا، وہ ما کے پر پہنچ گئے۔ جامن کے نیچے چند بیراگی بیٹھے تھے جنہوں نے پر اسرار آنکھوں سے نیلمیر کو دیکھا، ان میں سے ایک وہی تھا جسے نیلمیر نے پہلے روز تا کا تھا۔ امے بھوانی کے مٹھ کے سامنے عود سلگ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے مورتی کو غور سے دیکھا۔ ماتا کو وہ کالی کے روپ میں جانتا تھا، اب وہ شکر گزار ہوا کہ ماتا نے اسے اپنے جوگ مایا (جوگ مایا درگاہ کا ایک روپ Goddess of illusion) کے روپ کے بھی درشن کرا دیے۔ ماں، میں نے تمہاری یہ لیلیا بھی دیکھ لی، اب واپس جاتا ہوں۔ اپنی شکتی سے اسی طرح میری حفاظت کرتی رہنا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکائے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ایک جوگی، جس نے پہلے روز اس سے بات کی تھی، اس سے گویا ہوا: ”بڑی جلدی واپس جاتے ہو۔“

”سراب کے ساحل پر تاخیر کرنا غفلندی نہیں، یہ تمہارا شہر سراب کا شہر ہے۔“
نیلمبر نے لکھنؤ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دور مچھی بھون میں
چوتھے پہر کا کجر بجا۔ بیراگی نے اسے دھیان سے دیکھا: ”سراب کی حقیقت اتنی
آسانی سے سمجھ میں نہیں آ جاتی بچہ۔“

”بابا،“ نیلمبر نے رک کر کہا، ”جو لوگ مایا نے اپنے دسوں ہاتھوں سے مجھے
اپنی اور کھینچنا چاہا، لیکن دیکھو میں صحیح و سالم واپس لوٹ رہا ہوں۔“
”ہم میں سے کوئی صحیح و سالم نہیں ہے، ہم سب کمہار کے کھلونے ہیں اور ہر
سے ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اپنی مضبوطی پر نازاں نہ ہونا۔“ پھر اس نے تھوڑی
سی مٹی اٹھا کر اسے سونگھا۔

”دیکھو، اس میں کتنی خوشبو ہے، اس مٹی کو لے جاؤ۔ کٹک میں جوگ ملایا کا
مند رہے، اس میں چڑھا دینا۔“

نیلمبر نے ہاتھ بڑھا کر مٹی لینے میں پس و پیش کیا، یہ گورکھ ناتھ کا جوگی پھر اپنے
گورکھ دھندے دکھارہا تھا۔

”لے لو۔۔۔ یہ لکھنؤ کی مٹی ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ اس شہر کا
جادو یہ ہے کہ چھٹ جائے تو بے طرح یاد آتا ہے۔“

جوگی بڑی شستہ زبان بول رہا تھا۔

”بابا۔۔۔ تم بیراگی کیوں بن گئے۔“ نیلمبر نے پوچھا۔

”تم۔۔۔ تم مجھے جانتے ہو۔۔۔؟“ جوگی نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔“

”ہاں، جاننا بہت مشکل ہے، اور جاننے والے کو کون جان گا۔“ جوگی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیلمبر نے پیش قدمی میں یہ جملہ پڑھا تھا۔ پیراگی بہت پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ نیلمبر کے جذبہ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔

”بابا۔۔۔ میں پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو؟“

”کیوں۔ کیا تمہارا بھی اس راہ پر چلنے کا ارادہ ہے۔“

”ارے۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“

”کیوں جی۔۔۔ فرنگی کی جاسوسی کرتے ہو؟“

نیلمبر کے دل پر یہ بات موگری کی طرح جا کر پڑی۔ جوگی کے لہجے میں اتنا ہتھارت تھی۔

”میں۔ میں فرنگی کی جاسوسی نہیں کرتا۔“ اس نے آرزوہ لہجے میں کہا۔

”سچ کہتے ہو؟“ جوگی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”ہاں۔ بالکل سچ۔“

”اچھا تو سنو، میں راجہ بنی بہادر کا بیٹا ہوں۔ راجہ بنی بہادر کا نام سنا ہے؟ وہ مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ کے نائب السلطنت تھے جو جناب عالی (نواب اودھ) اور عالیجاہ (نواب بنگال) کے ساتھ جی توڑ کر تمہارے صاحبان عالی شان کی فوج سے لڑے تھے۔ گنگا کے کنارے ایک طرف میرا بہادر باپ اور بنارس کا راجہ بلونت سنگھ اور گوسائیں ہمت بہادر اور روہیلے تھے۔ دوسری طرف فرنگیوں کا لشکر۔۔۔ گوسائیں ہمت بہادر کے مانگے جان ہتھیار پر رکھ کر لڑ رہے

تھے۔ دنادن سرو کی توپ چلتی تھی مگر فرنگیوں نے میرے باپ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں کی بارڈھ اور تلگوں کی یورش میں ہمارے لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ میرا باپ گھوڑے پر سوار ایک ایک کو پکارتا پھرا، ارے کم بختو کدھر بھاگ رہے ہو۔ جناب عالی نے لکار لکار کر سر اسیمگی سے کہا، تم مغل کہلاتے ہو اور میدان چھوڑ کر بھاگتے ہو۔۔۔ مگر ہماری فوج۔۔۔ درگاوتی ندی پار کر کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں ندی میں ڈوب گئے۔۔۔ ہندوستان پر قیامت گزر گئی۔۔۔“ وہ ذرا کی ذرا دم لینے کے لیے رکا، جوش کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، پھر یہ سرخی اداسی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: ”تمہاری فرنگی سرکار نے اسی وقت دیکھ لیا کہ اس قوم میں اتفاق جاتا رہا۔ عالیجاہ اور جناب عالی ہی میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرنگیوں نے دیکھا کہ یہ سب لوگ دوسرے کی چغلی کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شتے لکھ کر ایک طرف بادشاہ عالی گہر کو دلی بھیجتے ہیں دوسری طرف کلکتے سے شرائط کرنے پر آمادہ ہیں، یہ کیسا ذلیل ملک ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے سے اعتبار اٹھ گیا ہے، میرا باپ جناب عالی کا سب سے زیادہ نمک حلال اور وفادار ملازم تھا، دشمنوں کے بہکائے میں آ کر جناب عالی نے اس کو نمک حرام تصور فرمایا اور اس کی سزا کے درپے ہوئے۔“

”ارے۔۔۔“ نیلمیر کے منہ سے نکلا۔

”جناب عالی نے منڈیاؤں چھاؤنی میں میرے باپ کے خیمے میں قیام فرمایا اور کھانے کے بعد میرے بابا سے کہا: ”رلجہ تم بھی اس وقت شکار کو چلو۔“ انہوں نے عرض کی۔ ”غلام نے بدولت حضور بہت سے شکار دیکھے ہیں۔“ فرمایا:

”آج کا شکار بہت عجیب و غریب ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا، جو دم ہے نقیمت ہے۔“ وہ بابا کو اپنی خواص میں بٹھا کر اپنے لشکر کی طرف چلے، بابا سمجھ گئے کہ یہ میرا دام گرفتاری ہے مگر کیا کر سکتے تھے۔ حکم حاکم مقدم تھا۔ عالی جناب کے حکم سے بابا کی دونوں آنکھوں میں نیل کی سائیاں پھیر دی گئیں۔ ان کا علاقہ ضبط سرکار ہوا۔ تیرہ سو گھوڑوں، اٹھارہ ہاتھی اور پورے توپ خانے کے علاوہ ایک وسیع زمینداری کے میرے بابا مالک تھے، میں صرف اس مرگ چھالاکا مالک ہوں۔“

جوگی خاموش ہو گیا۔۔۔

نیلمبر مبہوت بیٹھا قصہ سنتا رہا۔ جوگی نے آگ میں ایک لکڑ اور ڈال دیا اور اکڑوں بیٹھ کر کہنے لگا: ”سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے، تم اس کی حقیقت کو کیا جانو! تم اسی چکر میں شامل ہو اور رہو گے۔۔۔ مجھے سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے، کمپنی کی خوشی اور ناخوشی، بادشاہ کے عتاب، کسی چیز کی پرواہ نہیں۔۔۔ میرے بابا کو اندھا کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندھا کون کر سکتا ہے، سوائے میرے خود کے۔ جاؤ۔ اب تم کو دیر ہوتی ہے۔ کٹک میں جب جوگ مایا کے مندر میں جاؤ تو دیکھنا کہ اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ان گنت دروازے اور ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ کھلتا ہے اس کے بعد تیسرا۔ اس طرح کی بھول بھلیاں اور غلام گرد شیں چاروں طرف بنی ہیں جن سے انسان نکل نہیں سکتا، تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو، مگر تم غلطی پر ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔“

نیلمبر اٹھا، جھک کر اس نے جوگی کے قدموں کے پاس سے مٹی اٹھائی اور بھاری بھاری قدم رکھتا شکرم میں آن بیٹھا۔ گاڑی بان نے باگیں سینا پور جانے والی

سرک کی طرف موڑ لیں۔

معاملے کے نزدیک شکرم رک گئی۔ گاڑی بان نیچے اترا، سامنے ایک انگریز فوجی گھوڑے سے اتر کر ایک راہ گیر کو کوڑے لگا رہا تھا اور انگریزی میں گالیاں دیتا جاتا تھا۔

یہ منڈیاؤں چھاؤنی تھی۔ چاروں طرف انگریزوں کی کوٹھیاں تھیں اور فوج کا میس اور گرجا اور فوجی ہسپتال۔

گورا راہ گیر کو اچھی طرح پیٹنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

”سارے۔۔ ہمارا ہی کھاتے ہیں ہم ہی پر غراتے ہیں۔“ گاڑی بان نے، جس کا نام انگا دین تھا، غصے سے کہا۔ ”شاہ جمن کے وقت میں یہ اندھیرا۔“ وہ بڑبڑاتا رہا۔ گوتم نیلمبر پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔ رات گئے وہ راجہ ٹکیٹ رائے کی بنوائی ہوئی ایک دھرم شالہ میں اترے۔ انگا دین اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ ریڈیو کے سپاہی اور ہرکاروں کو دیکھ کر، جو نیلمبر کے ساتھ شکرم سے اترے تھے، دھرم شالہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ بنگالی بابو ہیں۔ کلکتے جا رہے ہیں، انگریزی جانتے ہیں، ان سے پوچھو ہماری مال گجاری میں کمپنی بہادر کب کمی کرے گی۔ سنا ہے نئے قانون اندھمن میں بنے ہیں، یہاں بھی لاگو ہوں گے۔ ان بے چارے کو کیا معلوم، کیوں نہیں بنگال اور اودھ میں ایک نئے قانون لاگو ہوتے ہیں۔ اے بابو صاحب۔۔ مال گجاری میں کمی کروائیے، ہماری تو کمپنیاں ٹوٹ گئیں۔ آنگن کے پختہ فرش پر نیلمبر کے چاروں اور مجمع لگ گیا، یہ سب آس پاس کے

دیہات کے کسان تھے جو اپنے اپنے مقدمے اور فریادیں لے کر دارالسلطنت جا رہے تھے۔ ایک بوڑھا پھونس قصبائی زمیندار لاٹھی ٹیکتا نیلمبر کے قریب آن کر بیٹھ گیا۔ ”کون جات ہو؟“ اس نے چراغ کی روشنی میں نیلمبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”برہمن۔“

بوڑھے نے نیلمبر کے پاؤں چھوئے۔ ”ٹھا کر میرے گاؤں چلے چلو تو تری سیوا کروں، میرا مکان یہاں سے کس بھر ہے۔“

”مجھے صبح سویرے ہی سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بابا سیوا تو مجھے تمہاری کرنی چاہیے، میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔“ نیلمبر نے کہا، اس کا دل بھر آیا، یہ لوگ سب کے سب کتنے معصوم بھولے تھے۔ اسے دکھ ہوا کہ وہ اودھ پوری چھوڑ کر جا رہا ہے۔

”ٹھا کر۔“ بوڑھے نے چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔ ”اپنی انگریجی سرکار سے کہو ہم پر زیادہ ظلم نہ توڑے۔“
وہ خاموش ہو گیا۔

”دکھلو سے آتے ہونا۔؟“

”ہاں۔“

”ہواں ہمرے بادشاہ کے درشن کیے؟“

”ہاں۔“

”ہمرے بادشاہ کو کمپنی بہادر نے روپے کے لیے تنگ کر رکھا ہے۔“

”پتا نہیں۔“

”ٹھا کر۔۔۔ تم کو معلوم ہے۔“ اب بوڑھے نے زیادہ جوش سے بولنا شروع کیا۔ ”کمپنی بہادر نے وجہ ہمارے بادشاہوں کو دیے اور ایک ایک کر کے سب کو توڑا۔۔۔ تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے۔“

اے لیجئے۔ یہ پھر بکسر اور جناب عالی کا قصہ شروع ہو گیا، بوڑھے نے نیلہمر کو لحظہ بھر کے لیے دیکھا۔

”تم کو ان قصوں سے دلچسپی نہیں ہوگی لیکن یہ گھاؤ ہمارے دلوں پر لگے ہیں اور یہ گھاؤ تازہ ہیں، ہمارا پس کمپنی بہادر نے تاراج کر کے رکھ دیا ہے۔ تم کو معلوم ہے بکسر کی ہار کے بعد جناب عالی سے انگریزوں نے لکھا پڑھی کی تھی کہ وہ پینتیس ہزار سے زیادہ فوج نہیں رکھیں گے، اب منڈیاؤں میں عالم دیکھو۔ آصف الدولہ بیکنٹھر باشی کلکتے لکھا: انگریزی فوج سارے ملک کی آمدنی کھا گئی۔ گھر کے آدمیوں کو کھانے کو نہیں بچتا۔ کھیت اجڑ گئے۔ فرنگی افسر خود کو ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔ کب تک میرے گلے پر یہ چھری رہے گی؟ کل اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم غریب سے غریب تر ہوتے چلے گئے۔۔۔ ٹھا کر ہم بہت دکھی لوگ ہیں۔ جب منرو نے حملہ کیا ہمارے سپاہی یا حسین، یا حسین کہہ کرواتے جاتے تھے اور لڑتے تھے۔ اس طرح ہم نے فرنگیوں سے جنگ کی، مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں، مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں، پر اب ہمارے پاس کمپنی کے خزانے میں دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں رہ گیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ نیلہمر چپ چاپ بیٹھا چراغ کی لود دیکھتا رہا۔ دوسرے حلقے میں چند کسان بیٹھے نواب سعادت علی خاں مرحوم کی خوش انتظامی کا تذکرہ کر رہے تھے جنہوں نے اپنے دور حکومت میں ملک کی بگڑی بنا دی تھی، مگر شاہ زمن

بچارے اب کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے بس میں کچھ نہیں۔“۔۔۔ وہ کہہ رہے تھے۔

چراغ کی لو ہوا میں جھلملایا کی۔ نیلمبر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ چاندنی رات تھی۔ منڈیر پر بیٹھے چند نوجوانوں نے برہا گانا شروع کر دیا۔

نیلمبر نے دیکھا کہ اس ملک کا بچہ بچہ، بوڑھا جوان، ہندو مسلمان اپنے بادشاہ پر جان چھڑکتا تھا۔ جوگی، جس نے اپنے باپ بنی بہادر کا قصہ اسے سنایا، اسے بھی یہاں کے بادشاہ یا اس حکومت سے نفرت نہیں تھی، وہ تو غالباً شجاع الدولہ سے بھی خفا نہ تھا جس نے اس کے باپ کو اندھا کروایا۔ اس کا محض یہ خیال تھا کہ دنیا مایا جال ہے اور اس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے، دوسرے یہ کہ ملک خدا کا تھا اور حکم بادشاہ کا اور بادشاہ کی اطاعت سب کا دھرم تھا۔ یہ سب لوگ اپنے بادشاہوں پر عاشق تھے، ہر زبان پر آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے قصے تھے۔ آصف جس نے اپنی سخاوت سے کہاروں کو پالکیوں پر سوار کرا دیا اور سعادت جس نے حسن انتظام سے ملک کے خالی خزانوں کو دوبارہ پر کر دیا اور یہ سب لوگ، اودھ کے یہ سارے باشندے، جن سے نیلمبر ملاہنگی سے شدید نفرت کرتے تھے۔

کلکتے واپس پہنچ کر وہ پھر اپنی جانی بوجھی مانوس دنیا میں کھو گیا۔ دفتر، کتابیں، انگریزی اور بنگالی اخبار، لکچر، وہ شنیل سے ملنے دھرم تلہ گیا مگر وہاں پہنچ کر اسے

معلوم ہوا کہ وہ مرچکی ہے۔ برسات کے زمانے میں وہ پوجا کے لیے کالی گھاٹ جا رہی تھی، اسے سانپ نے کاٹا اور وہ مر گئی۔ سرل صاحب منسل میں دورے پر گئے ہوئے تھے۔

نیلمبر نے اپنے برآمدے میں لوٹ کر سیٹیل پائی نکالی اور لیمپ جلا کر پھر ڈکشنری پر جھک گیا، مگر اب اس کا دل ملازمت میں نہیں لگ رہا تھا۔ مانک تلہ میں اس کے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک بڑا خوبصورت گارڈن ہاؤس تھا۔۔۔ اس کے باغ میں پلچی کے درخت تھے اور یہاں بہت سے نوجوانوں کا مجمع لگتا تھا، اس جگہ پر رام موہن بابو رہتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ رام موہن بابو کا لیکچر سننے گیا۔ مذہب کے متعلق اس کے ذہن میں جو الجھنیں تھیں ان میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ کالی گھاٹ نہ جاتا، گھر میں بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا: کیا سیرام پور والے ٹھیک کہتے ہیں؟ کیا رام موہن بابو صحیح راستے پر ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کون صحیح ہے کون غلط۔ ان سوالات سے جھنجھلا کر اس نے طے کر لیا کہ جب تک وہ خود بہت اچھی طرح مطالعہ نہ کر لے خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔ کمپنی بہادر کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر وہ ہندو کالج میں داخل ہو گیا، اسی کالج میں شہر کے ایک رئیس پرنس دوارکاناتھ بیگور کا لڑکا دیوند رانا تھا بھی پڑھتا تھا، وہ دونوں کلاس کے بعد اکٹھے بیٹھ کر مغربی فلسفے پر تبادلہ خیالات کرتے۔ خدا اور روح کی کھوج لگاتے۔ دیوند رانا تھا میں ساری صوفیوں والی خاصیتیں تھیں جو نیلمبر کو بڑی دلچسپ معلوم ہوتیں۔ شام کو وہ رام موہن رائے کے گھر جا کر ان کی محفل میں شامل ہوتے اور عالموں فاضلوں کی

گفتگو سنتے یا موحدا نہ سمجھن گاتے یا نیلمر دیوند رنا تھ سے حافظ کی غزلیں سنتا۔

جس سال نیلمر دت نے بی۔ اے کیا اسی سال سے وہ رام موہن رائے کے برہم سماج کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن بن چکا تھا، جب ہی ایک روز اس نے اخبار میں پڑھا کہ سرسرل ہاورڈ ایشلے کا فالج گر جانے سے انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی میم صاحبہ، لیڈی ایشلے، جن سے انہوں نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی مع اپنے دو سالہ لڑکے کے وارجلنگ گئی ہوئی تھیں۔

سرل کو بہار کے ایک اداس اور اجنبی ڈاک بنگلے میں موت آئی، وہ دورہ کر کے لوٹا تھا اور بوٹ اتار کر آرام کرسی پر لیٹا تھا۔ اسی وقت ہرکارے نے اسے اس کی بد مزاج، مغرور اور خاصی بد صورت بیوی کا خط الا کر دیا تھا جس میں اس نے وارجلنگ کی سوسائٹی کی تازہ خبریں لکھی تھیں اور یہ لکھا تھا کہ ننھا سرل اب بہت شیطان ہو گیا ہے، آج اس نے ایک قلی کو اپنی ننھی سی چھڑی سے خوب پیٹا۔ خط پڑھنے کے بعد سرل نے اخباروں کے پلندے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا یا کیا ایک اسے محسوس ہوا کہ وہ مرنے والا ہے، اس نے اپنے چوہدار کو آواز دینی چاہی مگر اس کی زبان میں لکنت آچکی تھی۔ دوسرے لمحے وہ ختم ہو گیا۔

کلکتے کے اخباروں میں اس کے متعلق مضمون لکھے گئے، اس کی سوانح عمری شائع ہوئی۔ برطانیہ اور ہندوستان کی اس نے جو خدمات کی تھیں ان کا مفصل تذکرہ مضامین میں کیا گیا۔ اپنی عمر کے چالیس سال اس نے بنگال میں گزارے تھے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی یاد میں خاص جلسہ کیا۔ کالجوں میں اس پر تقریریں ہوئیں، اس کے پندرہ دن بعد لوگ اس کو بھول گئے۔

ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد اب باضابطہ طور پر وکٹوریہ کی ایمپائر میں شامل ہو چکا تھا، سارا مشرق اب مرحوم سرسریل ہاورڈ لیشلی کے بیٹے لارڈ سرل ڈیرک ایڈون لیشلی کا تھا۔

اختتام.....حصہ اول